مثبت تخلیقی رویّوں کا عکاس

گجرات نمبر
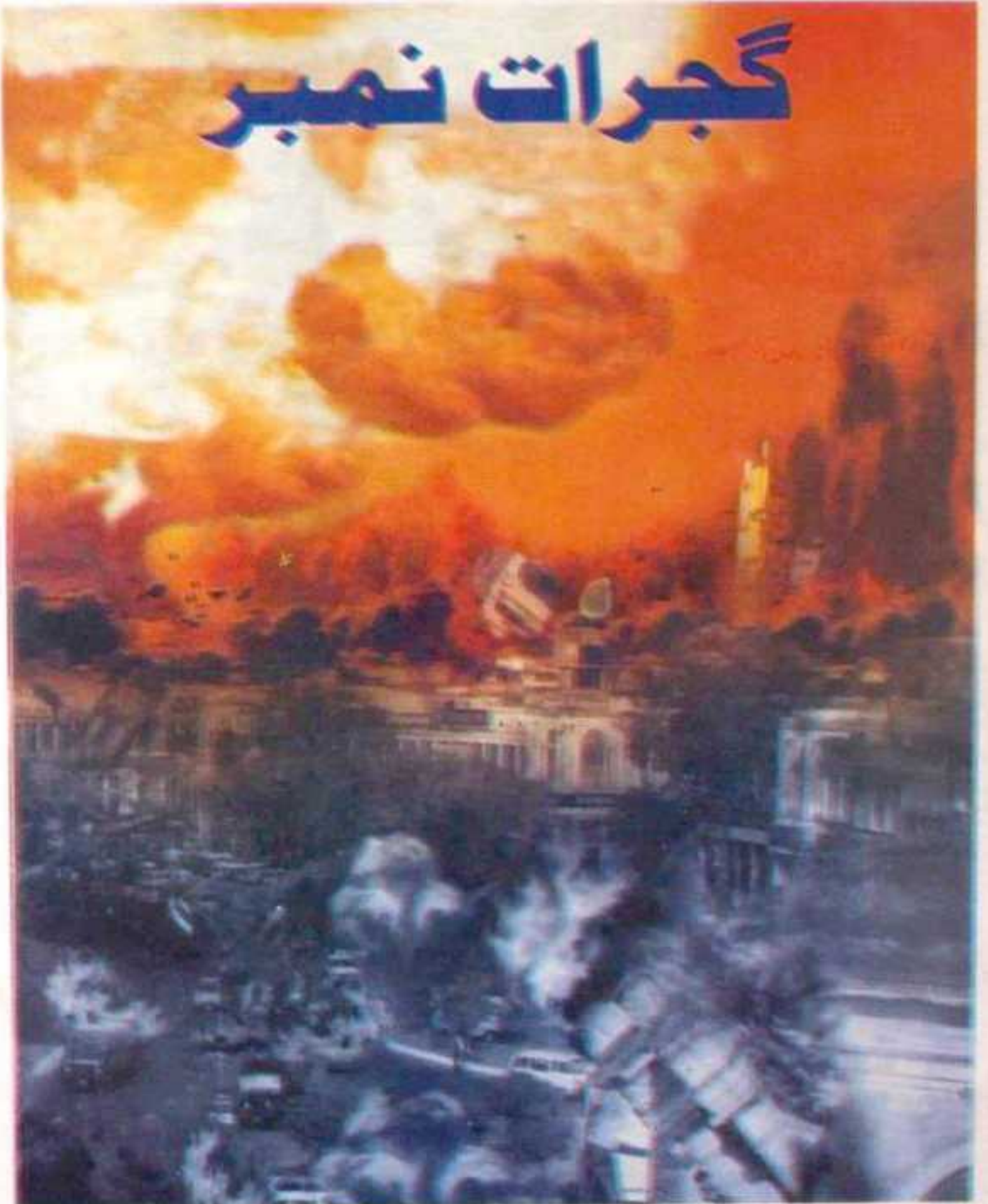
مدیر

انیس امروہوی

مثبت تخلیقی رویوں کا عکاس
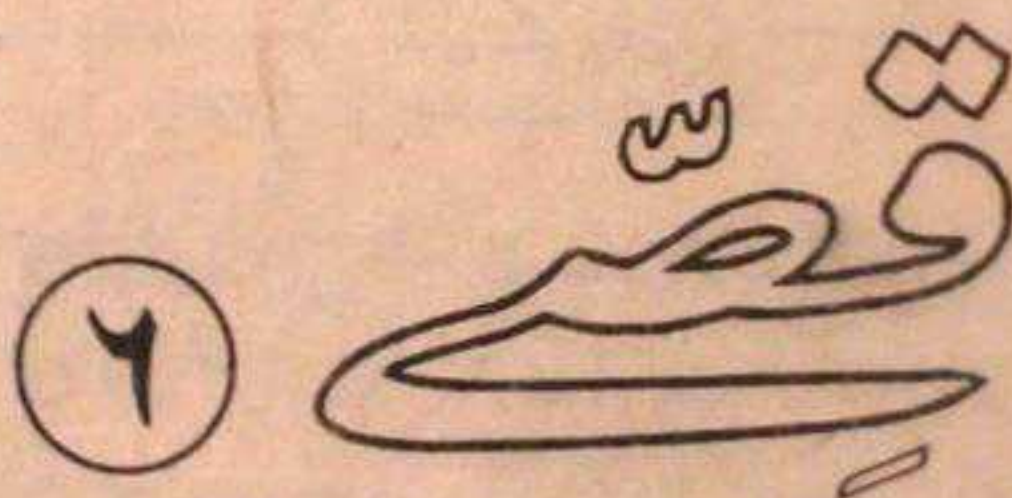
ستمبر ۲۰۰۲ء

مدیر

انیس امروہوی

شاہ حقّانی مارہروی
کا
اردو ترجمہ و تفسیرِ قرآن

(عہد، سماج، اسلوب، جمالیات اور تقابلی مطالعہ کی روشنی میں)

مصنفین:

ڈاکٹر سیّد محمد امین

محمد ارشاد احمد رضوی

ملنے کے پتے

- خانقاہِ برکاتیہ، بڑی سرکار، مارہرہ شریف (ایٹہ) یو۔پی
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، (یو۔پی)
- مکتبہ جامعہ، لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔ ۴۰۰۰۰۳
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

قصے ۲ دہلی

مدیر	انیس امروہوی
معاون مدیر	مسعود التمش
سرورق	نسیم امروہوی
قانونی مشیر	ناصر عزیز ایڈوکیٹ
کمپوزنگ	لیزر پوائنٹ، 1710- کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲

عام شمارہ	:	۴۰/روپے
زر سالانہ	:	۱۶۰/روپے
رجسٹرڈ ڈاک سے	:	۲۵۰/روپے
تاحیات	:	۳۳۰۰/روپے
بیرونی ممالک سے		
فی شمارہ	:	۵/امریکی ڈالر
زر سالانہ	:	۲۰/امریکی ڈالر

ہمارے تقسیم کار:

- موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ۶
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔ ۴
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ (یو۔ پی)
- سینٹرل نیوز ایجنسی، کناٹ پلیس، نئی دہلی۔ ۱

ISBN-81-87231-45-9

رابطہ: 104/B، یادو منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

Ph: 011- 244 2572 E-mail : qissey@rediffmail.com

پاکستان میں قصے سے رابطہ

☆ طفیل اختر، پرائم ٹائم پبلی کیشنز، F-122، بلاک-N، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 54700

☆ نقوش نقوی، ماہنامہ سخنور، B-6/C، سادات امروہہ سوسائٹی، سیکٹر A-37، اسکیم-33، کراچی۔

☆ اکرام تبسم، بنگلہ نمبر 113- عباس بلاک، مصطفےٰ ٹاؤن، لاہور۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر انیس امروہوی نے شکتی پرنٹرس، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی سے چھپوا کر دفتر قصے، 104/B- یادو منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲ سے شائع کیا۔

ترتیب

اس شمارہ میں

اداریہ

□ گجرات اور اُصول کامرس ☆ انیس امروہوی ۷

خصوصی مطالعہ

□ رات (تیرا اسمیلاش) ☆ شمیم حنفی ۱۳
□ معصوم بچوں کی نیندیں ☆ پرینکا کاکوڈکر ۳۱
□ ایک شاعر جسے گجرات سے عشق تھا ☆ سیّد محمد مہدی ۵۶
□ بھگوا خواتین کا بہناپا ☆ لتاپانکر ۴۵
□ کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں ☆ ماجد حسن ۴۹
□ ہے رام! ☆ فضل امام ملک ۵۵
□ گودھرا، آتش گیر مادہ اور کمپارٹمنٹ ☆ مانس داس گپتا ۶۳
□ ہندو ہیں ہم سکھی نہیں ☆ وشوناتھ ترپاٹھی ۶۷
□ بھیڑوں کی المیہ داستان ☆ ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی ۷۲
□ حسین ورما اور فاشسٹ ☆ ابار ربیؔ ۷۹

افسانے

□ لیبارٹری ☆ مشرف عالم ذوقی ۸۷
□ ادھیاتم ☆ بیگ احساس ۱۰۵
□ آگ اور پتنگے ☆ ولی محمد چودھری ۱۱۳
□ استھتی سامانیہ ہے ☆ اشتیاق سعید ۱۱۹
□ بوا نہیں ملی ☆ افشاں ملک ۱۲۶
□ ایک خط احمد آباد سے ☆ وجے ۱۳۴

غزلیں

□ مظہر امام	□ نشتر خانقاہی	۱۴۱
□ حامدی کاشمیری	□ ظفر گورکھپوری	
□ شمیم فاروقی	□ اکرام تبسم	
□ بلقیس ظفیر الحسن	□ اظہر عنایتی	
□ پی پی سریواستو رند	□ نور منیری	
□ جمال اویسی	□ شان بھارتی	
□ عقیل گیاوی	□ راشد طراز	
□ پروین کمار اشک		

نظمیں

□ وشنو ناگر	□ ساجدہ زیدی	۱۵۲
□ ڈاکٹر قمر رئیس	□ رفعت سروش	
□ زبیر رضوی	□ دیوی پرساد مشر	
□ مہاراج کرشن سنتوشی	□ مخمور سعیدی	
□ نعمان شوق	□ نصرت محی الدین	
□ حفیظ آتش	□ نسیم مخموری	
□ لکشمی شنکر واچی	□ راشد جمال فاروقی	
□ مظہر الزماں خاں	□ عبدالصمد تپش	
□ ترنم ریاض	□ بھگوان داس اعجاز	
□ انیس امروہوی		

پاکستان نامہ

□ سفر کہانی۔۲	☆مرغوب علی	۱۷۳

کتابیات

□ قابل مطالعہ کتابیں ○ تبصرے ۱۸۴

- معاصر اسلامی تحریکات اور فکر اقبال مبصر: انور کمال حسینی
- ازبکستان، انقلاب سے انقلاب تک مبصر: نگار عظیم
- کوکن، اور ممبئی کے اردو لوک گیت مبصر: سیّد اقبال امروہوی
- پیاس کا صحرا مبصر: کرامت علی کرامت
- آواز کے سائے مبصر: مشرف عالم ذوقی
- ایک غیر مشروط معافی نامہ مبصر: علی امام نقوی
- دفینے مبصر: مرغوب علی
- مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں مبصر: عقیل دانش
- آدھی رات کی شبنم مبصر: راشد جمال فاروقی
- ابابیلیں لوٹ آئیں گی مبصر: مرغوب علی
- فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس مبصر: مرغوب علی

بازگشت

□ قارئین کے خطوط ○ادارہ ۲۰۱

جہانِ کتب

□ موصولہ کتابیں ○ادارہ ۲۱۳

○○

گجرات اور اُصولِ کامرس

میں نے جب دسویں جماعت سائنس مضمون کے ساتھ پاس کر کے اپنے بڑے بھائی کے مشورے پر گیارہویں جماعت میں کامرس کے مضامین کے ساتھ داخلہ لیا تو پہلے ہی دن میرے بینکنگ مضمون کے استاد جناب سریندر ناتھ مِتل نے کامرس کے بنیادی اور زریں چار اصولوں میں سے ایک اصول پڑھاتے ہوئے سمجھایا کہ "بُری مُدرا (کرنسی) اچھی مُدرا کو چلن سے باہر نکال دیتی ہے۔" مجھے نہیں معلوم کہ میری کلاس کے باقی ساتھیوں کو کامرس کا یہ اصول سمجھ میں آیا یا نہیں مگر میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس وقت یہ بات کسی بھی طرح میری سمجھ میں نہیں آئی کہ برائی اچھائی کو چلن سے باہر کیسے کر سکتی ہے؟ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں نے تو بچپن سے ہی اپنے بزرگوں سے اور اپنے ماحول سے بھی سیکھا تھا کہ برائی پر اچھائی کی فتح ہوتی ہے۔ میں نے واقعہ کربلا سے، شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں سے، پنچ تنتر کی کہانیوں اور دسہرہ پر اپنے غیر مسلم دوستوں سے بھی یہی سیکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کامرس مضامین کے ساتھ انٹر میڈیٹ اور پھر بی کام اور اس کے بعد ایم۔ کام تک کی تعلیم مکمل کرلی، مگر میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ برائی اچھائی کو چلن سے باہر کر دیتی ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب میں نے عملی زندگی کے میدان کارزار میں قدم رکھا تو پایا کہ حقیقت میں ایسا ہی ہے۔ آج ہمارے سماج میں چاروں طرف یہی سب تو ہو رہا ہے۔ وجہ چاہے جو بھی ہو، یا چاہے جتنی ہوں مگر حقیقی زندگی میں دیکھا جائے تو آج ہر طرف برائی نے اچھائی کو چلن سے باہر کر رکھا ہے۔ یہی حال ہماری قومی سیاست کا بھی ہے۔ آزادی کے بعد بالعموم اور گزشتہ بیس برس سے بالخصوص ڈھیرے ڈھیرے اچھے سیاستدانوں کو بُرے سیاستدانوں نے چلن سے باہر کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ آج ہمیں سماج کے ہر شعبۂ حیات میں واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ گجرات کا نریندر موذی بھی اکنامکس کے اسی اصول کی پیداوار ہے۔ کیشو بھائی پٹیل کو کنارے لگا کر خود وزیر اعظم اور وزیر داخلہ نے موذی کو گجرات میں فٹ کیا تھا۔ اب جبکہ گجرات کے تمام واقعات و حادثات کی پرتیں کھلتی جا رہی ہیں، چاہے وہ سابرمتی ایکسپریس میں فاشسٹوں کی

منظم سازش ہو، یا پھر S-6 ڈبہ کو آلہ کار بنا کر پورے صوبہ گجرات میں منظم طریقے سے مسلمانوں کی نسل کشی اور بے رحمانہ قتل و غارت گری اور عصمت دری کے واقعات ہوں، ان سب کی پشت پر صرف اور صرف ایک ہی سازشی ذہن کام کرتا نظر آتا ہے۔

گجرات کے تعلق سے اب بہت سی باتیں واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ جس طرح سے ریلوے کے حفاظتی فورس کی رپورٹ کو نظر انداز کیا گیا، ڈبے میں سوار مسافروں کی فہرست کو پوشیدہ رکھا گیا اور فارنسک لیبارٹری کے ماہرین کی رپورٹ کو حکومت نے ایک طرح سے مسترد کر دیا، راحت کیمپوں میں تعصب سے کام لیا گیا اور بار بار ان کیمپوں کو بند کرنے کی دھمکی دی گئی، ان سب باتوں سے صاف ہو گیا ہے کہ ٹرین سانحہ بھی گجرات کی مسلم نسل کشی کی پلاننگ کا ہی ابتدائی حصہ تھا۔ کئی ماہ چلے ان فسادات میں جس طرح سے انتظامیہ یا تو تماشائی بنی رہی یا پھر نریندر موذی کے اشارے پر فسادیوں کی معاونت کرتی رہی اور پھر سنگھی پریوار کے نام نہاد لیڈران کے بیان آگ پر گھی کا کام کرتے رہے، اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس سب کی تیاری بہت پہلے سے کی جا رہی تھی۔ عالمی سطح پر ان فسادات کو شرمناک اور انسانیت کش کہے جانے پر بھی ہمارے مہان دیش کے مہان وزیر اعظم اور وزیر داخلہ اس سب کے لیے ذمہ دار نریندر موذی کی پشت پناہی کرتے رہے۔ نہ اس کی زبان کو لگام لگائی اور نہ ہی اس ملک کے عوام کو یہ بتایا کہ پوٹا جیسا قانون نریندر موذیوں کے لیے کیوں نہیں ہے؟ اقتدار کے لالچ نے تو ہمارے وزیر دفاع کو بھری پارلیامنٹ میں یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچوں کو نکال کر آگ میں جھونک دینا ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسا تو برسوں سے ہوتا آیا ہے۔ قارئین کرام! کیا ایسے لوگوں کو ٹی وی اسکرین پر بیان دیتے ہوئے دیکھ کر آپ کو گھن نہیں آتی؟ جس طرح کے دلدوز اور انسانیت سوز واقعات گجرات کی اس منظم نسل کشی میں دیکھنے اور سننے کو ملے ہیں، ایسا ہندوستان کی گزشتہ پچاس برس کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

اس سب کے بعد نریندر موذی کا گورو یاترا نکالنا اور الیکشن کمشنر لنگدوہ پر الزام تراشیاں کرنا، انسانی حقوق کمیشن کو کوسنا، گجرات میں انتخاب مرضی کے مطابق کرانے کے لیے کچھ بھی کر گزرنا، یہ سب کیا مرکزی حکومت اور اس کے اتحادیوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ سو کروڑ سے زیادہ آبادی والے اس ملک میں کوئی نریندر موذی سے یہ پوچھنے والا نہیں ہے کہ آخر گورو (فخر) کس بات پر کیا جا رہا ہے۔ زندہ لوگوں کے گلے میں جلتے ہوئے ٹائر ڈال کر ان کو بھون دینے کا گورو یا وحشی درندوں کے خوف سے ڈری سہمی بے گناہ عورتوں کی اجتماعی عصمت

دری کا گورو، یا سابرمتی ایکسپریس کے مسافروں کو اپنی سیاسی پگڑی کی کلغی اونچی کرنے کے لیے زندہ بھون دینے کا گورو، یا مہذب گھرانوں کے نوجوان، عورتوں و مردوں کے عمدہ قسم کی کاروں میں بیٹھ کر بڑے بڑے اسٹوروں سے من پسند اشیاء لوٹ کر اپنے گھروں کو بھرنے کا گورو، ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں نفرت اور دہشت کی تخم ریزی کرنے والوں کو گورو یاترا نکالنے کی اجازت اس ملک کے عوام نے کیسے دے دی؟ مجھے حیرت اس بات پر بھی ہے کہ صرف ایک سال ایک ماہ ایک دن قبل اس ریاست کے بڑے حصے پر آئے قہرالٰہی کو یہ لوگ کیسے بھول گئے اور وحشت اور دہشت کا یہ ننگا ناچ کھیل سکے۔

جب وزیراعظم لال قلعہ کی فصیل سے اور شاہ عالم کیمپ کے پھٹے ہوئے تمبو کے سائے میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ کسی سبھیہ (مہذب) سماج میں فرقہ واریت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، تب بھی مجھے حیرت ہوتی ہے کیونکہ وہ یہ کہنا بھول جاتے ہیں کہ کسی مہذب سماج میں نریندر موذی جیسے انسانیت کے دشمن کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہئے اور اس کے لیے صرف جیل کی اندھیری کوٹھری میں ہی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ مجھے حیرت قانون کے محافظوں پر بھی ہوتی ہے کیونکہ انہیں دہلی میں بڑھتی ہوئی آلودگی نظر آتی ہے مگر پورے سماج میں نفرت اور دہشت کی آلودگی پھیلانے والے فاشسٹ نظر آتے ہیں نہ ولی گجراتی کے مزار پر بنی ہوئی کولتار کی سڑک نظر آتی ہے اور نہ ہی ان کے عدلیہ کو نہ ماننے والے باغیانہ بیانات سنائی پڑتے ہیں۔ کتنی عجیب اور مضحکہ خیز بات ہے کہ ہندوستان کا قانون منتری اس خاندان سے تعلق رکھتا ہو جس خاندان کے بیشتر افراد عدلیہ کا فیصلہ نہ ماننے کا اعلان بہ بانگ دہل کرتے رہے ہوں۔ اب ہندوستانی عوام کو بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ آج کل قانون کس کی مٹھی میں ہے۔ اب مجھے بھی پوری طرح یقین ہو چلا ہے کہ واقعی بری مدرا، اچھی مدرا کو چلن سے باہر کردیتی ہے۔

☆☆

از کجا می آید ایں آوازِ دوست

گجرات میں تباہی، غارت گری اور قتلِ عام کا سلسلہ ہنوز جاری ہے جو برسوں ہی نہیں صدیوں ایک بھیانک خواب کی طرح ہر اس شخص کے ذہن و ضمیر کو پریشان کرتا رہے گا، جسے اپنے انسان ہونے کا احساس ہے۔ اس عظیم سانحے نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو "سارے جہاں سے اچھے" اپنے ہی ہندوستان میں غیر ہونے کا احساس دلایا ہے بلکہ تمام سیکولر ذہن لوگوں کو بھی عدم تحفظ کے SYNDROME میں مبتلا کردیا ہے، خواہ ان کا تعلق کسی بھی فرقے سے ہو۔

ایسے حالات میں ہندی کے ادیب و شاعر جس طرح بے باک اور دو ٹوک انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں، اس سے لگتا ہے کہ اب بھی کہیں کچھ باقی ہے۔ اس شمارے میں اُن کی نظموں اور مضامین کے تراجم ہماری جانب سے ممنونیت کا اظہار ہیں۔

گجرات کے حالیہ فسادات کا اردو سے بھی گہرا تعلق رہا ہے۔ گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار اس زبان کو بھی مظلومیت کا ایک اور کفن اس وقت اوڑھنا پڑا جب اردو کے اولین صوفی شاعر ولیؔ گجراتی کے مزار کو فاشسٹوں نے راتوں رات مسمار کر کے اس جگہ پر کولتار کی سڑک بنادی۔ غالب اکیڈمی نئی دہلی میں نکڑ ناٹک والوں کا ایک گروپ احتجاج کرتا ہے۔ رم جھم بارش کے دوران ہاتھوں میں جلتی شمعیں لیے غالبؔ کے مزار پر سب جمع ہوتے ہیں مگر اردو والوں میں صرف تین چار چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ اردو کے کسی ادارے نے بھی کوئی احتجاج نہیں کیا۔ نہ کسی کونسل نے، نہ کسی انجمن نے، نہ کسی اکادمی نے...... آخر یہ کیسا خوف ہے؟ 'انقلاب' جیسا لفظ دینے والی اس زبان کے محافظوں کے ذہنوں میں؟ یا پھر روزی روٹی سے جڑی مصلحتیں آڑے آتی ہیں۔ حال ہی میں شائع ایک سہ ماہی ادبی رسالہ کے مدیر محترم نے اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ اس سب پر کسی اردو کے ادبی رسالہ نے کوئی اداریہ تک نہیں لکھا۔ میرا خیال ہے کہ **قصے** کا شمارہ ۵ وہ نہیں پڑھ سکے، جو مارچ ۲۰۰۲ء میں ہی آ گیا تھا، اور اس شمارے میں ہم نے بھرپور طریقے سے احتجاج بھی کیا تھا اور مذمت بھی۔

☆☆

ایک خط آیا ہے، کافی تاخیر سے...... جناب ڈاکٹر ذکاء الدین شایاںؔ کا پیلی بھیت سے۔ اگر جلدی آتا تو بازگشت میں شامل ہو جاتا، مگر قارئین کے لیے اس میں بڑی اہم بات ہے۔ پہلے خط پڑھیں......

مکرمی! آپ نے جس محبت سے قصے۔٤ کا شمارہ مجھے ارسال فرمایا، میں اس کا بہت ممنون ہوں۔ میرا طریقہ یہ ھے کہ اداریہ کے ساتھ مکمل جریدے کے مشمولات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ھی اس پر اپنی ناچیز رائے بھیجتا ھوں۔ دیگر مشمولات جو بیشتر معیاری ھیں، ان سے قطع نظر میں آپ کے گراں قدر اداریہ بہ عنوان "امریکہ، دھشت گردی اور اسلام کو بغور پڑھنے کے بعد بہت مایوس ھوا۔ "ادب" یا "فنون لطیفہ" اپنے ذریعہ انسانیت اور امن وسکون کا جو بھی پیغام دیتے ھیں، وہ ان کا خصوصی اسلوب اور طریقۂ کار ھوتا ھے۔ "ادب و شعر" کا عمل یہ نھیں ھوتا کہ معاصر صحافت، سیاست یا روزانہ اخبارات کی باتوں کی طرح ادب و شعر

کے معاملات کو ان میں ملوث کریں۔ معاف فرمائیے گا، آپ کا اداریہ انھی عصری سیاستی، اخباری باتوں اور مسائل سے پرُ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذکورہ اداریہ مدیر موصوف نے "ادب" والوں یا اردو زبان کے مسائل کے بارے میں نہیں لکھا ہے اور صحافت یا اکیسویں صدی کے سیاسی اور غیر ضروری مسئلوں کو مدیرانہ حیثیت سے ایک مشیر کی طرح پھیلایا ہے...... تاریخ میں جھانکئے، کیا صدیوں پہلے صلیبی اور ہلالی جنگوں میں یہودی، عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان محض "مذھب" کی بنیاد پر کس قدر خونریزی اور تباھی کی گئی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہم خود امریکی اور انگریزی تہذیب میں رنگے ہوئے ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے اس خط اور اُن کے خیالات پر مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ قارئین کرام خود ہی اردو والوں کی ذہنی حالت کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔

☆☆

گزشتہ دنوں ایک افسوسناک خبر پڑھنے کو یہ ملی کہ بہار اردو اکیڈمی بند کر دی گئی ہے۔ بعد میں ایک معتبر شخص نے بتایا کہ بہار اردو اکیڈمی کے صرف فنڈ بند کر دیے گئے ہیں۔ میرے نزدیک دونوں باتیں ایک جیسی ہیں۔ یہ اس بہار اردو اکیڈمی کا حال ہے جہاں صوبائی سطح پر ہندوستان میں سب سے پہلے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تھا۔ کیا بہار میں آر جے ڈی کی سرکار بھی سنگھ پریوار کی طرح سوچنے لگی ہے؟ ادھر دہلی میں کانگریس کی سرکار اور محترمہ شیلا دکشت جی نے بڑی پبلسٹی کے ساتھ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا اعلان کیا تھا مگر عملی طور پر انتہائی حسین اور کشادہ دہلی اردو اکیڈمی کو شام ناتھ مارگ کی انتہائی تنگ اور کوڑے دان جیسی جگہ پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہاں دارا شکوہ لائبریری کا اس سے بھی برُا حال ہے جو خود دارا شکوہ کا اس وقت ہوا تھا جب اس خوبصورت اور عالم شہزادے کی آنکھیں نکلوا کر دہلی کی سڑکوں پر اس کو گھمایا گیا تھا۔ لوہے کے جنگلوں اور مختلف کاٹھ کباڑ سے گزر کر کبھی ایک بار محترمہ شیلا دکشت صاحبہ اس دارا شکوہ لائبریری کا حال دیکھنے جانا پسند کریں گی۔ سنا ہے کہ دہلی اردو اکیڈمی کی یہ منتقلی گورننگ باڈی کے کسی حاجی صاحب کی ایما پر ہوئی ہے۔ ان حاجی صاحب کو بھی ایک بار جا کر دارا شکوہ لائبریری کی حالت دیکھنی چاہیے، اور کتابت کی کلاس میں بیٹھے ہوئے بچوں کی حالت بھی دیکھنی چاہیے۔ اس منتقلی کی وجہ سے کمپیوٹر کی کلاسیں تو ویسے ہی بند ہو چکی ہیں۔ اردو والوں کو ایک بار محترمہ شیلا دکشت جی سے یہ ضرور پوچھنا چاہیے کہ آخر اردو کے ساتھ یہ سلوک کیوں؟

☆☆

گزشتہ چند ماہ میں اردو کے کارواں کا بڑا حصہ ہم سے جدا ہو گیا۔ کیفی اعظمی، سید خورشید مصطفیٰ رضوی (امروہہ) نعیم آروی (کراچی)، شام بارک پوری (کھلنا، بنگلہ دیش)، ہرچرن چاولہ (ناروے) عبداللطیف اعظمی، کرشن کانت (نائب صدر جمہوریہ ہند)، ڈاکٹر ابو محمد سحر (بھوپال)، مصور سبزواری، حمید الیاس، ظہیر کیفی امروہوی، اکرم فاروقی امروہوی، ہیرانند سوز (فرید آباد) رضا نقوی واہی، شعیب شمس (موتی ہاری) وغیرہ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان تمام حضرات نے اپنے اپنے طور پر اردو کی قابل لحاظ خدمت انجام دی، اردو کی آبیاری میں اپنا اپنا حصہ ادا کر گئے۔ ادارہ **قصے** ان تمام مرحومین کے اہل خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہے اور ان کے تمام متعلقین سے گزارش کرتا ہے کہ کم سے کم اردو کا ایک اخبار ان لوگوں کی یاد میں ضرور اپنے اپنے گھروں میں منگوائیں اور اپنے بچوں کو اردو پڑھنے، لکھنے اور بولنے کی تلقین کریں تاکہ آنے والی نسلوں کو بھی یہ معلوم رہے کہ ان کے آباو اجداد کس زبان میں کام کیا کرتے تھے اور وہ اپنے اجداد کی تحریروں اور تخلیقات کو دل سے محسوس کر سکیں، اور اپنی وراثت کو آنے والی نسلوں کو سونپ سکیں۔

☆☆

چلتے چلتے:

گجرات کے گاندھی نگر کے سوامی نارائن مندر میں اکشر دھام کے اندر گھس کر جو دہشت گردانہ کارروائی کی گئی ہے اور اس میں بہت سے بے قصور لوگوں کی جانیں گئی ہیں، ادارہ **قصے** اس وحشت ناک کارروائی کی پرزور مذمت کرتا ہے۔

گجرات پر اس شمارے کو ترتیب دینے میں خاصی مشقت اٹھانی پڑی کیونکہ ہم اسے ایک تاریخی دستاویز کی شکل دینا چاہ رہے تھے۔ صفحات کافی زیادہ ہو رہے تھے اس لیے کچھ کالم کم کرنے پڑے، جو آئندہ شماروں میں شامل رہیں گے۔ OO

شمیم حنفی

خصوصی مطالعہ

تیسرا اسمبلاژ

رات

○○○ .... محمد علوی، وارث علوی، جینت پرمار اور ریاض لطیف کے نام

○
○
○

ہم سب کبھی کبھی کوئی بھیانک خواب دیکھتے ہیں۔ ہولناک، ڈراؤنا خواب جو ہمیں رات کی تاریکی میں یا صبح کے سرمئی اجالے میں اٹھا کر بٹھا دیتا ہے۔ ہم دہشت زدہ، پسینے میں شرابور رہ جاتے ہیں اور پھر اچانک ہماری پور پور سرشار ہو اٹھتی ہے کہ وہ صرف ایک خواب تھا۔

افسوس، کہ آج جو کچھ ہمارے اردگرد ہو رہا ہے، ہماری زمین پر...... اکیسویں صدی کے آغاز پر، یہ ہولناکی، یہ انتشار، یہ تباہی، یہ قتل و غارت، یہ نفرت...... افسوس، یہ کوئی خواب نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا، زندہ بدخواب ہے!

یہ سب اتنا غیر حقیقی، اس قدر ناقابل تصور ہے کہ اسے شعور کی گرفت میں لانا مشکل ہے،...... یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، اس نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ میں اسے سمجھ سکوں، اس سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکوں، اس کی بابت کوئی عقلی رویہ اختیار کر سکوں۔

•

میں سوچ سکتا ہوں ان لوگوں کے کیا احساسات ہوں گے جو اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے ہیں، وہ سب کچھ جس کے لیے انہوں نے زندگی بھر تگ و دو کی، ان گھرانوں کے کیا جذبات ہوں گے جن کی مائیں اور باپ، جن کی عزیز اولاد، بہن بھائی، بزرگ اس جنون کا شکار ہو گئے۔
یادداشت!

—بورو تو دور ووچ: میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں!
(ترجمہ: زینت حسام)

[پہلے دو اسمبلاژ شعور (مدیر: بلراج مینرا) چھٹی کتاب، موسم گرما ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئے۔]

ابتدائیہ

○

ہم براہ راست حملے میں بچ گئے
اور اب چن چن کر مار دیے جانے کی کارروائی کے دوران
جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں

شاید ہمیں مارا نہیں گیا
قسط وار تحلیل کے مضبوط اصول کے تحت
ختم کر دیا گیا

یہ یاد رکھنا بہت مشکل ہو گیا ہے
کہ ہم زندہ رہے تھے
شاید ہم اس ملک میں پیدا نہیں ہوئے
جس کا نام تبدیل ہو گیا

○

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں
کہ میری تلاشی لی گئی
اور میرے دل کو چھین لیا گیا

اور نہ یہ کہ
مجھے باہر نکالنے کے لیے
میرے گھر کو آگ لگا دی گئی......

○

وہ ہمارے مارے جانے کا خواب دیکھتے ہیں
اور تعبیر کی کتابوں کو جلا دیتے ہیں

ـــ افضال احمد سید: چھنی ہوئی تاریخ

باب اوّل

○ ایک

کتابوں میں لکھا ہے ـــــ

سرزمین گجرات اردو کی ابتدائی شکل "گجری" کی جنم بھومی رہی ہے۔ گجرات ہی سے ولی گجراتی جیسا شاعر پیدا ہوا جس کا نسبی تعلق حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی الحسینی الگجراتی سے تھا، جو اپنے وقت کے ایک بڑے عالم اور خدا رسیدہ بزرگ تھے اور جن کا مزار احمد آباد میں نہرو پل کے مشرقی سرے پر حسان پور سیدواڑے میں آج بھی مرجع خلائق ہے......

(ڈاکٹر ہشو بھائی یاگنک کی ایک تحریر سے)

○ دو

ولی کی ایک غزل

(نریندر مودی کے لیے)

وہ نازنیں ادا میں اعجاز ہے سراپا
خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا
اے شوخ تجھ نین میں دیکھا نگاہ کر کر
عاشق کے مارنے کا انداز ہے سراپا
جگ کے ادا شناساں ہے جن کی فکر عالی
تجھ قد کوں دیکھ بولے یو ناز ہے سراپا
کیوں ہو سکیں جگت کے دلبر ترے برابر
تو حسن ہور ادا میں اعجاز ہے سراپا
گاہے اے عیسوی دم یک بات لطف سوں کر
جاں بخش مجھ کو تیرا آواز ہے سراپا
مجھ پر ولی ہمیشہ دلدار مہرباں ہے
ہر چند حسب ظاہر طناز ہے سراپا

○○

یہ غم کی رات تو کٹتی نظر نہیں آتی

ہرج مرج کھینچتے ہوئے، صعوبت سفر اٹھاتے ہوئے ہم چلے جاتے تھے کہ ایک شہر میں گزر ہوا۔ اس شہر کا عجب طور دیکھا۔ عمارت اور عمارت والوں کا رنگ اور پایا۔ جا بجا محلات و باغات شاہی مگر اجڑے ہوئے۔ اندر باہر لاشوں کے پنجر پڑے ہوئے۔ عالی شان امام باڑے مثل جسد امام مظلوم زخموں سے چور، دیواریں گولیوں سے چھلنی، توپوں کے گرابوں سے بھمباتے کھلے ہوئے، گنبد گرے ہوئے، لوگ سیہ پوش، خاموش، لب بند، محرمی صورت بنائے ہوئے، زبان حال سے مرثیہ خوانی کرتے ہوئے۔ شام پڑی تو لوگ اس طرح خاموش لب بند اپنے اپنے گھروں کو چلے اور گلی کوچے ہو حق کرنے لگے۔ نہ کوئی دکان کھلی تھی، نہ مکان میں چراغ جلتا تھا۔ پورا شہر اندھیرا تھا۔ دن کی وہ صورت، رات کی یہ کیفیت......

......بہت سنا تھا کہ اس شہر کے لوگ امام شہید کا سوگ بہ کمال نفاست و شائستگی مناتے ہیں۔ عزاخانے آباد ہوتے ہیں۔ روشنیوں سے جگمگاتے ہیں۔ امام باڑوں میں قندیلیں، موی شمعیں، دغدغے، جھاڑ فانوس، ہانڈیاں یوں جگمگاتی ہیں کہ سارے شہر میں ان سے روشنی پھیلتی ہے۔ گلی گلی سبیلیں لگتی ہیں۔ امام تشنہ کام کی یاد میں شربت پلایا جاتا ہے۔ توشہ بانٹا جاتا ہے۔ سبیلوں پر خلقت کا اژدہام ہوتا ہے۔ مجالس میں مجمع خاص و عام ہوتا ہے۔ پر یہ کون سا موسم عزا ہے کہ عزاخانے ویران پڑے ہیں۔ امام باڑے مسمار ہیں۔ گلیاں اندھیری ہیں۔ شہر بجھا پڑا ہے......

——انتظار حسین: جل گرجے

○ **تین**

یادوں کی غلام گردش

میں جس مکان میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ احمد آباد کی اسی کائنات کا حصہ ہے۔ جو احمد آباد کے باقی مکانوں کی طرح ہر وقت ایک کہانی سناتا رہتا ہے۔ کئی صدیوں کی تاریخ اس مکان میں سموئی ہوئی ہے۔ احمد آباد کے ماضی کی کہانی اور اس کے حال کی کہانی۔

یہ وارث علوی کا مکان ہے۔ بھاری شہتیروں کے بوجھ پر ٹکی ہوئی ولایتی کھپریل کی چھتیں۔ ایک کشادہ ہال۔ چار پانچ چھوٹے چھوٹے کمرے۔ باہر آنگن میں بیلیں اور پودے۔

سید واڑے کے اس گھر میں ایک چھوٹا سا خاندان آباد ہے اور بہت سی کتابیں۔ گھر سے ملحق قبرستان میں نئے پرانے بہت سے کتبے۔ گلی سے نکل کر ذرا دور چلو تو نظیری نیشاپوری کا مزار جس کے سقف و دیوار احمد آباد کی معاشرت اور ماضی کی خوشبوؤں سے معمور ہیں۔

○

اس کاٹھیاواڑی ہوٹل میں شاکاہاری کھانا کھا کے ہم نکلے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ لوہے کے پل سے ملحق فٹ پاتھ پر لوگ سو رہے تھے۔ ایک لڑکی، نیم برہنہ، اپنے نوزائیدہ بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اکا دکا راہ گیروں کی آمد و رفت سے بالکل بے نیاز اور اپنے آپ میں کھوئی ہوئی۔

میرے ساتھ رشید حسن خاں تھے، اور اس شہر خوبی کی ایک محفوظ، پر امن رات۔

کسی کو کسی کا ڈر نہیں...... ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔

○

ہمارے ہوٹل سے سابرمتی آشرم کا فاصلہ پانچ چھ کلو میٹر رہا ہوگا۔ ہم ادھر جا رہے تھے کہ جوگندر پال اور کرشنا پال واپس آتے ہوئے دکھائی دیے۔ سابرمتی ندی کا گدلا پانی سوکھ کر سمٹ گیا تھا، ایک مٹ میلی پتلی سی لہر کی صورت۔

آشرم میں سناٹا تھا، گنتی کے چند زائرین، کچھ دیسی کچھ بدیسی۔

سبزہ شاداب، ہوا مہربان اور ملائم۔

کنارے کی ایک پتھریلی بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، آشرم کے ایک کارکن نے بتایا۔ "صبح سویرے باپو یہیں بیٹھتے تھے۔ سابرمتی کی کل کل کرتی موج کے ساتھ باپو کے پریہ بھجنوں کی دھن گونجتی رہتی تھی۔

چاروں طرف ہریالی بہت ہے۔ پرندے اب بھی جھنڈ کے جھنڈ اترتے ہیں۔

○

ایک کشادہ ہال میں جہاں نشستیں زیادہ تھیں، بیٹھنے والے کم، سیکولرازم پر مذاکرے کا اہتمام تھا۔ مقررین میں ریاستی سرکار کے وزیر، گجراتی کے ادیب، ودیا پیٹھ اور ساہتیہ اکادمی کے بعض مدعوئین، باہر سے آنے والوں میں باقر مہدی بھی تھے۔ سیکولرزام، روشن خیالی، رواداری، قومی یکجہتی اور اتحاد، دن بھر ان لفظوں کی تکرار جاری رہی۔ تھکن یا اکتاہٹ کا اظہار کسی طرف سے نہیں ہوا۔ وہ باتیں کہی جا رہی تھیں جو شاید اس شہر کے باشندوں کو پہلے سے معلوم تھیں!

O

ہم نے احمد آباد سے گزر رہے تھے اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے سے مسلسل چلے جارہے تھے۔ وسیع اور روشن سڑکیں۔ جگمگ کرتی دوکانیں، ٹورسٹ، بوڑھے اور جوان، لڑکے لڑکیاں۔ پھولوں کے گجرے اور کچھ کی کڑھائی کا سامان بیچتی ہوئی نوکیلے سلونے چہروں والی عورتیں۔

ریاض لطیف نے کہا...... یہ دوکانیں رات دیر گئے تک کھلی رہتی ہیں۔ گجراتی کاروباری مزاج رکھتے ہیں۔ اسی لیے سکھ شانتی سے جینا جانتے ہیں۔

O

"عجیب بات ہے۔ ایسا پُر سکون، شانت، اپنے آپ میں مگن شہر۔ پھر یہاں اتنے جھگڑے کیوں ہوتے ہیں؟"

"جھگڑے کے اگلے ہی دن زندگی ایک دم معمول پر آجاتی ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

"گجرات کے لوگ مزاجاً نرم خو، اور صلح پسند واقع ہوئے ہیں۔" وارث نے جواباً کہا۔

زیادہ تر لوگ تجارت پیشہ ہیں۔ کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ دھیمی آواز میں بات کرنے والے۔ تھوڑے ست رو۔ ان میں پنجابیوں جیسا جوش نہیں ہے۔ بس کبھی کبھی اچانک کچھ گڑبڑ ہو جاتی ہے......

O

صبح صبح ہوٹل کی بالکونی سے باہر سڑک کے کنارے گایوں، بچھڑوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ پھر ایک بیل گاڑی آکر رکی۔ اس پر گھاس کے گٹھر لدے ہوئے تھے۔ اس راستے سے گزرنے والے یل دو پل کے لیے گاڑی بان کے پاس ٹھہرتے تھے۔ گھاس کے ایک دو گٹھر خریدتے تھے اور گایوں کے سامنے ڈال دیتے تھے۔

روز ناشتے سے پہلے بہتوں نے یہ معمول بنالیا تھا۔ آدمی اور جانور ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

O

گجرات اکادمی کی طرف سے سردار جعفری کی زندگی میں ان پر ہونے والا شاید آخری سیمینار۔ علی گڑھ، دہلی، بمبئی، لکھنؤ سے آنے والے مقالہ خواں اور خاص بڑا مجمع سامعین۔ گجرات کے تمام اداروں، مدرسوں، انجمنوں، سبھاؤں، ہندی، سندھی، اردو، گجراتی کے ادیبوں کی طرف سے جعفری صاحب کا اعزاز۔

پابلونرودا، ناظم حکمت، گوردیو ٹیگور، نہرو، گاندھی، سروجنی نائیڈو، شمال اور جنوب کے بہت سے لکھنے والوں کی باتیں...... یادوں کی سلسلہ در سلسلہ ایک طویل راہ گزر۔ جعفری صاحب کا حافظہ روشن تھا۔ یادوں کی ایسی جگ مگ جگ مگ کرتی شام کہ کسی کو بھی سورج کے اترنے کا خیال نہیں آیا۔ لگتا تھا قبیلے کے تمام لوگ اپنے قصہ گو کا بیان سننے میں کھو سے گئے ہیں۔

وارث علوی بہت مطمئن اور خوش دکھائی دیتے کہ جعفری صاحب کے بہانے پورا گجراتی سماج ایک اردو شاعر کو خراج پیش کرنے کے لیے اکٹھا ہو گیا تھا۔

اور گودھرا بہت دور تھا۔

اور کارسیوک اور رام بھکت بہ مع ہمارے سویم سیوک پردھان منتری کے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایک پوتر اور سنکلپ، وشواس سے بھرے ہوئے بھارت کی تعمیر کا تعاقب جاری تھا اور راوی چین لکھتا تھا......

○

اے عزیز! تو کس زمانے کا ذکر کرتا ہے۔ اب یہاں کی زمین اور فلک اور ہوا۔ کوچے بے ربط ہو گئے۔ گلیاں بکھر گئیں۔ جو فیض کے دریا تھے خشک ہو گئے۔ شہر پیاسا ہے۔ شہر کے چاند پہ ظلم کی گھٹا چھائی ہے۔ شہر اندھیرا ہے۔ گھروں پر دوڑیں چلی آتی ہیں۔ مردانِ حُر گرفتار ہوتے ہیں اور گردن مارے جاتے ہیں۔ اے عزیز تو کس موسم میں ہمارے شہر آیا......

— انتظار حسین: جل گرجے

باب دوم

احمد آباد ۲۰۰۲ء

وہ بستی آج کتنی اجاڑ نظر آتی ہے۔ وہ بستی جہاں خلقت ٹوٹتی تھی، وہ جو کبھی قوموں کی سرتاج اور شہروں کی ملکہ تھی۔ اس کا سہاگ لٹ گیا۔ وہ تابعدار بن گئی۔ وہ راتوں کو پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی گنگا بہتی ہے۔ اب اس کے وہ رفیق کہاں ہیں جو اس کے آنسو پونچھیں۔ اس کے دوستوں نے اس سے دغا کی۔ اس کے یاروں نے اس سے ساکا کیا...... صیہون کی راہیں ماتم کرتی ہیں کہ یاتریوں کے قدم اب ان کی خاک کو

نہیں چومتے۔ اس کے پھاٹک سنسان پڑے ہیں۔ اس کے کاہن ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ اس کی کنواریوں کی آبرو خاک میں مل گئی۔ اس کا تو مقدر پھوٹ گیا......

میاں بی کا نوحہ

- مرنے والوں کی تعداد آزاد ذرائع کے مطابق دو ہزار سے زیادہ ہے۔
- تقریباً پونے دو لاکھ لوگ گھروں سے نکالے گئے۔ ریلیف کیمپوں میں پڑے ہیں۔
- ۲۸۰ درگاہیں اور ۱۸۰ مسجدیں مسمار کر دی گئیں۔
- ولی گجراتی کے مزار کو ڈھا کر راتوں رات ہموار کر دیا گیا۔ استاد فیاض خان کے مدفن کی بے حرمتی کی گئی۔ اس پر جلتے ہوئے ٹائر پھینکے گئے۔

کل رات بڑودہ سے ایک دوست نے فون کیا۔ وہ برابر روئے جا رہی تھی۔ معاملہ کیا تھا، یہ بتانے میں اسے پندرہ منٹ لگ گئے۔ وہ کوئی پیچیدہ بات نہ تھی۔ صرف اتنی سی بات تھی کہ اس کی سہیلی سعیدہ کو بلوائیوں نے پکڑ کر اس کا پیٹ چاک کر دیا اور اس میں جلتے ہوئے چیتھڑے ٹھونس دیئے۔ صرف یہ ہوا کہ جب سعیدہ مر گئی تو کسی نے اس کی پیشانی پر اوم لکھ دیا۔

—— اروندھتی رائے: ہندوستان میں جمہوریت کا مستقبل کیا ہوگا؟

مٹتی بنتی کچھ تصویریں

پہلی تصویر

۳۰ر مئی کی شام کو میں نے ٹی۔ وی کھولا تو پارلیمنٹ میں جارج فرنانڈیز تقریر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: "یہ لوگ عورتوں کے رحم کو چیر کر بچوں کو نکال کر مار دیئے جانے کا بار بار بیان کرتے ہیں...... تو کیا ایسا پہلی بار ہو رہا ہے؟ یہ تو پہلے بھی بہت بار ہو چکا ہے۔"

جارج فرنانڈیز کے پہلو میں شہری ہوابازی کے وزیر سید شاہنواز حسین بیٹھے ہوئے ہیں، مسکرا رہے ہیں۔

دوسری تصویر

ہمارے وزیراعظم تقریر کر رہے ہیں:

گودھرا میں ۵۸ ہندو مسافروں کو مسلم انتہاپسندوں نے جلایا اور ہندوؤں کو اس پر غصہ آگیا۔ جو مر چکے ہیں ان میں ہر ایک کسی کا بھائی تھا۔ کسی کا بیٹا تھا۔ کسی کی ماں تھی...... کیا قرآن میں کوئی آیت ہے جو انہیں زندہ بھون دینے کو کہتی ہو؟

○ تیسری تصویر

اسٹار نیوز پر ایک مباحثے کے دوران:

ایک شریک: "نریندر مودی کو حکومت چلانے کا کوئی تجربہ نہیں۔
پہلے ایک کینٹین چلاتے تھے۔ بریڈ پکوڑے تلتے تھے......"

○ چوتھی تصویر

[ایک نظم جو احمد آباد میں لکھی گئی:]

دور......

بہت ہی دور تھا مجھ سے بھاگل پور
پھر بھی میں ایک ایک گلی میں
خون میں لت پت پڑا ہوا تھا
ایک اک گھر میں
گھر والوں کے ساتھ جلا تھا!
کٹی پھٹی ، بجھی
اور جلی بھنی لاشوں میں
ڈھونڈ رہا تھا میں اپنوں کو
مجھ کو مری تلاش بھی تھی!!

ـــ محمد علوی: بھاگل پور (چوتھا آسمان سے، اشاعت ۱۹۹۱ء)

○ پانچویں تصویر

ایک سلسلہ:

مئی ۲۰۰۲ء کی ایک گرم حبس زدہ شام:

نئی دلی کے فارن کرسپانڈنٹس کلب (F.C.C) کا مختصر سا لان، جہاں گوپال مینن کی دستاویزی فلم GENOCIDE IN THE LAND OF GANDHI (ذیلی عنوان "ہے رام") کے ایک شو کا اہتمام کیا گیا ہے۔ دنیا بھر کی نیوز ایجنسیوں کے نامہ نگار، ملکی اور غیر ملکی صحافی، نوجوان لڑکے لڑکیاں جمع ہیں۔ فلم شروع ہوتی ہے۔

بلکتے ہوئے بچے۔ سہمی ہوئی لڑکیاں۔ سینہ کوبی کرتی ہوئی عورتیں۔ جلتے ہوئے گھر۔ جھلسی ہوئی لاشیں۔ اجڑے ہوئے بازار۔ سنسان محلے۔ خاکی

وردی میں ملبوس پولیس کے کارندے آن ڈیوٹی۔ سراسیمہ پریشان ایک جوالا مکھی سینے میں چھپائے نہتے نوجوان۔ بیچ بیچ میں زیندر مودی، اڈوانی، باجپائی، تلک دھاریوں اور ترشول برادروں کے چہرے، جلوس......اڈوانی مردہ باد، مودی کو ہٹاؤ، باجپائی مردہ باد، مردہ باد، مردہ باد!!!

○

رسائل و جرائد اور اخبارات کو ناراضگی کے سینکڑوں خط بھیجے گئے کہ میڈیا نے گودھرا حادثے کی اتنی مذمت نہیں کی جتنی بعد میں برپا ہونے والے فساد کی۔ لیکن جو بات یہ لوگ نظر انداز کر رہے ہیں، وہ دونوں حادثوں کی نوعیت کا فرق ہے۔ گودھرا میں جو کچھ ہوا۔ ہماری سرکار نے بغیر کسی ثبوت کے اسے آئی ایس آئی سے منسوب کر دیا۔ آزادانہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ وہ فوری اشتعال کا نتیجہ تھا۔ بہر حال جو بھی تھا المناک اور قابل مذمت ہے۔ لیکن بعد میں گجرات میں جو کچھ ہوا وہ حکومت کی اپنی مرضی اور معاونت سے ہوا......

۔۔۔اروندھتی رائے

ریاست شہریوں کے نام پر حکومت کرتی ہے اور میں ایک شہری ہونے کے ناطے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ گجرات کی نسل کشی میں مجھے بھی کسی نہ کسی طور پر ملوث کر لیا گیا ہے۔ یہی چیز مجھے اشتعال دلاتی ہے اور یہی چیز گودھرا اور گجرات کے فرق کو واضح کرتی ہے۔

......اروندھتی رائے

○

گوپال مینن کی فلم کے شو میں اروندھتی رائے بھی موجود ہیں۔ ان کا چہرہ سپاٹ اور ویران ہے۔ شو کے دوران وہاں موجود ہر چہرہ سپاٹ اور ویران ہے۔ شو کے بعد بی بی سی کی ایک نامہ نگار لڑکی پوچھتی ہے......

سوال: آپ کا ردعمل......؟

جواب: یہ موت کا تماشا تھا۔ اپنی موت کا ردعمل کون بتا سکا ہے!

کوئی کسی سے کچھ نہیں کہتا۔ سب نڈھال اور خاموش ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے ہیں......

○

پانی دھاروں دھار برس رہا تھا۔

بستی نظام الدین کی گلیاں جل تھل ہو گئیں۔ لیکن غالب اکیڈمی کے آڈیٹوریم میں نکڑ ناٹک والوں کا ایک گروپ پُر جوش لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ اردو، ہندی، پنجابی اور کئی دوسری زبانوں کے چھوٹے بڑے ادیب، صحافی، دانشور، سماجی کارکن جمع ہو گئے تھے۔ آج گجرات کے خلاف ملک کے مختلف صوبوں کے تیس شہروں میں احتجاج کا دن تھا۔ غالب کے مزار پر ہوا کے تیز جھکڑوں اور طوفانی بارش کے دوران ہاتھوں میں چراغ لیے، بچتے بچاتے سب نے حاضری دی۔ اشوک واجپئی، راجندر یادو، منگلیش ڈبرال، مشیر الحسن، اپوروانند، اجیت کور، سدھیر چندر، گیتانجلی شری، مشرف عالم ذوقی، کنور نارائن، آلوک دھنوا، رام سرن جوشی، علی جاوید، انیس امروہوی کے مانوس چہرے...... سنگھ پریوار کی طرف سے...... ولی کے مزار کے بعد اگلا نشانہ کیا ہو گا...... مزار غالب، خسرو...... کسے معلوم!

○

کانگریس نے بیج بوئے، بی جے پی فصل کاٹ رہی ہے۔
لیکن کانگریس نے سب کچھ رات کے اندھیرے میں کیا۔
بی جے پی وہ سب دن کے اجالے میں کر رہی ہے۔
کانگریس نے منافقت اور شرمندگی کے ساتھ کیا۔
بی جے پی فخر اور ڈھٹائی کے ساتھ کر رہی ہے۔

— اروندھتی رائے: آوٹ لک، ۶ر مئی ۲۰۰۲ء

○

محمد علوی کی ایک اور نظم:
(پروین توگڑیا، اشوک سنگھل اور آچاریہ گری راج کشور کے لیے)

آدھی رات ہوئی
اور پورا چاند نکل آیا
سوتے میں
ہونٹ چیر کے
اس کے دانت بڑھے اور ناخن نکلے
تیز، نکیلے، بڑے بڑے!
پھر سارے بدن پر

بال ہی بال اگ آئے!
گاؤں سے باہر۔۔ جنگل میں
بھیڑیے مل کر چلائے۔۔

۔۔ نظم: ذولف مین

باب سوم

شاہ عالم کیمپ کی روحیں

شاہ عالم کیمپ میں آدھی رات کے بعد روحیں آتی ہیں، روحیں اپنے بچوں کے لیے جنت سے کھانا لاتی ہیں، پانی لاتی ہیں، دوائیں لاتی ہیں اور بچوں کو دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عالم کیمپ میں نہ تو کوئی بچہ ننگا بھوکا رہتا ہے اور نہ بیمار۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عالم کیمپ بہت مشہور ہو گیا ہے۔ دور دور مرنے والوں میں اس کا نام ہے۔ دلی کے ایک بڑے نیتا جب شاہ عالم کیمپ کے دورے پر گئے تو بہت خوش ہو گئے اور بولے۔ "یہ تو بہت بڑھیا جگہ ہے...... یہاں تو دیش کے سبھی مسلمانوں کو پہنچا دینا چاہیے......"

○

شاہ عالم کیمپ میں ایک روح سے نیتا نے پوچھا:
"تمہارے ماں باپ ہیں؟"
"مار دیا سب کو۔"
"بھائی بہن؟"
"نہیں ہیں۔"
"کوئی ہے؟"
"نہیں!"
"یہاں آرام سے ہو؟"
"ہاں! ہوں!"
"کھانا دانا ملتا ہے؟"
"ہاں ملتا ہے۔"
"کپڑے وپڑے ہیں؟"

"ہاں، ہیں!"
"کچھ چاہئے تو نہیں۔"
"کچھ نہیں!"
"کچھ نہیں؟"
"کچھ نہیں!"
نیتا جی خوش ہو گئے۔ سوچا لڑکا سمجھ دار ہے۔ مسلمانوں جیسا نہیں ہے۔

○

شاہ عالم کیمپ میں آدھی رات کے بعد ایک عورت کی گھبرائی بوکھلائی روح پہنچی جو اپنے بچے کو تلاش کر رہی تھی۔ اس کا بچہ نہ اس دنیا میں تھا، نہ کیمپ میں تھا۔ بچے کی ماں کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ دوسری عورتوں کی روحیں بھی اس عورت کے ساتھ بچے کو تلاش کرنے لگیں۔ ان سب نے مل کر کیمپ چھان مارا۔ محلے، گلی، گھر دھوں دھوں جل رہے تھے۔ چونکہ وہ روحیں تھیں اس لیے مکانوں کے اندر گھس گئیں۔ کونا کونا چھان مارا۔ لیکن بچہ کہیں نہ ملا۔

آخر بھی عورتوں کی روحیں دنگائیوں کے پاس گئیں۔ وہ کل کے لیے پٹرول بم بنا رہے تھے۔ بندوقیں صاف کر رہے تھے۔ ہتھیار چمکا رہے تھے۔ بچے کی ماں نے ان سے اپنے بچے کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنسنے لگے اور بولے ...... "ارے پگلی عورت! جب دس دس بیس بیس لوگوں کو ایک ساتھ جلایا جاتا ہے تو ایک بچے کا حساب کون رکھتا ہے؟ پڑا ہوگا کسی راکھ کے ڈھیر میں۔"

ماں نے کہا۔ "نہیں! میں نے ہر جگہ دیکھ لیا ہے۔ کہیں نہیں ملا۔"

تب کسی دنگائی نے کہا۔ "ارے، یہ اس بچے کی ماں تو نہیں ہے جسے ہم ترشول پر ٹانگ آئے ہیں!"

—— اصغر وجاہت
(راشٹریہ سہارا ہندی، ۹ر جون ۲۰۰۲ء)

○

بلوائیوں کی ایک بھیڑ نے کانگریس ایم۔ پی اقبال احسان جعفری کے مکان کو گھیر لیا۔ ڈائرکٹر جنرل آف پولیس، پولیس کمشنر، چیف سکریٹری ایڈیشنل، ہوم چیف سکریٹری کو جعفری لگاتار فون کرتے رہے، کسی نے نہیں سنا، گشتی پولیس کی وین مکان کے آس پاس موجود تھی۔ اس نے بھی کوئی مداخلت نہیں کی، بھیڑ گھر کے اندر گھس گئی، جعفری کی بیٹیوں

کے کپڑے پھاڑ کر انہیں آگ میں جھونک دیا۔ جعفری کو قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔

— آؤٹ لک، ۶؍ مئی ۲۰۰۲ء

○

وشو ہندو پریشد کے بین الاقوامی جنرل سکریٹری پروین توگڑیا کا کہنا ہے کہ گجرات میں فرقہ وارانہ مسئلہ "ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل کر دینے کی" ایک زبردست لہر آئی ہوئی ہے۔ وشو ہندو پریشد کے ریاستی صدر کے نام سے پوسٹر اور پمفلٹ تقسیم ہوئے ہیں جن میں مسلمانوں کا سوشل، کمرشیل اور ہر سطح پر بائیکاٹ کرنے، انہیں اپنا دشمن سمجھنے اور انہیں پوری طرح ختم کر دینے کی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔

— ہندو ماں باپ سے کہا گیا ہے کہ اپنے بچوں کو کراٹے اور تلوار کے کرتب سکھائیں۔

— اپنے بچوں کو مسلمانوں اور عیسائیوں سے دور رکھیں۔

— مسلمانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ہندو مزدوروں میں پھوٹ ڈال رہے ہیں۔ ہندو بزنس خراب کر رہے ہیں۔

— ہندوؤں کو سکھایا گیا ہے کہ LPG سلنڈروں کا استعمال کر کے کس طرح مسلمانوں کو ہلاک کیا جاسکتا ہے۔

— مسلم تاجروں کو کس طرح ختم کرنا چاہئے۔ پولیس انکوائری سے کس طرح بچنا چاہئے۔ جھوٹے ایف آئی آر کس طرح لکھوائے جائیں۔

○

ہم مسلمانوں کو نماز پڑھنے دیتے ہیں، ہمیں کوئی سبق دینے کی کوشش نہ کرے۔

○

گجرات کے دنگوں میں جو بھی ہوا، وہ گودھرا کا نتیجہ ہے۔ جہاں معصوم اور بے گناہ لوگوں کو جلا دیا گیا۔ گجرات کا سانحہ شروع کیسے ہوا؟ آگ لگائی کس نے؟ آگ پھیلی کیسے؟

— پردھان منتری کی ایک تقریر سے

○

"گورو گولوالکر اور ویر ساورکر کی کتابوں میں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے...... رواداری، دوسروں کے ساتھ نرمی اور انصاف ہمارا کردار رہا ہے۔" اوما بھارتی

"کیوں جھوٹ بولتی ہیں؟" جاوید اختر

— The Big Fight ٹیلی ویژن پر ایک مکالمہ

○

گجرات کا یہ فساد کسی اچانک واقعے کا ردعمل ہرگز نہیں تھا، بلکہ ٹرین میں آگ لگنے سے پہلے ہی فساد کا زبردست منصوبہ تیار کیا گیا تھا، جس میں اعلا دماغ ملوث تھے۔ اتنا بڑا منظم فساد کسی بھیڑ کے ذریعے اچانک ناممکن ہے۔ وشو ہندو پریشد اور اس کے ساتھ دوسری ہندو فاشسٹ تنظیمیں مل کر فساد کا منصوبہ خفیہ طریقے سے تیار کر چکی تھیں۔ گودھرا کے ٹرین حادثے کو تو بہانہ بنایا گیا ہے۔ اگر یہ ہنگامہ نہ ہوتا تو کسی اور طرح کا ہنگامہ کھڑا کر کے مسلمانوں کے قتل عام کو ردعمل کا نام دے دیا جاتا۔

—— برطانوی ہائی کمیشن کی تحقیقاتی رپورٹ سے

○

باجپئی، اڈوانی اور مودی تینوں گجرات کے مجرم ہیں۔ ان تینوں پر مقدمہ چلانا چاہیے، لیکن ان سے کم گنہگار وہ لوگ بھی نہیں ہیں جن کے سہارے باجپئی سرکار چل رہی ہے...... میرا کہنا ہے کہ باجپئی دراصل مودی کو ہٹانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ مودی کے ہٹنے سے باجپئی کی ساری قلعی کھل جائے گی۔ مودی کہہ رہا ہے کہ مجھے ہٹا کر تو دیکھو۔ مہاجن کہہ رہے ہیں کہ دھرتی ادھر سے ادھر ہو جائے مگر مودی نہیں ہٹیں گے۔

—— لالو پرساد یادو کے ایک انٹرویو سے
ہفتہ وار "نئی دنیا" نئی دلی۔ ۱۷ر تا ۲۳ر مئی ۲۰۰۲ء

○

۲۷ر فروری کی شام کو جب سورج ڈھل چکا تھا، نریندر مودی نے پولیس کے اعلیٰ افسران کو اپنے بنگلے پر بلایا۔ ان افسران سے کہا کہ لوگ گودھرا ٹرین حادثے کے بعد شدید طور پر غیظ و غضب سے بے تاب ہیں۔ وہ اپنا غصہ نکالنا چاہتے ہیں، اس لیے آنے والے کل میں لوگوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع دیا جائے اور انہیں اپنا غصہ اتارنے سے نہ روکا جائے۔

—— منوجوزف، آوٹ لک

○

۲۸ر فروری کو پولیس کنٹرول روم میں نریندر مودی کی وزارت کے دو کیبنٹ وزیر موجود تھے اور جائزہ لے رہے تھے کہ مودی نے جو احکامات کل دیے تھے، ان پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے۔ کیبنٹ کے یہ وزراء اشوک بھٹ اور آر کے جڈیجہ ہیں۔ مودی چاہتا تھا کہ ریاست میں ہندو بیداری لہر کا علم بردار بن جائے اور بھاجپا میں اپنا وقار بڑھا لے۔ وہ اپنی

''انتظامی صلاحیتوں'' کا بھی اظہار کرنا چاہتا تھا۔

——— جسٹس کرشنا ایئر کی سربراہی میں قائم شدہ ٹریبول کے

روبرو ایک سینئر وزیر کے بیان سے

ہفت روزہ ''نئی دنیا'' ۷ر تا ۱۳ر جون ۲۰۰۲ء

باب چہارم

قاتل اب بھی گجرات کی سڑکوں پر دندناتے پھر رہے ہیں۔ لوگوں کو مارنے والے عام زندگی پر اب بھی پوری طرح حاوی ہیں۔ کون کہاں رہے، کون کیا کہے، کون کس سے ملے اور کہاں اور کب۔ یہ سب وہی طے کر رہے ہیں اور ان کا اقتدار تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ مسلم بزنس تباہ کر دی گئی ہے۔ ہوٹلوں میں مسلمانوں کو داخل نہیں ہونے دیا جا رہا ہے۔ مسلمان بچوں کا اسکول میں استقبال نہیں ہوتا۔ وہ دہشت زدہ ہیں اور امتحان میں نہیں بیٹھ سکتے۔ والدین اپنے بچوں کے بارے میں فکر مند ہیں۔ کہتے ہیں پبلک مقامات پر بچے انہیں ''امی، ابا'' کہہ کر نہ بلائیں۔ اچانک موت نہ ٹوٹ پڑے۔ نوٹس پہلے ہی دیا جا چکا ہے کہ یہ تو شروعات ہے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

○

بھارت بغیر اس وسعت اور حسن اور ان تمام ثقافتوں کی رنگارنگی اور تنوع کے کیسا ہوگا۔ وہ ایک سمادھی بن جائے گا، جس سے شمشان گھاٹ کی بدبو آ رہی ہوگی۔

○

ایک حرف مکرّر

ہندوستان میں اس سے پہلے بھی ہر طرح کے فسادات اور قتل عام ہوتے رہے ہیں جن میں خاص فرقوں، قبیلوں اور مذاہب کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کانگریس نے گناہ کیے، سخت گناہ کیے اور کئی دہائیوں تک کیے، لیکن اس نے سب کچھ رات کے اندھیرے میں کیا۔ بی جے پی وہ سب دن کے اجالے میں کر رہی ہے۔ کانگریس نے چھپ کر، منافقت اور شرمندگی کے ساتھ کیا۔ بی جے پی وہی سب کچھ کھلے بندوں، ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ کر رہی ہے۔

——— اروندھتی رائے، آؤٹ لک، ۶ر مئی ۲۰۰۲ء

(ترجمہ: غطریف شہباز ندوی) ماہنامہ افکار ملی، دہلی، جون۔ ۲۰۰۲ء

پربھاش جوشی کا خط، اٹل بہاری باجپئی کے نام

پیارے سویم سیوک اٹل جی!

پردھان منتری کے نام سے مخاطب نہیں کر رہا ہوں تو اس لیے کہ آپ ہی نے ۹ر ستمبر ۲۰۰۰ء کے دن نیویارک میں اپنے فرقے کے لوگوں سے کہا تھا کہ آپ پردھان منتری ہمیشہ تو نہیں رہیں گے۔ لیکن سویم سیوک بنے رہنے کا ادھیکار آپ سے کوئی نہیں چھین سکتا!

وزیراعظم، ممبر پارلیمنٹ اور سویم سیوک جی!

پارلیمنٹ میں گودھرا پر آپ پہلی بار ۱۶ر مارچ یعنی اس ہلاکت خیز اگنی کانڈ کے سترہ دن بعد بولے۔ چونکہ آپ بار بار شکایت کرتے ہیں کہ بیان بدلنے کا آپ پر جھوٹا الزام عاید کیا جاتا ہے، اس لیے لوک سبھا کی ۱۶ر مارچ کی کارروائی سے ہی مثال دے رہا ہوں۔ آپ نے کہا تھا۔ "اس سلسلے میں ہم اس اختلاف میں نہ جائیں کہ کیسے ہوا جو گودھرا میں ہوا۔ ہم سب جانتے ہیں، لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ ایک مجرم دوسرے مجرم کو دودھ کا دھلا ثابت نہیں کر سکتا۔ انتقامی تشدد کبھی اچھا نہیں ہوتا۔" لیکن ساتھ ہی، ایسے کہنے کے ۲۷ر دن بعد اپنی پارٹی کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں آپ نے کہا۔ "گجرات کے دنگوں میں جو بھی ہوا، وہ گودھرا کا نتیجہ ہے!"

—— آپ مکر نہ جائیں اس لیے یہ مثال آپ کے سب سے حمایتی اخبار **جاگرن** اور **پانیر** سے لی گئی ہے۔ کیا مجھے پوچھنے کی ضرورت ہے کہ گودھرا کے بارے میں ایوان پارلیمنٹ میں آپ نے کچھ اور کہا، اور گوا کے عام اجلاس میں کچھ اور ...... کیا آپ نہیں جانتے کہ آپ کا پورا فرقہ گجرات کی مسلم نسل کشی کو گودھرا کا نتیجہ ہی نہیں اس کا جواز ثابت کرنے کا سب سے بڑا بہانہ بتاتا آرہا ہے۔

—— آپ پارلیمنٹ میں ملک کے لیڈر کی طرح بولتے ہیں۔ اپنی پارٹی کے اجلاس عام میں بھاجپا کے چھٹ بھیا نیتا کی طرح۔

—— آپ کے پاس ہوں گی (اور میرے پاس بھی ہیں) ساورکر اور گولوالکر کی وہ کتابیں جن میں بتایا گیا ہے کہ ہندو کون ہے اور ہماری قومیت کیا ہے۔ میں ان کتابوں سے کئی مثالیں دے کر بتا سکتا ہوں کہ "ہندوتو" میں مذہبی، نسلی، ثقافتی اور لسانی کثرتیت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہندوتو ایک مذہب، ایک ثقافت، ایک زبان اور ایک راشٹر پر جم کر کھڑا ہے۔

۔ گجرات کی مودی سرکار کی مدد سے آپ کے سویم سیوکوں نے وہاں کے مسلمانوں کو سبق سکھایا کہ تم چاہے ممبر پارلیمنٹ ہو، جسٹس ہو، انسپکٹر جنرل آف پولیس ہو، فوجی ہو یا صحافی ہو۔ اگر مسلمان ہو تو محفوظ نہیں رہ سکتے۔

۔ ایک کل مذہبی وفد احمد آباد گیا تھا۔ نورنگ پورہ کے ایک ٹرسٹ کی عمارت سے اسے ہٹنا پڑا کیوں کہ مار دیے جانے کی دھمکیاں آرہی تھیں۔ نمائندہ وفد گاندھی کے سابرمتی آشرم میں بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی اس کی حفاظت کے لیے پولیس لگانی پڑی۔

۔ گاندھی کے اس آشرم میں آپ کے سنگھ فرقے کے لوگوں نے میڈھا پاٹکر کے بال کھینچنے کی کوشش کی۔ میڈیا والے اسے فلمانے لگے تو جو پولیس میڈھا پاٹکر کو نہیں بچا سکتی تھی، اس نے میڈیا والوں کے سر پھوڑ دیے۔

کیا وہ آشرم گاندھی کے گجرات میں ہے؟...... اٹل جی!

اسلام کے دو روپ تو آپ نے بتا دیے، دھرم کے دو روپ کیوں نہیں بتائے۔

آپ کو وہ دکھائی نہیں دیتا۔

کیوں کہ...... سویم سیوک کو اپنا بھیانک روپ کہاں نظر آتا ہے؟

اٹل جی! آپ کا ہندو تو وہ قطعی نہیں جسے تلسی داس نے "پر ہت سرس دھرم نہیں مائی" کہا ہے! براہ کرم ہمارے اس دھرم کو ہندوتو کی ڈھال نہ بنائیے۔ ۔ پربھاش جوشی

رات کی روداد کا اختتامیہ

(ایک صفحہ اٹل بہاری باجپائی، لال کرشن اڈوانی اور مرلی منوہر جوشی کے لیے)

۔ "جھوٹ کا کلچر" (مصنفہ دُبراو کا اگریشک) کے ابتدائیے سے۔

لوگ ہمیشہ نعرہ تو یہی لگاتے ہیں کہ وہ ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، دراصل یہ درست نہیں۔ مستقبل تو ہم سے بے نیاز ایک خلا ہے جس سے کسی کو دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ زندہ تو ماضی ہے، جان جان کر ہمیں غصہ دلاتا ہوا، چٹکیاں لیتا ہوا، ہمیں اکساتا ہوا کہ ہم اسے نیست و نابود کر ڈالیں یا از سر نو مرتب کریں۔ لوگ مستقبل کے مالک بننا ہی اس لیے چاہتے ہیں تاکہ ماضی کو بدل سکیں۔ لوگ ان تجربہ گاہوں میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے بر سر پیکار ہیں جہاں تصویروں کے خد و خال تبدیل کیے جاتے ہیں اور سوانح عمریوں کو اور تاریخ کو پھر سے لکھا جاتا ہے۔

۔ میلان کنڈیرا (ترجمہ: فہمیدہ ریاض) آج، کراچی، خزاں ۱۹۹۴ء

○○

ترجمہ و تلخیص: انیس امروہوی

معصوم بچوں کی نیندیں

بدلہ ضرور، لیکن زیادہ تر بچے اس واقعہ کو بھولنا چاہتے ہیں جو راتوں کو انہیں ڈراتا ہے۔

جب رات ہوتی ہے تو خوف احمد آباد کے ریلیف کیمپوں کو گھیر لیتا ہے، گجرات فساد سے متاثر بچے خوفناک خواب سے دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ رات کے اندھیرے سے صبح کے اجالے تک وہ اپنی ماؤں سے لپٹ جاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ انہیں نیند نہ آئے، وہ جاگتے رہیں۔ دن کے وقت وہ اپنی اس خوف و دہشت سے بھری یادوں کو اپنے سے دور بھگانے کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں، رات میں وہ انہیں اپنی چپیٹ میں لے لیتی ہیں۔

فساد سے متاثر بچوں کے لیے یادداشت اور خوف کے مناظر کے درمیان ایک ہلکی سی مصروفیت کھیل کود کی چادر پڑی رہتی ہے۔ پھر انہیں وہ سارے مناظر یاد پڑ جاتے ہیں جب ان کے والدین کو ان کے گھروں سے نکال کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے کاٹ دیا جاتا ہے، وہ بہنیں اور بھائی جنہیں آگ میں جلا دیا گیا، ان کی یاد میں عورتوں کی بے رحمی سے عصمت دری، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچوں کو نیزے پر اٹھا کر آگ میں جھونکنے، اور خود موت سے بھاگ کھڑے ادھر ادھر چھپنے کی ان کی لرزہ خیز کوششیں شامل ہیں۔

گجرات کے ریلیف کیمپوں میں پناہ گزیں ایک لاکھ لوگوں میں تقریباً ۴۲ ہزار بچے ہیں۔ گجرات کے فساد سے متاثرین لوگوں کی راحت رسانی میں لگے NGO کا کہنا ہے کہ صرف احمد آباد کے کیمپوں میں ایسے تیس ہزار سے زائد بچے ہیں۔ ان میں زیادہ تر یتیم ہو چکے ہیں۔ اس نسل کشی سے بچے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ بڑوں کی طرح سے وہ برداشت نہ کر پائیں کہ جو کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ ان پر اتنا گہرا اثر پڑ چکا ہے کہ وہ اسے اپنی یادوں سے کبھی کھرچ نہیں سکتے۔ یہ خیال فادر وکٹر موزیز کا ہے جو ۳۰ NGO کے گروپ Citizen's Initatiatve کے ساتھ فساد زدہ لوگوں میں Co-ordinat کر رہے ہیں۔

وہ صحیح کہتے ہیں کہ پہلے بھیڑ اکٹھا ہوئی، لوٹ مار کرتی ہوئی، قتل کرتی ہوئی، بوٹی بوٹی کاٹتے ہوئے اور پھر عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کرتے ہوئے ان بچوں کی آنکھوں کے سامنے، پھر ان کے گھروں کو جلایا گیا، اچانک خاندان کے دوست ان کے اپنے دوست اور ان کے اسکول سبھی ان کے دشمن بن گئے۔ مشہور ماہر نفسیات National Institute of Mantal Helth and Neurosciences بنگلور کے ڈاکٹر آر سرینواس مورتی نے ان بچوں کو شاک کی حالت میں پایا۔ ان بچوں کی نفسیاتی کیفیت جو گجرات کے فساد سے نکل بھاگے ٹھیک اسی طرح کی ہے جیسے بھوپال گیس ٹریجڈی یا اتر کاشی کے زلزلوں یا بھج کے زلزلوں کے بعد ہوئی۔ اس لیے وہ نروس بریک ڈاون، گہری ناکامی، اداسی اور تشنج کے ہمیشہ شکار رہیں گے۔

شاید اس سے بھی زیادہ بدتر حالت ہو جب احمد آباد کے ایک NGO سینٹر فار ڈیولپمنٹ نے ان بچوں کے لیے آرٹ کلاس لگا کر انہیں مشغول کرنا چاہا تو انہوں نے جھلسے ہوئے مکانوں اور مرے ہوئے لوگوں کی ڈرائنگ بنائیں۔ ان بچوں میں غصہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اسی سینٹر کی میرامہتہ کا کہنا ہے کہ آپ بہت سے چھوٹے مگر خاموش بچوں کو ان کیمپوں میں کھیلتے ہوئے دیکھیں گے۔ ان کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتا ہے لیکن اندر ہی اندر ان میں یہ اثرات سرایت کر گئے ہیں۔ اسے پتہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ ایک تین سال کا بچہ کھیلتے کھیلتے اچانک چیخ پڑتا ہے۔ "ابا کو مار دیا...... گولی! گولی!"

انہیں اس وقت سمجھانا، مشورہ دینا بے کار ہو تا جب تک وہاں یہ خطرناک نسل کشی چلتی ہے۔ "بچوں میں اس قدر خوف وہراس اور غصہ بھرا ہوا ہے اور ہم ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اب امن قائم ہو گیا۔" یہ سندھیا سریندر داس کا کہنا ہے جو ایک NGO Suchetna کے Child Survival Project سے منسلک ہیں۔

اس وقت تو یہ اس معاملے میں خوش قسمت ہیں کہ وہ زندہ بچ گئے، جبکہ بہت سے بچوں کو قتل کیا گیا ہے، یہاں بچپنے اور معصومیت کے خوفناک خاتمے کی چند شہادتیں پیش کی جا رہی ہیں۔

جاوید حسین ...... عمر ۱۴ سال

ایک رکشہ چلانے والے باپ اور سلائی کرنے والی ماں کے بیٹے جاوید نے اپنے خاندان کو کھو دیا، احمد آباد کے نرودا پاٹیا قتل عام میں جہاں ۲۸ ر فروری کو ۹۱ لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ چوتھی جماعت کی پڑھائی چھوڑ کر یہ بچہ زندگی گزارنے کے لیے رومال سلا کرتا تھا۔

موجودہ گھر، شاہ عالم ریلیف کیمپ، احمد آباد

"ہم لوگ ساڑھے نو بجے ابھی اپنی چائے پی ہی رہے تھے جب ہمیں گھر کے باہر بھیڑ کی آواز سنائی دی۔ وہ پتھر پھینک رہے تھے، تلواریں لہرا رہے تھے، ان کے ہاتھوں میں دھاریا اور خنجر بھی تھے اور جے شری رام کا نعرہ لگا رہے تھے۔ انہوں نے چلا کر کہا وہ سارے مسلمانوں کو مار ڈالیں گے، ہم نے بھاگنا چاہا لیکن انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ انہوں نے گھروں میں آگ لگائی اور لوگوں کو اٹھا اٹھا کر شعلوں میں پھینکنا شروع کیا۔ میں اپنی چچازاد حاملہ بہن قصور ابی بی کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُنہیں ایک دو دن میں بچہ ہونے والا تھا، انہوں نے اسے زور سے کھینچا، اس کا پیٹ پھاڑ کر چاک کیا اور بچے کو نکال کر آگ میں پھینک دیا۔ پھر انہوں نے میرے گھر والوں کو آگ میں پھینک دیا۔ ایک ایک کر کے میرے باپ، ماں اور میری ۱۷ سالہ بہن صوفیہ کو اور میرے چچا کے خاندان کو بھی آگ میں جلا دیا گیا۔

کسی نے مجھے راڈ سے مارا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا، رات ہو چکی تھی۔ میرے چاروں طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں، میری پتلون جل چکی تھی، میں اٹھ کر اپنے گھر آیا کہ کپڑے پہن سکوں، پھر میں ۱۰ کلو میٹر دوڑتا ہوا اپنے مالک کے گھر گیا۔ پورے راستے مجھے یہ خوف لگا رہا کہ ادھر سے کوئی کود کر مجھے مار ڈالے گا۔ وہ مجھے اسپتال لے گیا اور وہاں سے مجھے کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔

مجھے محسوس ہوتا ہے میرا دماغ ختم ہو گیا ہے، میں چند منٹ سے زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ میں رات میں سو نہیں پاتا، مجھے ہر وقت یہی منظر یاد پڑتا ہے، میں ہر وقت اپنی ماں کو یاد کرتا ہوں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ اس کی خوشیاں مجھ سے وابستہ ہیں، میں ہی ان کا سہارا ہوں۔ جن لوگوں نے یہ سب کچھ کیا میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں، میرے گھر والوں نے آپ لوگوں کا کیا بگاڑا تھا؟ میں نہیں سمجھتا کہ سارے ہندو اتنے ہی برے ہوتے ہیں۔ کالونی میں میرے چار پانچ ہندو دوست تھے اور مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسا کرنے میں وہ بھی شامل تھے۔ یہ باہر کے لوگ تھے جنہوں نے یہ سب کیا۔

اس کیمپ کو چھوڑنے کے خیال سے میں لرز جاتا ہوں لیکن پھر مجھے خیال آتا ہے کہ اب میرے پاس زندہ رہنے کے لیے بچا ہی کیا ہے۔ جب باجپئی جی یہاں آئے تھے، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اس قتل عام کو روکنے کے لیے کیا کیا؟ اس کا کیا حل نکلے گا؟"

محمد ہاشم ...... عمر ۸ر سال

نورودا کے جوان نگر آگ زنی سے بچ جانے والا ایک بچہ جس میں اس کی ماں اور اس کے چھ بچوں کو زندہ جلادیا گیا۔ وہ بیس فی صد جلنے کے بعد پانی کے ایک ٹینک میں کود کر اپنی جان بچاسکا۔

موجودہ گھر: سورت میں اپنی بہن کے گھر

"میرے والد چھت پر چڑھ کر دیکھ رہے تھے، انہوں نے چیخ کر کہا کہ ایک بھیڑ ہماری طرف آرہی ہے۔ پھر وہ بھیڑ ہمارے گھر کے پاس آگئی۔ وہ چلا رہے تھے، انہیں ماردو، ان کے ٹکڑے ٹکڑے کردو۔ ان کے ساتھ پولیس بھی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور وہ آگ کی مشعل لیے ہوئے تھے۔

ہم نے اپنے دوست کے گھر گنگوتری نگر بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے سوچا اب ہم بچ گئے ہیں۔ وہ سب ہندو لوگ تھے اور ہم ان کے گھروں میں ٹی وی دیکھا کرتے تھے۔ میں ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا لیکن جب ہم وہاں پہنچے ہم نے دیکھا وہ بھی بھیڑ میں شامل تھے۔ میں نے بھیڑ میں کیشو بھائی، بھوانی سنگھ اور گڈو چاچا کو دیکھا۔ میرے گھر والے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے لیکن میرا ہاتھ چھوٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے میری ماں کو کھینچا اور انہیں آگ میں پھینک دیا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ ہر شخص چیخ رہا تھا۔ پھر انہوں نے مجھے بھی آگ لگائی، میں بھاگا اور پانی کے ٹینک میں کود گیا۔ اس ٹینک میں تین اور بچے تھے، ببلو اور اس کی بہن اور محبوب۔

جب بھیڑ وہاں سے چلی گئی، ہم پاس کے گھر میں چھپ گئے۔ میں نے سنا کہ کسی نے دروازہ باہر سے بند کیا اور پھر انہوں نے گھر میں آگ لگادی۔ میری آنکھوں کے سامنے موت ناچنے لگی۔ شاید ہم لوگ بھی جل کر مر جائیں گے۔ میں نے سنا کے باہر میرا باپ میرا نام لے کر پکار رہے تھے۔ میں چیخا، انہوں نے باہر سے دروازہ کھولا اور ہمیں باہر نکالا۔

میں سو نہیں سکتا، جب نیند آتی ہے میں چیختا ہوا اٹھ بیٹھتا ہوں۔ مجھ سے کچھ کھایا نہیں جاتا۔ مجھے اپنی ماں، میرے بھائی اور بہن یاد آتے ہیں۔ اگر کیشو بھائی اور گڈو چاچا یہاں آجائیں تو مجھے دیکھ لیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ مجھے ختم کرنے کے لیے میری تلاش میں لگے ہیں۔ جہاں زیادہ لوگ جمع ہوتے ہیں، میں انہیں دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔

میں بڑا ہو کر انہیں تلاش کرنا چاہتا ہوں، میں بھی ان کے گھروں کو اسی طرح جلانا چاہتا ہوں جیسے انہوں نے میرے گھر کو جلایا۔ میں بھی تلوار سے انہیں کاٹنا چاہتا ہوں جس طرح

انہوں نے میرے گھر والوں کو کاٹا، میں خوب مضبوط اور طاقتور بننا چاہتا ہوں اور ان سے بدلہ لینا چاہتا ہوں، اب میں ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ ان کے ساتھ میں محفوظ نہیں رہوں گا۔"

ریشما بانو عمر......۱۱ر سال

جس دن گجرات بند تھا اسی رات احمد آباد کے پیلیج گاؤں میں اس کے گھر پر بھیڑ نے حملہ کیا۔ اس نے اپنی ایک پڑوس کی دل دہلا دینے والی عصمت دری کا واقعہ دیکھا۔

موجودہ گھر......شاہ عالم ریلیف کیمپ

"حملہ والی رات سے پہلے والی رات پولیس آئی اور اس نے ہمارے گاؤں کے زیادہ تر مردوں کو گرفتار کر لیا، گاؤں میں صرف عورتیں اور بچے رہ گئے۔ صبح نو بجے کے قریب ۲۰۰۰ لوگوں کی بھیڑ جو سفید نیکر اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھے اور گیروے رنگ کا بندھن پیشانیوں پر باندھے ہوئے تھے، ٹرکوں میں بھر کر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں تلوار اور کھلے ہوئے چاقو تھے اور وہ چلا رہے تھے۔ میاں لوگ کو کاٹو۔ انہوں نے ہمارے گھر کے پاس کی مسجد میں آگ لگا دی۔ میں نے وہاں پولیس کو دیکھا لیکن وہ خاموش کھڑے تھے۔ انہوں نے گاؤں کو گھیر لیا تھا۔ ہم ایک دیوار پھاند کر کانٹوں سے بھرے میدان میں بھاگ گئے۔

میں دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی، جب میں نے دیکھا کہ تقریباً دس آدمی میری ۱۶ سالہ پڑوسن کو زبردستی پکڑ رہے تھے۔ وہ چلا رہی تھی، مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ۔ انہوں نے اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ ایک کے بعد ایک عصمت دری کرتے رہے، ہم خوف سے لرز گئے۔ ہم انہیں روکنے یا بچانے نہیں جا سکے۔ جب وہ اس سے فارغ ہوئے، وہ اس وقت بھی زندہ تھی۔ پھر انہوں نے اس کے پیٹ میں چھرا بھونک کر پاس کے ایک گڈھے میں پھینک دیا۔

شام کو جب ہم نے واپس جانا چاہا تو ایک آدمی آیا اور میری بہن فردوسی کو پکڑ لیا، میری ماں اور چچی نے مل کر اسے کسی صورت سے بچایا اور ہم پھر اس میدان میں دوڑ گئے۔ ہم وہاں ساری رات رہے، پھر دوسرے دن چل کر ہم اپنے چچا کے مکان رحیم نگر میں پہنچے۔ وہ ہمیں یہاں پولیس کی حفاظت میں لائے۔

میں اب بھی ڈری رہتی ہوں کہ بھیڑ پھر یہاں آئے گی اور اسی طرح سے حملہ کر دے گی جیسے ہمارے پڑوس میں کیا تھا۔ حملہ ابھی رکا نہیں ہے۔ میں سب سے الگ تھلگ رہتی ہوں۔ کیمپ میں بھی بات کرتے ہوئے ڈرتی ہوں کہ کہیں وہ بھی بھیس بدل کر قاتل نہ

ہوں۔ اگر انہوں نے یہاں کیمپ میں گھس کر ہمیں تلاش کر لیا؟ سبھی ہندو برے نہیں ہیں۔ میں جانتی ہوں ہمارے پڑوسیوں نے ایسا نہیں کیا تھا، یہ باہر کے لوگ تھے لیکن پولیس نے ہماری مدد نہیں کی۔ بڑی ہو کر میں پولیس بننا چاہتی ہوں تاکہ میں لوگوں کی مدد کر سکوں۔"

یاسمین سکندر خان...... عمر ۱۲ر سال

ساتویں درجہ کی اس طالب علم کی ماں اور بڑے بھائی چمن پورا علاقے کے گلبرگہ سوسائٹی کی آگ زنی میں، جس میں چالیس آدمیوں بشمول کانگریس کے سابق ایم پی احسان جعفری کو زندہ جلادیا گیا تھا، جلا کر خاک کر دیئے گئے تھے۔

موجودہ رہائش: دریاخان گنبد ریلیف کیمپ، احمد آباد

"ہم گلبرگہ سوسائٹی کی دوسری منزل پر احسان جعفری کے مکان کے دائیں طرف رہا کرتے تھے۔ ۲۸ر فروری کو ناشتہ کے بعد ہم نے بھیڑ کی آواز سنی، وہ ہماری عمارت پر پتھر پھینک رہے تھے۔ میری ماں نے کہا کہ ہمیں مکان کے اندر رہنا چاہیے، اس لیے میرے والد اور چھ اور لوگوں نے مکان کو اندر سے بند کر لیا۔ پھر آگ لگنا شروع ہو گئی، مکان کی چھت اور دیواریں گرم ہونے لگیں، پھر ہم سب جعفری صاحب کے مکان میں دوڑ گئے، تاکہ ہم وہاں محفوظ رہ سکیں۔ وہاں سو آدمی تھے، ہم سب ڈر سے چیخ رہے تھے۔

پھر ایک بھیڑ مکان میں داخل ہوئی۔ انہوں نے میرے بھائی سلیم کو پکڑ لیا۔ انہوں نے اس کے سر پر تلوار ماری، وہ چلایا۔ "پاپا" اور زمین پر گر گیا۔ پھر انہوں نے اس کمرے میں آگ لگا دی۔ کسی طرح میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ دوڑ کر مکان کی چھت پر چڑھ گئے۔ میری ماں پیچھے چھوٹ گئی، پھر ہم سب بچھڑتے ہوئے چچی کے مکان میں پہنچے اور ان کے غسل خانہ میں چھپ گئے۔ ۵۔۶ گھنٹے کے بعد جب سب کچھ ختم ہو گیا تو پولیس نے ہمیں وہاں سے نکالا۔ یہی پولیس تھی جس نے بھیڑ کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ پھر ہم لاشوں پر لوٹتے ہوئے باہر نکلے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میری ماں مجھے پکار رہی ہے، وہ مجھے بہت زیادہ چاہتی تھی۔ میں اب بھی کبھی کبھی اس جلی ہوئی عمارت کو دیکھتی ہوں۔ میری ماں وہاں جل چکی ہے۔ انہوں نے دوسروں کی طرح میری ماں کو بھی جلا دیا۔ اکثر رات میں سوتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں اور اس سب کے بعد میں اب کسی کے ساتھ کبھی نہیں رہ سکتی۔ جہاں ہمیں سکون سے نہیں رہنے دیتے۔ انہوں نے اس کیمپ پر بھی کئی بار حملہ کیا، تقریباً ہر روز باہر کوئی بم پھٹتا ہے۔ پولیس کیمپ پر گولی چلاتی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان میں مسلمان رہیں۔"

شیر خاں...... عمر ۱۳ ر سال

ایک درزی کا لڑکا، جو پلاسٹک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ وہ اور اس کے خاندان کے چار آدمی پولیس والوں سے آنکھیں بچا کر باہر نکلے جو اکبر نگر میں بھیڑ کی مدد کر رہی تھی۔ اس کے بہترین دوست کو پولیس نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ خود بڑی مشکل سے بھاگ کر نکل سکا، جبکہ پولیس اسے پکڑ کر آگ میں پھینک رہی تھی۔

"بھیڑ، پولیس کے افراد، بندوق، تلوار اور چاقو لیے آئی اور سب جے سیہ رام کا نعرہ لگا رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر گیروا پٹی بندھی تھی...... میں نے پاس ہی کے پولیس اسٹیشن کے انسپکٹر کو دیکھا۔ ہم اس کی طرف بھاگے، جب پولیس نے ہمارے اوپر گولی چلانی شروع کی۔ میں اپنے گھر والوں سے بچھڑ گیا اور اپنے دوست صغیر خاں کے ساتھ دوڑنے لگا۔ جب پولیس کی ایک گولی اس کے لگی، وہ نیچے گر پڑا۔ پولیس نے اسے اٹھا کر اس آگ میں پھینک دیا جو بھیڑ نے وہاں سلگائی تھی۔ تین پولیس والوں نے مجھے پکڑ لیا، میں نے سمجھا کہ میرا آخری وقت ہے اور میں بھی مرنے جا رہا ہوں۔ وہ تین تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی لاٹھی مجھے مارنی چاہی جو غلطی سے دوسرے پولیس والے کے لگ گئی اور میں اس سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلا۔ وہ لگاتار مجھ پر گولی چلاتے رہے اور میں سڑک پر آ گیا اور ایک ٹرک کے پیچھے چھپ گیا اور ایک دیوار پر چڑھ کر امن چوک پر پہنچ گیا، جہاں اس وقت خاموشی تھی۔ اگر پولیس نے ہمیں بچایا ہوتا تو حالات اتنے خراب نہیں ہوتے۔ جب بھی میں کسی پولیس والے کو دیکھتا ہوں تو دوڑنا شروع کر دیتا ہوں، وہ اس فساد کو روکنا نہیں چاہتے۔ ہندو کہتے ہیں کہ میاں بھائی کو ہندوستان میں نہیں رہنے دیں گے۔ اور یہ کہ ہم سب پاکستان چلے جائیں۔ لیکن ہم یہیں رہیں گے، ہم کہاں جا سکتے ہیں، ہم کیا کریں گے، میں تو بدلہ بھی نہیں لینا چاہتا۔ بس چاہتا ہوں کہ مجھے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جو کچھ بھی ہوا ہے اسے یاد نہ کیا جائے، لیکن جب یاد آ جاتا ہے تو میں چیخنے لگتا ہوں۔"

محمد آصف...... عمر ۱۴ ر سال

نویں کلاس کا طالب علم جو مہاکالی ندی کے پاس مہادیونی چال میں اپنے خاندان کے چھ لوگوں کے ساتھ تھا۔ اس کا خاندان تو بچ گیا، اس کا مکان جل گیا۔ اس کی موجودہ رہائش دریا خان گنبد ریلیف کیمپ۔

"میں تقریباً ۲ ر بجے دن میں کوسادیہ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا، جب مجھ پر حملہ کیا گیا۔

بھیڑ نے پہلے تو پٹرول بم پھینکا۔ وہ ہمارے پڑوس میں مہاکالی مندر میں چھپے ہوئے تھے۔ بجائے ان کو روکنے کے پولیس نے ہماری طرف گولی چلانی شروع کی۔ بھیڑ نے مسجد میں پٹرول سے آگ لگادی، میں اپنے گھر کی طرف دوڑا مگر وہ اُسے پہلے ہی لوٹ کر جلا چکے تھے۔

میں سوچتا ہوں اس حملے کے پیچھے بھرت باروت وزیر کا ہاتھ تھا۔ ہم نے اُسے ہر رات یہاں میٹنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہندوؤں کو پٹرول اور ہتھیار بانٹ رہا تھا۔ یہ کیمپ بھی محفوظ نہیں ہے۔ وہ اب بھی یہاں آکر حملہ کرتے ہیں اور پولیس اندر آنسوؤں کے گولے پھینکتی ہے۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم نے حملہ کیا تھا۔ ابھی کل ایک عورت کیمپ کے پاس ایک بم پھٹنے سے مر گئی۔ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں لیکن جا نہیں سکتا۔"

شاہد خاں ...... عمر ۱۴ رسال

چھٹی کلاس کا طالب علم جو گلبرگہ سوسائٹی میں رہتا تھا اور اس نے کانگریس کے سابق ایم پی احسان جعفری کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔

موجودہ رہائش: دریاخاں ریلیف کیمپ، احمد آباد۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا، جب پولیس آئی۔ انہوں نے ہندو لڑکوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے گھر جائیں۔ انہوں نے ان کو دھمکایا کہ کچھ ہونے جارہا ہے۔ تقریباً ۹ ربجے پندرہ سے بیس ہزار لوگوں کی بھیڑ وہاں پہنچی اور انہوں نے ہماری عمارت کو گھیر لیا۔ پھر انہوں نے پتھر اور پیڑول کے بم پھینکنا شروع کئے اور جیسے ہی وہاں آگ لگائی گئی سب ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ میں عمارت کی چھت پر چڑھ گیا اور وہاں چھپ گیا۔ احسان جعفری بہت مشہور آدمی تھے اور ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ ہم اس کے یہاں حفاظت سے رہیں گے۔ بہت سے لوگ ان کے گھر میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ میں اوپر چھت کی ایک کھڑکی سے جھانک رہا تھا جب میں نے انہیں گراؤنڈ فلور میں دیکھا۔ وہ بھیڑ سے کہہ رہے تھے تم ہمیں ماردو لیکن باقی لوگوں کو جانے دو۔ پھر بھیڑ نے ان سے کہا کہ وہ جے سیارام کا نعرہ لگائیں۔ لیکن وہ خاموش رہے۔ پھر بھیڑ نے ایک جلتا ہوا ٹائر ان کی گردن میں ڈال دیا اور ان کے پیٹ پر تلوار رکھی۔ میں نے اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ اس کے آگے میں کچھ نہیں دیکھ سکا۔ میری آنکھوں کے سامنے رات بھر یہی خوف ناک منظر رہا، میں سو نہیں پایا۔ میں سوچتا ہوں کہ سو رہا ہوں لیکن چیختا ہوا اٹھ بیٹھتا ہوں۔ مجھے ہندوؤں سے نفرت ہے۔ انہوں نے ہمارا سارا گھر لوٹ لیا۔ میں نے بھی اپنے پڑوسیوں کو دیکھا اور اب میں بھی ان سب کو قتل کرنا چاہتا ہوں اگر کرسکا۔ میں وہاں واپس جانا چاہتا ہوں، تاکہ انہیں مار سکوں۔"

عمران خان ...... عمر ۱۱ر سال

احمد آباد کے گومتی پور کے علاقے میں مریم بی بی کی چال میں رہنے والا یہ پانچویں درجہ کا طالب علم ۲۰ر مارچ کو ریپڈ ایکشن فورس اور پولیس کے ذریعہ چلائی گولی سے زخمی ہوا تھا۔ جبکہ ان کے علاقے میں ہندوؤں نے حملہ کیا تھا۔

موجودہ رہائش: شاہ عالم ریلیف کیمپ، احمد آباد

"میں کھانا کھا رہا تھا جب ہم پر حملہ کیا گیا۔ وہاں ایک بھاری بھیڑ تلواروں اور چاقوؤں اور پتھروں کے ساتھ جمع تھی۔ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بھاگا اور اشرف پہلوان کے گھر پہنچا، جہاں ہم سوچ رہے تھے کہ ہم محفوظ رہیں گے لیکن نیلی وردی پہنے ہوئے آر اے ایف کے جوان بندوقوں اور لاٹھیوں کے ساتھ اندر گھس گئے۔ انہوں نے میرے باپ کو پکڑ لیا اور مارنا پیٹنا شروع کیا۔ انہوں نے میری ماں کو بھی پیٹنا شروع کر دیا۔ انہوں نے میرے پیر پر بھی لاٹھی ماری۔ میں نے ان سے کہا کہ ہمیں کیوں مار رہے ہیں؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا؟ نیلی وردی والوں نے میرے سینے سے بندوق لگا دی اور مجھ سے چپ رہنے کو کہا۔ میں نے سوچا کہ اب میں مر رہا ہوں، اس وقت ملٹری آگئی اور وہ رک گئے۔ رات کے وقت ہم کسی صورت سے اس کیمپ میں پہنچے۔ میرے علاقے میں میرے بہت سے ہندو دوست ہیں، میں ان کے ساتھ کرکٹ اور باسکٹ بال کھیلا کرتا تھا، لیکن اچانک انہوں نے کہنا شروع کیا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ نہیں کھیلیں گے۔ اب وہ میرے دوست نہیں ہیں۔ میں وہاں واپس جانا نہیں چاہتا۔" ○○

(بشکریہ: آؤٹ لک: ۱۳ر مئی ۲۰۰۲ء)

سیّد محمد مهدی

خصوصی مطالعہ

ایک شاعر جسے گجرات سے عشق تھا

جب سانحہ اتنا بڑا، اتنا سنگین اوراتنا ہولناک ہو جیسا گجرات میں پیش آیا اور جسے ساری دنیا نے دیکھا،تو ایسے میں کسی چھوٹے یامعمولی سانحے کا ذکر کرنا نامناسب اور بے جا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں یہاں جس "چھوٹے" اور "معمولی" واقعہ کا ذکر کرنے جارہا ہوں وہ شاید گجرات کے موجودہ حالات اور فضا میں "معمولی" نظر آئے، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ایسے "معمولی" اور نسبتاً "چھوٹے" واقعات کی پرتیں الٹ کر دیکھا جائے تو ممکن ہے اس ذہنی ساخت کا کچھ اندازہ ہوسکے، موجودہ حالات جس کی پیداوار ہیں۔

ابھی ہندوستان میں ایسے لوگ باقی ہوں گے جنہیں ہٹلر کے پراپیگنڈا وزیر گوئے بلز کا رسوائے زمانہ جملہ یاد ہوگا۔ "جب کوئی شخص کلچر کی بات کرتا ہے تو میرا ہاتھ پستول کی طرف جاتا ہے۔" احمد آباد سے خبر آچکی ہے کہ ۱۷ویں صدی کے شاعر ولی کی قبر کھود ڈالی گئی۔ چیف منسٹر مودی کے ہم پیشہ اور ہم جماعت لوگ آئے، قبر کھودی، قبر کے اوپر بنی ہوئی عمارت مسمار کی اور وہاں بھگوا جھنڈا گاڑ کر غالباً لیڈر کو اطلاع دینے چلے گئے کہ کام پورا ہو گیا۔ اب کام کا معاضہ دلاؤ۔ پھر سرکار آئی اور اس نے قبر کی جگہ تار کول ڈلوا دیا تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع ہی نہ ملے کہ یہاں کبھی کوئی قبر بھی تھی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ قبر کا نشان مٹانے کے بعد کارسیوک کتب خانوں میں پہونچتے اور ولی کے دیوان کی جتنی کاپیاں ملتیں، انہیں قبر پر لا کر جلا دیتے۔ ہٹلر نے سب سے پہلا کام کتابیں جلانے ہی کا کیا تھا لیکن یا تو کارسیوک پڑھنے لکھنے سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے یا ابھی انہوں نے اس کام کو کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھا ہے۔

ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اورنگ آباد میں

پیدا ہوئے لیکن زیادہ تر لوگ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ وہ احمد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۷۲۰ء کے قریب ان کا انتقال ہوا، اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ ولی ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خود بھی صوفیوں کے نقشبندی سلسلے سے وابستہ تھے۔ انہوں نے کبھی کسی بادشاہ یا امیرزادے کی شان میں قصیدہ نہیں لکھا۔ ساری عمر اپنی شاعری کے ذریعہ محبت، اخوت اور رواداری کا پیغام دیتے رہے اور یہی ان کا قصور تھا۔

گجرات پر برہمنی شکنجہ ہمیشہ سے مضبوط رہا ہے۔ جس وقت ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ذات پات کے بندھنوں اور ظلم کے خلاف بھکتی تحریک زور پکڑ رہی تھی اور بھکتی کے شاعر ایسے سماج کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں ذات کی بنیاد پر بھید بھاؤ نہ ہو، اس وقت گجرات میں اس تحریک کے قدم نہ جم سکے۔ اس خلا کو صوفیوں اور صوفی شاعروں نے پُر کیا اور لوگوں کو پریم کا سبق پڑھایا۔ ولی اور ان کے شاگرد اشرف گجراتی، عزلت سورتی، شاہ تراب وغیرہ ان دیواروں کو توڑ رہے تھے جن میں ذات پات کے بندھنوں نے لوگوں کو قید کر رکھا تھا۔ انہوں نے نہ صرف وطن سے محبت سکھائی بلکہ وطن کے تصور کو وسعت بھی دی۔ جب نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اشرف گجراتی نے دعا مانگی۔

یا الٰہی دفع کر اس ظالم بدبخت کوں
جس کی بے مہری و سختی سے فساد ہند ہے

عزلت سورتی نے ہندوستانی سنگیت کو جسے پروہتوں اور پنڈتوں نے عبادت گاہوں کے اندر بند کر رکھا تھا، عام لوگوں تک پہونچانے کی کوشش کی۔ اپنی طویل نظم "راگ مالا" میں انہوں نے ملاؤں کے برخلاف سنگیت کو عبادت کا درجہ دیا ہے۔

غرض فن موسیقی کا ہے عبادت
جو یادِ حق میں ہو اس کی سماعت

انہوں نے بارہ ماسہ بھی لکھا، کہہ مکرنیاں بھی لکھیں دوارتھیاں اور پہلیاں بھی۔ دوارتھیاں یعنی جس میں سوال دو ہوں لیکن ان کا جواب ایک ہو۔ مثلاً: پانی باسی کیوں ہے؟ من اداسی کیوں ہے؟ جواب ہے: پیا نہ تھا۔

شاہ تراب نے "من سمجھاون" اور "گیان سروپ" میں تصوف کے پیغام کو ہندو دھرم کے حوالے سے سمجھایا اور یگانگت کے جذبے کو فروغ دیا۔

لیکن آیئے ذکر کریں ولی گجراتی کا جن کی قبر مودی کے غول بیابانی نے کھود ڈالی۔ گجرات ولی کی جنم بھومی بھی تھی اور کرم بھومی بھی کہ یہاں بڑے بڑے صوفیوں کے مزار تھے۔

اسی لیے ولی کو گجرات سے گہرا عشق تھا۔ ان کی ایک نظم سورت شہر کی تعریف میں ہے۔ وہی سورت جو آج قتل و غارت گری اور آتش زنی کی خبروں کی وجہ سے اخباروں اور ٹی وی پر نظر آتا ہے۔ ولی کو سورت کی جو چیز بہت عزیز تھی وہ تھی شہر کے مختلف اہل مذہب کا باہمی تعلق اور یگانگت۔ نظم طویل ہے۔ صرف چند شعر دیکھیے

عجب شہراں میں ہے پر نور یک شہر	بلا شک وہ ہے جگ میں مقصد دہر
رہے مشہور اس کا نام سورت	کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر	ہوا دیتی ہے اس کی یادِ کشمیر
وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم	صبح اور شام جپ کرتا ہے عالم
اتی آتش پرستاں کی ہے بستی	سکھے نمرود واں آتش پرستی
وہاں ساکن اتے ہیں اہل مذہب	کہ گنتی میں نہ آویں اُن کے مشرب
اگرچہ سب ہیں وہ ابنائے آدم	ولے بینش میں رنگا رنگ عالم
شہر بھیتر جو آوے نہان کا دن	ہندو کی قوم کے اشنان کا دن
ہر اک جانب دیکھوں میں فوج در فوج	تجلّی کے سمندر کی اٹھے موج
نین کی بیٹھ تو کشتی میں اے پاک	یہ طے کر سیج میں موجِ خطرناک

ایک مرتبہ ولی غالباً دہلی گئے، لیکن دل گجرات میں لگا رہا۔ گجرات کے فراق میں بہت تڑپے اور اس فراق پر ایک نظم لکھی۔ اس کے چند شعر پڑھیے

گجرات کے فراق سے ہے خار خار دل	بیتاب ہے سینے منے آتش بہار دل
مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہان میں	شمشیر ہجر سے جو ہوا ہے فگار دل
ہجرت سے دوستاں کے ہوا جی مرا گداز	عشرت کے پیرہن کو کیا تار تار دل
لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سے	پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

معلوم نہیں ولی کو یہ کیسے خبر ہو گئی تھی کہ ایک دن ان کے خوبصورت گجرات میں ایک دیو حاکم بن بیٹھے گا۔ ان کی غزل کا ایک شعر اس طرح ہے۔

حاکم وقت ہے تجھ گھر میں رقیبِ بدخو
دیو مختار ہوا ملک سلیمان میں آ

ولی جس گنگا جمنی انسان دوست تہذیب کے رسیا تھے ہندتوا کے کارسیوکوں کو وہ پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی۔ تہذیب کے متعلق ہندتوا کا تصور کیا ہے۔ لال کرشن اڈوانی نے اس کے لیے

ایک اصطلاح ایجاد کی ہے۔ کلچرل نیشنل ازم۔ یہ اصطلاح اجتماع ضدین ہے۔ کلچر کی سرحدیں نہیں ہوتیں۔ نیشنل ازم سرحدوں کے اندر بند ہوتا ہے۔ پورا یورپ الگ الگ قوموں میں بٹا ہوا ہے لیکن ایک تہذیب، ایک کلچر کے رشتے میں منسلک ہے۔ ہندوستانی کلچر اور تہذیب کا اثر پورے جنوب مشرقی ایشیاء کے ملکوں میں موجود ہے۔ جو الگ الگ قومیں ہیں۔

لیکن آر ایس ایس کے غول بیابانی کو یہ سب بتانا بے معنی ہے۔ کبیر نے سچ کہا تھا۔

سیکھ وا ہی کو دیجئے جا کو سیکھ سوہائے
سیکھ نہ دیجئے باندرا گھر بئے کا جائے

کلچرل نیشنل ازم کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام "بیرونی" تہذیبی اثرات کو ختم کیا جائے جو ہندوستانی کلچر کا جزو ہیں اور اس "خالص" کلچر کو اپنایا جائے جو ایک زمانے میں ہمارا تھا۔ اب اسے ان کی بدقسمتی کہا جائے یا کم عقلی کہ کلچر کبھی "خالص" نہیں ہوتا۔ ہاں اس تلاش میں نفرت ضرور جنم لیتی ہے اور ولی کی قبر کی مسماری اسی نفرت اور تعصب کا اظہار ہے اور اس نفرت اور تعصب کے ذریعہ انہوں نے انسانیت کے اعلیٰ ترین نمونے، مریادا پرشوتم رام کی صورت بھی مسخ کرنے کی ناپاک کوشش کی۔ انہیں کے بارے میں تلسی داس نے کہا تھا ۔

رام رام سب کوی کہے ٹھگ ٹھاکر اور چور
بنا پریم ریجھے نہیں تلسی نند کشور

ہندتوا کے کارسیوکوں کا خیال ہے کہ آخری جنگ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوگی۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی ہے۔ ہندوستان میں آخری جنگ ان دو قوتوں کے درمیان ہوگی جس میں ایک طرف رام رام کہنے والے ٹھگ اور چور ہوں گے اور دوسری طرف وہ جو تلسی داس کے ہمنوا ہوں گے کہ بنا پریم ریجھے نہیں تلسی نند کشور......

تب ولی کا مزار پھر سے بنوایا جائے گا۔

○○

للیتا پانگر

ترجمہ: خورشیدہ پروین

بھگوا خواتین کا بہناپا

گجرات میں ہو رہے فسادات کو میڈیا نے خاطر خواہ کوریج نہیں دیا، اس کے برخلاف جب ایک بے رحم ریاستی حکومت نے کچھ مجرموں کے خلاف ایف آئی آر درج کیا اور کچھ پولیس والوں کو چارج شیٹ کیا، تب کچھ لوگوں نے سوچا کہ اب انصاف ملے گا۔ لیکن گرفتار کیے گئے پولیس کے ایک معاملے میں دو ہزار عورتوں کے ایک گروپ نے اس تھانہ کو گھیر لیا جہاں ان لوگوں کو گرفتار کر کے رکھا گیا تھا۔ وہ انہیں رہا کرنے کی مانگ کر رہی تھیں۔ پہلے تو حکومت نے آنا کانی کی، بعد میں ان پر لگائے گئے الزامات کو خارج کر دیا اور ان لوگوں کو چھوڑ دیا۔ ان فسادات میں پولیس کے کردار کو لیکر بہت ساری خوفناک باتیں سنی گئی ہیں۔ بے قصور مسلمانوں کی حفاظت کرنا تو دور بہت سے معاملوں میں ان پولیس والوں نے قاتل بھیڑ کو چوری چھپے ہی نہیں بلکہ کھل کر امداد فراہم کی۔ آخر یہ عورتیں ایک مجرم کو بچانے کے لیے سڑک پر کیوں آئیں؟ اس کا جواب خون سرد کر دینے والا ہے۔ ایک دہائی قبل ایودھیا تحریک کے دوران عورتوں کا جو کمیونلائزیشن شروع ہوا تھا، وہ آج سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، سماج میں بڑھ رہی حیوانیت کا یہ ایک نہایت خوفناک اظہار ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات میں عورتوں کی بڑھتی ہوئی شرکت گزشتہ برسوں میں کافی بڑھی ہے۔ اخبارات اور ٹی وی چینلوں نے عورتوں کی ایسی تصویریں دکھائی ہیں جن میں وہ کارسیوکوں کو یوں تلک لگا رہی ہیں جیسے انہیں دشمن کے خلاف جنگ پر روانہ کر رہی ہوں۔ میڈیا کے ذریعہ عورتوں کی ایسی تصویریں بھی منظر عام پر آئی ہیں جن میں وہ تلوار چلا رہی ہیں اور فسادات کو روکتی ہوئی پولیس پر پتھراؤ کر رہی ہیں۔ گجرات میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ سنگھ پریوار اور ان جیسی تنظیموں نے بڑے ہی نپے تلے طریقے سے عورتوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور اب وہ ان کے مقصد کے حصول کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔ سنگھ پریوار کا ان عورتوں کو استعمال کرنے کا طریقہ بہت

آسان ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "دوسروں" کی موجودگی ان کے اپنے ہندو پریوار کے لیے ایک خطرہ ہے اور یہ کہ اپنے پریوار کا محافظ ہونے کی وجہ سے یہ ان کا فرض ہے کہ وہ ان کی حفاظت کریں۔ اگر ضرورت پڑے تو وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے گھر سے باہر بھی نکلیں۔ ہمارے سماج میں مردوں کے نیچے دب کر رہنے کی وجہ سے جہاں ان کے خیالات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے، اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ تنظیمیں ان کے اندر ان کی اہمیت کا ایک جھوٹا احساس بھر رہی ہیں۔ اس معاملے میں طاقتور لوگ انہیں کہہ رہے ہیں کہ وہ ان کی تحریک کا حصہ بنیں، ان کے کندھے سے کندھا ملا کر لڑیں۔ یہ ایک ایسا احساس ہے جس میں ان کو چند منٹ کی شہرت کے لیے آسانی سے استعمال کیا جاسکتا ہے اور وہ اس کے لیے رضامند بھی ہو جاتی ہیں۔

کئی سال قبل آر ایس ایس کے شعبہ خواتین یعنی راشٹریہ سیویکا سنگھ کے اراکین کا انٹرویو کرتے وقت بہت سی تعلیم یافتہ خواتین نے بہت فخر سے یہ بتایا تھا کہ عورتوں کی پہلی ذمہ داری گھر سنبھالنے کی ہوتی ہے۔ گھروں سے باہر کام کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ عورتوں کا تعلق یارسم وراہ اپنے شوہروں کے علاوہ دوسرے مردوں کے ساتھ ہوتا ہے جو خاندان کے استحکام کے لیے مناسب نہیں۔ وہ اپنے آپ اس نتیجے پر کیسے پہنچیں، ان کے کلاسوں میں مردوں نے ان کو جو درس دیا تھا اس میں یہی سبق پڑھایا گیا تھا کہ گھر بنانے کی ذمہ داری میں ایک پاکیزگی اور طہارت شامل ہوتی ہے جو اس لمحے ختم ہو جاتی ہے جب کوئی عورت خاندان کے کام کے علاوہ کوئی اور کام کرنے کی خواہش ظاہر کرتی ہے۔

اس کے باوجود بھی عورتوں کو ان تنظیموں کے عہدوں پر کوئی خاص مرتبہ نہیں دیا جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ پروپیگنڈہ کے کام میں لگی رہیں۔ اسی لیے ایک زمانے میں سادھوی رتھمبرا اور اوما بھارتی، جو اُن کی بہترین مقررین ہیں، کو تشہیر کا کام سونپا گیا، اور اوما بھارتی تو ایک بار مرد کا بھیس بنا کر ۱۹۹۲ء میں ایودھیا کی متنازعہ جگہ پر پہنچیں اور شاید اسی وجہ سے انہیں تھوڑی سی شہرت بھی حاصل ہوئی، اور پریوار میں انہوں نے اپنے لیے جگہ بھی بنالی، لیکن ان کے لیے اس میں رہنا بہت آسان کام نہیں ہے۔ کئی بار انہوں نے اپنے خلاف چلائی جارہی تحریک سے بیزاری کا اظہار اس وقت کیا جب ان کی تنظیم نے ان کے لیے بنائے گئے دائرہ کار سے باہر جانے پر ان کے خلاف قدم اٹھایا۔

معاشی طور پر کمزور طبقے کی عورتیں اس معاملے میں زیادہ پیش پیش ہوتی ہیں کیوں کہ کسی شاکھا میں شامل ہونے کا مطلب انہیں اس صورت میں معاشی طاقت کا حاصل ہونا ہوتا

ہے۔ جب انہیں معاش کے حصول کے کام میں لگا دیا جاتا ہے۔ گجرات کے فسادات سے عورتوں کے سماجی مرتبوں کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو کٹر پنتھیوں اور فسادیوں کی زیادتیوں پر ایک لفظ بھی نہیں بولتیں بلکہ ان فسادیوں کے ساتھ اپنا بھرپور تعاون دیتی ہیں۔ عورتوں کی تنظیموں سے ملنے والی رپورٹوں کے مطابق اعلیٰ اور متوسط طبقہ کی عورتوں نے بھی مردوں کے ساتھ لوٹ پاٹ میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ کسی بھی ایک عورت نے کسی بھی طرح کی مذمت یا افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ جب کہ ان کی ہی ہم جنس مسلم عورتوں کو لوٹا اور جلایا جارہا تھا۔

اس سے یہ بھی مطلب نکلتا ہے کہ ہم اس غلط فہمی سے جلد باہر نکل آئیں کہ ان عورتوں کو روز مرہ کے گھریلو مسائل کے علاوہ مندر یا مسلمانوں کے مسائل سے کوئی مطلب نہیں ہوگا۔ اپنے مضمون ہماری عورتیں اور دیوی مائیں میں تنیکا سرکار ان عورتوں کا حوالہ دیتی ہیں جو ایودھیا میں ۱۹۹۱ء میں موجود تھیں۔ چند عورتوں کے تاثرات دیکھیں، علی گڑھ کی ایک کارسیویکا چندراوتی نے کہا:

"ہم یہاں خون بہانے آئے ہیں، مندر بنانے کا مطلب ملاؤں کو پھانسی دینا ہے۔"

غازی آباد کی ایک سنیاسن نے کہا:

"یہ ملک اتنا گہرا ہے جتنا سمندر اور اتنا ہی وسیع ہے جتنا آسمان اور اس میں ہندو ہی ابتداء بھی ہیں اور ہندو ہی انتہا بھی۔"

ہندوؤں کی نمائندگی کرنے والی کوئی دوسری تنظیم عورتوں کو فرقہ وارانہ رنگ میں بانٹنے میں اتنی چاق وچوبند نہیں ہے جتنی شیوسینا۔ اس نے اپنی عورتوں کو سڑکوں پر اس غرض سے اتارا کہ مرد لیڈروں کو حراست میں لیے جانے سے بچائیں، اور فساد میں مسلم علاقوں میں ان کو ملنے والی مدد کو روکیں بلکہ انہوں نے تو مردوں پر یہ طنز کرتے ہوئے کہ کیا ہم تمہیں چوڑیاں پہنادیں، انہیں اور زیادہ تشدد پر ابھارا۔

یہی عورتیں اس بات پر کبھی اعتراض نہیں کرتیں جب سینا کے مرد لیڈر عوامی سطح پر سنسنی خیز اعلانات کرتے ہیں۔ سینا نے بار بار اس بات کو واضح کردیا ہے کہ عورتوں کی طاقت کا استعمال انہیں اور زیادہ خود مختاری دینے کے لیے نہیں بلکہ اس آلہ کار کی شکل میں کیا جاتا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے کام میں مدد کرسکیں اور جب ان کے اپنے گھروں میں ہی ان عورتوں کے خلاف تشدد کا رویہ اپنایا جاتا ہے تو سینا ان سے کہتی ہے کہ وہ گھروں

میں مصالحت کرنا سیکھیں۔

فسادات کے بعد اکثر دیکھا گیا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اکثر ان فسادات میں عورتوں کی حصہ داری کو نظر انداز کر دیتے ہیں، خواہ انہوں نے فعال طریقے پر اتنا زیادہ حصہ نہ لیا ہو اور لیکن اپنے فسادی مردوں کی طرح انہوں نے مزید خون بہانے پر اکسایا ہو لیکن ایسی عورتوں کو کبھی بھی نہ ان کے جرم کے سبب حراست میں لیا جاتا ہے نہ سزائیں دی جاتی ہیں۔ سڑکوں پر اپنے اس بہادری بھرے کارنامے کے بعد وہ اپنے گھروں کی گمنام چہار دیواری میں محدود ہو جاتی ہیں اور ہندوستان میں تحریک نسواں اور وسعت نظر خواتین کی یہ سب سے بڑی ناکامی رہی ہے کہ انہوں نے خواتین کی فرقہ واریت پر کبھی کوئی توجہ نہیں کی اور نہ ہی انہیں اس خطرناک کھیل سے بچانے کے لیے کوئی آواز اٹھائی، جس سے انہیں کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچنے والا ہے۔ OO

(بشکریہ: ٹائمس آف انڈیا)

ماجد حسین

خصوصی مطالعہ

ترجمہ : سہیل احمد فاروقی

کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

امریکی کمیشن برائے عالمی مذہبی آزادی (یو ایس سی آئی آر ایف) کو گجرات کے تشدد سے متعلق دیئے گئے بیان کے مکمل متن کا انگریزی سے ترجمہ۔

میں ہندو مذہب کے لیے گہرے احترام کا جذبہ رکھتا ہوں۔ تاریخی اعتبار سے ہندو مذہب سب سے زیادہ روادار اور امن پسند مذہب رہا ہے۔ اس کے پیروکاروں نے جارحیت اور تشدد کا دامن کبھی نہیں تھاما۔ یہ ہندو مذہب ہی تھا جس نے دنیا کو سوامی وویکانند اور مہاتما گاندھی جیسے عالمی شہرت یافتہ رہنما دیئے۔

گجرات میں تشدد کا بازار ہندو ازم کی وجہ سے گرم نہیں ہوا بلکہ یہ نتیجہ تھا انتہا پسندی کا اور انتہا پسندی اپنے آپ میں ایک مذہب ہے۔ اس عقیدے کے حلقہ بگوش افراد میں ہندو، مسلم، عیسائی اور دیگر بہت سے لوگ شامل ہیں۔ لیکن گجرات ان سب پر سبقت لے جاتا ہے، جب انتہا پسندی کے عقیدے سے وابستہ عناصر حکومت کے دائرۂ اختیار میں داخل ہو جاتے ہیں، یا جب حکومت کی باگ ڈور انتہا پسندی کے عقیدت مندوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔

اپنے خسر سابق ممبر پارلیمنٹ احسان جعفری کے بہیمانہ قتل کے واقعے کے بعد ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران تمام دستیاب تفصیلات اور ذاتی مشاہدات کی روشنی میں میں اس ناگزیر نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حکومت گجرات نے گجرات میں مسلمانوں پر ظلم و تشدد کرنے والے عناصر کو نہ صرف کھلی چھوٹ دی بلکہ ان کی نسل کشی کا منصوبہ بھی تیار کیا۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ پولس، عدلیہ اور اسپتال ان سب نے ہندو انتہا پسندوں اور سنگھ پریوار کے پروردہ عناصر (بی جے پی، وی ایچ پی، بجرنگ دل) نے گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی کی مہم میں حصہ لیا ہے۔

گودھرا کے واقعہ کے بعد گجرات میں کھیلا گیا خونیں ڈرامہ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھا۔ اس مہم کی وسیع اور منظم تیاریاں، ہتھیاروں کی فراہمی و دستیابی، ووٹروں کی فہرست اور راشن کارڈ کے ریکارڈ کی بنیاد پر جلائے گئے مکانات اور تباہ شدہ دوکانوں کی فہرست سازی، فسادیوں اور ہجوم کی قیادت کرنے والوں کو بوتل میں پانی کی فراہمی، سیلولر فونوں پر فساد پھیلانے سے متعلق دی گئی ہدایات اور مدد سے اندازہ ہوتا ہے کہ گودھرا تو محض ایک بہانہ تھا۔

یہ سارے انتہا پسند پوری طرح تیار اور مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں پر تشدد ڈھانے کے انتظار میں تھے اور موقع کا بس انتظار ہی کر رہے تھے۔ گودھرا کے واقعے نے انہیں وہ بہانہ فراہم کر دیا۔ اگر گودھرا کا واقعہ نہ ہوتا تو وہ کوئی اور جھگڑا کھڑا کر دیتے۔ کوئی بھی حیلہ تراش لیتے۔ ماضی میں ایسے مواقع آچکے ہیں جب انتہا پسندوں نے خود اپنی طرف سے آگ بھڑکائی ہے۔ ابھی کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے کہ سنگھ پریوار کے عناصر کے درمیان گئوکشی سے متعلق ایک ویڈیو ٹیپ کا استعمال موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کا یہ جملہ کہ "نہ گودھرا کا واقعہ ہوتا نہ گجرات میں تشدد بھڑکتا" اگر خود کو نکارنے کی کوشش نہیں تو کم از کم NAIVE ضرور ہے۔

ہندو انتہا پسند تنظیموں کی طرف سے بے قصور مسلمانوں پر تشدد کو حق بجانب قرار دینے کے مسلسل دعوے کا جواز یہ ہے کہ مسلمان قوم پرستی کے مخالف اور دہشت گرد ہیں۔ میرے خسر نے بڑی شان اور فخر سے ذات اور مذہب اور نسلی پس منظر کے امتیاز سے بالاتر ہو کر پچاس سال تک اپنے ملک اور اہل وطن کی خدمت کی تھی۔ وطن پرستی کے جذبے سے لبریز ان کی نظمیں اور انسانی اقدار، وقار اور فرقہ وارانہ رواداری سے ہم آہنگ ان کی تعلیمات، ہندوستانی تہذیب سے ان کی دیرینہ اور گہری وابستگی اور تمام عقائد کے لیے ان کے احترام کی گواہ ہیں۔ نہ وہ دہشت گرد تھے، نہ وہ بنیاد پرست تھے اور نہ ہی قوم مخالف تھے۔ درحقیقت وہ ایسے وطن پرست اور قابل فخر ہندوستانی تھے جنہوں نے ہندوستان چھوڑ کر امریکہ میں ہمارے ساتھ رہنے کے تمام مواقع کے باوجود ایسا نہیں کیا، کیونکہ وہ اپنے وطن اور اہل وطن کے تئیں اپنے فرائض کا احساس رکھتے تھے۔ انتہا پسندوں نے دیدہ و دانستہ حکومت گجرات کی شہ پر ان کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ محض اس بنا پر کہ وہ مسلمان تھے۔

کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ صرف غریب اور ان پڑھ مسلمان ہی انتہا پسندوں کے ظلم کا نشانہ بنے۔ سیکڑوں کھاتے پیتے مسلمان خاندان اور تجارتی مراکز بھی تباہ ہوئے۔ بوہرہ برادری کو، جو مسلمانوں میں کامیاب ترین تجارتی کمیونٹی شمار کی جاتی ہے راجکوٹ اور احمد آباد

میں خاص طور پر تاک کر نشانہ بنایا گیا، جہاں انہیں تجارت میں نمائندہ حیثیت حاصل تھی۔ میں نے ہندو شدت پسندوں کی طرف سے ایسے پرچے تقسیم ہوتے ہوئے دیکھے ہیں جن میں ہندوؤں سے مسلمانوں کی تجارتوں کا مقاطعہ کرنے، تجارت میں ان سے اشتراک نہ کرنے اور مسلمان مزدوروں کو کام سے محروم کرنے کے لیے کہا گیا ہے اور یہ بھی کہ ان باتوں پر عمل نہ کرنے والوں کو سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مسلمانوں کے اشتراک سے چلنے والی بہت سی تجارتیں تباہ کر دی گئیں۔ مسلمان مردوں سے شادی کر لینے والی ہندو عورتوں کو بھی اذیت دی گئی اور قتل کیا گیا۔ ان ہندو انتہاپسندوں کے ایجنڈے میں فاشسٹ نظریے کے تمام عناصر شامل ہیں اور یہ ایک ایسا ناکام نظریہ ہے جو آج بھی صرف ان بیمار ذہنوں پر اپنا سکہ جمائے ہوئے ہے جو بصورت دیگر ترقی کے ذریعے یا اپنے اصولوں کی طاقت کے ذریعے دنیا میں تبدیلی لانے میں ناکام رہے ہیں۔

جس طرح یہ ہندو انتہاپسند کامیاب اور خوشحال مسلمانوں کو پسند نہیں کرتے اسی طرح اعتدال پسند دانشور مسلمان بھی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے، جو اپنی برادریوں کے افراد کو تعلیم کے ذریعے ترقی پسندی اور رواداری کی راہ پر لگا کر ان میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں تاکہ اسلام کی اعتدال پسندانہ، جدید تر اور زیادہ دردمندانہ شبیہہ پیش کی جا سکے۔ ان کے ہم مشرب مسلمانوں کے رویے ان کے لیے مددگار ثابت ہوتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ مسلمانوں کو بنیاد پرست اور دہشت گردی کی تصویر بنا کر برابر پیش کر سکتے ہیں اور اس طرح دوسروں کو سماج کی برائیوں کے لیے اسی فرقہ کو ذمہ دار ٹھہرانے میں آسانی تو ہو گی ہی، ساتھ ہی انہیں، مسلمانوں کو بالعموم تشدد کا نشانہ بنانے کا جواز فراہم ہو جائے گا۔ ان ہندو انتہاپسندوں نے میرے خسر کو بھی اسی لیے قتل کیا کہ وہ اعتدال پسند مسلم تھے۔

میں ذاتی طور پر گجرات میں پولیس کمشنر کے عہدے پر فائز اپنے دو دوستوں سے احمد آباد کے پولیس کمشنر پانڈے کی طرف سے ۲۸ فروری کی صبح میں کیے گئے وعدے کے باوجود احسن جعفری کی حفاظت میں ان کی ناکامی کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ کمشنر پانڈے نے گلبرگ سوسائٹی میں آکر میرے خسر کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے گھر اور سوسائٹی کی حفاظت کے لیے پولیس کمک بھیجیں گے۔ اس کے بعد جعفری، گجرات کے کانگریس صدر امر سنگھ چودھری اور آل انڈیا کانگریس پریذیڈنٹ مسز سونیا گاندھی کے متعدد ٹیلی فون کالوں کے باوجود کمشنر پانڈے نے اس وقت تک کوئی پولیس فورس نہیں بھیجی جب تک کہ تشدد پر آمادہ ہجوم مسٹر جعفری اور ۵۰ دیگر افراد کو قتل کر کے اور آگ لگا کر وہاں سے ہٹ نہیں گیا، جن میں سے بیشتر عورتیں

اور بچے تھے، جو پُر تشدد ہجوم سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے مسز جعفری کے گھر میں آگئے تھے۔ دونوں کمشنروں نے مجھے بتایا کہ انہیں "اوپر" سے "ہلکا ہاتھ" رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اس کی وضاحت نہیں کی کہ "اوپر" اور "ہلکا ہاتھ" کا کیا مطلب ہے؟ کمشنر پانڈے کے طرز عمل سے یہ جان لینا مشکل نہیں ہے کہ ان کا اشارہ کس طرف تھا۔ ۲۷ر فروری ۲۰۰۲ء کو گجرات کے چیف منسٹر نریندر مودی کی رہائش گاہ پر ہوئی میٹنگ کی حالیہ ترین رپورٹ جس میں بشمول کمشنر پانڈے، ان کی کابینہ کے رفقاء اور اعلیٰ پولیس افسران نے شرکت کی، اس ملی بھگت اور حکومت کی جرم پروری کی شاہد ہے۔ مودی نے ان سے اگلے دن ہونے والے گجرات بند میں بی جے پی کے انتہا پسندوں کو تعاون دینے اور ان کی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہ بننے کے لیے کہا تھا۔ اس کی ضمانت دینے کے لیے ان کی کابینہ کے دو وزراء بھٹ اور جڈیجا ۲۸ر فروری ۲۰۰۲ء کو پولیس کنٹرول روم میں بیٹھے ہوئے ہجوم کو اپنا کام کرتے ہوئے دیکھتے اور ہدایات دیتے رہے۔

حکومت کی طرف سے اس فساد میں مارے گئے افراد کی تعداد ۹۹۰ بتائی گئی ہے۔ گلبرگ سوسائٹی میں مہلوکین کی تعداد ان کے اندازے کے مطابق ۱۸ر تھی جو بعد میں بدل کر ۳۹ کردی گئی۔ گلبرگ سوسائٹی میں زندہ بچ رہنے والوں سے بات کرنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ سوسائٹی میں رہائش پذیر ۸۹ر افراد مارے گئے تھے۔ ہمارے گھر میں زندہ بچ رہنے والے لوگوں نے جن میں میری ساس بھی تھیں، بتایا کہ سوسائٹی میں باہر کے ایسے کئی مسلمان تھے جو تشدد کے خوف سے ۲۸ر فروری کی صبح کو جعفری صاحب کے گھر آگئے تھے۔ ان کا اندازہ ہے کہ صرف گلبرگ سوسائٹی میں مارے گئے افراد کی تعداد ۲۰۰ر سے زیادہ ہو سکتی ہے۔

میں نے احمد آباد کے مضافات میں چند گاؤں کا بھی دورہ کیا ہے جہاں تشدد کی ابتداء سے دس دن بعد بھی کئی افراد مارے گئے تھے۔ سڑتی اور جلی ہوئی لاشیں کھیتوں اور کھلے میدانوں میں بکھری پڑی تھیں۔ پُر ہجوم امدادی کیمپوں میں مقیم ایک لاکھ فساد زدگان میں سے کئی افراد سے بات کی، جن میں سے ہر کوئی اپنے کسی عزیز کو کھو چکا ہے یا اسے ظلم و تشدد، قتل اور آتشزنی کا نشانہ بنتے دیکھ چکا ہے۔ کم عمر بچوں نے اپنے گھر کی عورتوں کی عصمت دری اور دیگر افراد اور دوستوں کی اذیت دہی، ان کے اعضاء کے کاٹے جانے اور جلائے جانے کے مناظر دیکھے ہیں۔ ایسی شاید ہی چند راتیں گزری ہوں گی جب میں خود اپنے عزیزوں کے قتل اور جلائے جانے کے خواب سے ٹھنڈے پسینے میں تربتر چونک کر نہ بیدار ہوا ہوں۔ میرا سات سالہ بیٹا پوچھتا ہے۔ "کیا اگر ہم ہندوستان جائیں گے تو لوگ ہمیں جلا ڈالیں گے؟" یہ

سوالات میرے لیے پریشان کن ہیں اور ایسا کوئی تسلی بخش جواب ہے نہیں جو میں اسے دے سکوں۔ تاہم حقیقی المیہ یہ ہے کہ میں اس اذیت، اس بربریت، اس نقصان اور اس کرب میں اکیلا نہیں ہوں۔ کسی نے کہا۔ "ہم تاریخ سے یہ سیکھتے ہیں کہ ہم تاریخ سے کچھ بھی نہیں سیکھ پاتے۔ "نازی ہالوکاسٹ کے بعد ہم نے کہا۔ "اب کبھی نہیں۔" روانڈا کے بعد ہم نے تہیہ کیا کہ روانڈا کو دہرایا نہیں جائے گا۔ بوسنیا کے بعد ہم نے عہد کیا کہ بوسنیا کو دہرایا نہیں جائے گا۔ اب ہم کیا کرنے والے ہیں؟ کیا ہم اگلی بار تک کے لیے "گجرات کو نہ دہرانے" کے ایک اور عہد سے سمجھوتہ کرنے والے ہیں؟ یا پھر ہمیں کوئی بامعنی قدم اٹھانا اور آخری بار اس وحشی کو لگام دینے کا عہد کرنا چاہیے۔

امریکہ دنیا کی سب سے بڑی معیشت ہے۔ دنیا بھر کے بہت سے انتہا پسند اور دہشت گرد گروہوں کے حامی عناصر یہاں موجود ہیں، جو امریکہ اور یوروپ میں ان کی سرگرمیوں کے لیے رقوم جمع کرتے ہیں۔ گجرات میں بے قصور انسانوں کے خلاف انتہا پسندی اور تشدد میں تعاون کے لیے کثیر مقدار میں پھر امریکی اور یوروپی دولت بھیجی جارہی ہے۔ یہ دولت برسراقتدار اکثریت بی جے پی کے بہت سے دوستوں اور سنگھ پریوار کے حامیوں سے آتی ہے۔ جن میں سے بعض وی ایچ پی امریکہ، بجرنگ دل اور ہندو سیوک سنگھ جو امریکہ اور یوروپ میں فعال ہیں۔ ایسے ہزاروں سادہ لوح ہندو ہیں جو یہ جانے بغیر ان تنظیموں کو چندہ دیتے ہیں کہ مذہب کے نام پر دیا گیا ان کا پیسہ انتہا پسندوں کی تشددانہ سرگرمیوں پر خرچ کیا جائے گا۔ جس طرح ہم نے امریکہ اور دیگر ممالک میں مسلم بنیاد پرست تنظیموں پر پابندی لگا کر ان کی املاک کو منجمد کردیا ہے، ہمیں ان ہندو انتہا پسند تنظیموں پر پابندی لگانا اور ان کی رقوم اور املاک کو منجمد کردینا چاہیے۔ یہ اقدام ہندوستان میں اس طرح کی خونریزی کو روکنے اور بے قصور افراد کی زندگیوں کو بچانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

گجرات کی منظم خونریزی نے ہزاروں معصوم افراد کی جان لی ہے، اور ایک لاکھ سے زائد دیگر افراد کی جن میں عورتیں اور بچے شامل ہیں، زندگیاں برباد کی ہیں۔ ان میں سے بہت سے فسادزدگان سیاست بازوں اور تشدد برپا کرنے والے لوگوں کی طرف سے یہ پیش کش کی جارہی ہے کہ اگر وہ مجرموں اور ہجوم کی قیادت کے ذمہ دار افراد کے خلاف الزامات واپس لے لیں تو انہیں اپنے گھروں کو واپس لوٹنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ اس سے اقلیتوں میں اعتماد بحال کرنے اور تحفظ کا احساس پیدا کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اگر ان سے یہ شرط منظور کرالی گئی تو انہیں اپنے ہی ملک میں دوسرے درجے کی شہریت بھی قبول کرنے پر مجبور کیا

جائے گا۔ ہندوستان میرا آبائی وطن ہے اور مجھے اپنے تہذیبی ورثے پر ناز ہے۔ لیکن تہذیب انتہا پسندوں کے ہاتھوں میں یرغمال بن گئی ہے۔ مذہبی انتہا پسندوں کو کھیلنے کی اجازت اور شہ دے کر حکومت اب ان پر قابو پانے سے قاصر ہے۔ فساد شروع ہونے کے بعد سے تقریباً تین ماہ تک گجرات برابر جل رہا ہے۔ زندگیاں مسلسل تباہ ہو رہی ہیں۔

پوری عالمی برادری اس تشدد کی مذمت میں زبانی ہمدردی تک بھی نہیں جتا رہی ہے اور صرف تماشہ دیکھے جا رہی ہے۔ گجرات میں فساد شروع ہونے کے چار دن بعد اور میرے خسر کے ساتھ وحشیانہ سلوک اور دیگر افراد کے ہمراہ ان کے قتل کے تین دن بعد امریکی نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر کونڈولیزا رائس نے دہشت گردی کے خلاف ہماری جنگ میں ہندوستان کے کردار کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں یقین ہے کہ واجپئی حکومت صحیح اقدام کرے گی اور ہم صحیح اقدام کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کریں گے۔''

یہ حیرت کی بات ہے کہ دہشت گردی کے خلاف خود اپنی جنگ سے الجھتے ہوئے ہم اپنے نظریے، آزادی، جمہوریت، انسانی وقار، حقوق اور عدل کے تحفظ کے لیے اپنے عہد کو اگر ترک نہیں کر رہے ہیں تو اسے نظر انداز ضرور کر رہے ہیں۔ گجرات کے تشدد کی بپتا کی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہم صرف اس بنا پر ان کی طرف سے آنکھیں نہ موندلیں کہ تلافی کے دیگر راستے ہیں۔ القاعدہ سے مشترک نبرد آزمائی میں مصروف کیا ہم سنگھ پریوار کی اس لفاظی کو قبول کر کے کہ سارے ہندوستانی مسلمان بنیاد پرست اور دہشت گرد ہیں، اس حکومت میں انسانی حقوق کی پامالی سے چشم پوشی کر سکتے ہیں؟

ہمیں اس جنون کو روکنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں تمام تحفظات سے بالاتر ہو کر انتہا پسندی کے انسان دشمن وفاداروں کے ہاتھوں تشدد کا شکار بننے والے ممالک کو آزاد کرانے کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں ضرورت ہے گجرات میں انسانیت کو، ظلم و بربریت کا نشانہ بنانے والوں تک بلا امتیاز مذہب و عقیدہ انصاف کو رسائی دلانے کی، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان اور بلا تفریق حیثیت و عہدہ خواہ وہ پولیس کمشنر یا وزیر کابینہ، ہمیں اس کی ضمانت دینی چاہیے کہ انصاف کے شکنجے تک انہیں پہنچایا جائے یا انصاف کا شکنجہ ان تک پہنچے۔ انصاف کے تقاضے کی تکمیل ہر حالت میں ہونی چاہیے۔ مذہبی آزادی اور انسانی وقار کی بقا کے لیے آپ کی کوششوں اور ہماری بات توجہ سے سننے کے لیے آپ سب کا بہت شکریہ۔

☆ (مضمون نگار ڈیلاویر یونیورسٹی میں میرین سائنٹسٹ اور سابق ممبر پارلیمنٹ احسن جعفری مرحوم کے داماد ہیں۔)

○○

فضل امام ملک

خصوصی مطالعہ

ہے رام!

(کتھا رپورٹ)

کئی منظر میرے بھیتر فریز ہو گئے ہیں۔ آنکھوں کی راہ سیدھے اندر تک اتر گئے ہیں۔ حالانکہ من کرتا ہے کہ ان سے آنکھیں چرالوں۔ انہیں نہیں دیکھوں۔ لیکن آنکھوں کے راستے قطرہ قطرہ میرے بھیتر یہ سارے منظر مجھے بے چین کر جاتے ہیں۔ ایک منظر ابھرتا ہے۔ گودھرا میں کھڑی ریل گاڑی، کچھ لوگ ہاتھوں میں پیٹرول کا ڈبہ اٹھائے آگے بڑھتے ہیں اور ریل گاڑی کے ایک کمپارٹمنٹ پر چھڑک کر ماچس کی صرف ایک تیلی پھینک دیتے ہیں۔ ریل گاڑی کا ایک ڈبہ جلتا ہے۔ ایک شور اٹھتا ہے۔ ان میں عورتوں اور بچوں کی آوازیں بھی شامل ہیں۔ آگ لگانے والے باہر کھڑے قہقہہ لگاتے ہیں۔ منظر بدلتا ہے۔ گودھرا کی جلتی ریل گاڑی کی جگہ احمد آباد لیتا ہے۔ گودھرا کی ایک تیلی گجرات کو جلا ڈالتی ہے۔ جلتے گھر، عورتوں اور بچوں کی چیخیں، تلوار بھانجتے بہادر کار سیوک، لہو میں ڈوبی سڑکیں، جلتی دوکانیں، لٹتی عزتیں، دنگائیوں کو شہہ دیتی پولیس اور "سوابھاوک پرتی کریا" جیسا بیان دیتا سیوم سیوک مکھیہ منتری۔ کئی منظر میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ میں سکتے اور صدمے میں ڈوبا انہیں دیکھتا ہوں۔ گاندھی کے گجرات میں "رام راجیہ" کا یہ کیسا منظر ہے۔ اس رام راجیہ کی کلپنا تو نہیں کی تھی باپو نے۔ تو پھر ایسا کیوں؟ ہتھیاروں سے لیس دنگائیوں کی ٹولی احسان جعفری کے مکان کو گھیر لیتی ہے۔ احسان جعفری کبھی کمیونسٹ رہے تھے۔ بعد میں کانگریس میں شامل ہو گئے، مگر انہوں نے اپنا گھر مسلم محلے میں نہیں بنایا۔ انہوں نے ہندوؤں کے بیچ اپنا گھر بنایا۔ ان کا ماننا تھا کہ اس سے آپسی رشتے مضبوط ہوں گے۔ پیار اور امن کا سندیسہ لوگوں کے بیچ میں جائے گا۔ حالانکہ وہ چاہتے تو مسلمانوں کے بیچ گھر بسا سکتے تھے۔ محفوظ اور سلامت رہنے کے لیے اس سے بہتر علاقہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ صرف انسانی رشتوں کو مضبوط بنانے کے لیے۔

دنگائیوں سے گھرے احسان جعفری کے چہرے پر لکھی عبارت مجھے دکھائی دے رہی

ہے۔ ایک دم صاف، موت، ان کے دروازے پر دستک دے رہی ہے اور وہ گھر کے اندر بند لوگوں کو فون پر خبر کر رہے ہیں۔ چہرے پر موت کا خوف نہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مرنا تو سبھی کو ایک دن ہے۔ انہیں اس بات کا غم ہے کہ پھر کوئی مسلمان کسی ہندو علاقے میں یا ان کی طرح ہی کوئی ہندو مسلمان علاقہ میں اپنا گھر نہیں بنائے گا۔ انہیں اس بات کا ملال ہے کہ قتل ان کا نہیں، ان کے یقین کا ہو رہا ہے۔ اس یقین کا جو بڑی مدت کے بعد کوئی کسی پر کرتا ہے۔ مگر نریندر مودی کے کارسیوکوں کو اس کی کیا فکر؟ وہ آگے بڑھتے ہیں اور ان کے مکان پر پیٹرول چھڑک کر ایک تیلی اچھال دیتے ہیں۔ ہنسا کا ایک باب یہاں ختم ہوتا ہے۔ ہتھیارے جشن منا رہے ہیں۔ سیوم سیوک مکھیہ منتری ان کی پیٹھ تھپتھپا رہا ہے۔ بھیڑ دوسرے علاقہ میں کسی دوسرے گھر کو جلانے کے لیے آگے بڑھتی ہے۔ مکھیہ منتری کے پیادے اور پولیس ان کے ساتھ ہو لیتی ہے۔ انہیں ہر طرح کی "سرکشا" دینے کے لیے۔

آگے کا منظر ابھی ابھرتا، اس سے پہلے ہی کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا، دیکھتا ہوں، گاندھی جی کھڑے ہیں۔ میں حیرت زدہ انہیں دیکھ کر چونکتا ہوں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ اداس چہرہ اور اڑی اڑی رنگت۔ "باپو...... آپ یہاں!" میں ان سے پوچھتا ہوں۔

"ہاں! میں ہی ہوں۔" بے حد تھکی ہوئی آواز ابھرتی ہے۔ مانو بولتے میں انہیں کافی تکلیف ہو رہی ہے۔ لگا کہ وہ رو دیں گے۔ مگر انہوں نے اپنے پر قابو کیا۔ "تم بھی سب کچھ دلی ہی میں بیٹھ کر دیکھ لو گے...... یہ کام تو واجپئی اور اڈوانی پر چھوڑو...... وہ دیش کے پردھان منتری اور گرہ منتری نہیں ہیں، وہ تو کارسیوکوں کے سیوک ہیں۔ ان سے تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ دور سے ہی سارا تماشہ دیکھیں اور اعلان کریں کہ گجرات میں سب کچھ ٹھیک ہے۔"

"مگر باپو، میرا وہاں جانا ٹھیک ہوگا......؟" میرے بھیتر کا ڈر بولا۔ اخباروں میں پڑھا تھا کہ مودی کے کارسیوکوں نے فوج کے جوانوں تک سے پوچھا تھا کہ کوئی مسلمان ہے تو اسے گاڑی سے اتار کر ہمارے حوالے کر دو۔

باپو کے چہرے پر درد کی ایک لکیر ابھری مگر انہوں نے اپنے کو سنبھالا۔ "اس وقت تمہارا ہی جانا ٹھیک رہے گا۔ میں جو ہوں تمہارے ساتھ، وہ مجھے مارنے کے بعد ہی تم تک پہنچ پائیں گے۔ چلو چلتے ہیں......" اور پھر انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں ان کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔ باپو گو دھرا ہوتے ہوئے ان سبھی جگہوں پر گئے جہاں قتل و غارت گری کا دور جاری تھا۔ وہ مجھے لے کر گجرات کے گاؤں اور قصبوں میں گئے۔ وہاں مسلمانوں کے گھر خالی

پڑے تھے۔ تمام لوگ گھر چھوڑ کر محفوظ علاقوں میں پناہ لینے کے لیے بھاگ گئے تھے۔ سابر کانٹھا، مہسانا، بناس کانٹھا، پنچ محل، احمد آباد، کھیڑہ، بڑودہ، بھروچ، سورت، بھاؤنگر اور یہاں کے گاؤں قصبوں میں "رام نام" پر تماشہ ہو رہا تھا اور مسلمانوں کے گھروں پر بھگوا جھنڈے لہرا رہے تھے یا پھر گھر اور دوکان آگ کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ باپو یہ سب دیکھ کر سکتے میں تھے۔ ان کے چہرے پر ابھرے کرب کو آسانی سے پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ ایک ایک چیز دیکھتے اور رونے لگتے۔ مہسانا، سابر کانٹھا اور پنچ محل کے ماحول میں انسانی جسموں کے جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں کئی لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ باپو بے یقینی کی حالت میں سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انسان جانور بھی ہو سکتا ہے، انہیں یقین نہیں ہو رہا تھا۔ مہسانا کے اندرونی علاقہ میں ہمیں نسیم ملا۔ اس نے ہمیں بتایا، یہاں ہندو مسلمان دونوں میں بہت پیار تھا۔ ہم امن چین سے رہتے تھے لیکن ہمارے پیار کو نظر لگ گئی اور کچھ لوگوں نے مارکاٹ شروع کر دی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ ہمیں کچھ دوسرے گاؤں میں لے گیا۔ وہاں آج بھی ہولی میں مسلمانوں کی داڑھیاں رنگی ہوتی ہیں اور محرم کے تعزیے میں ہندوؤں کے کاندھے لگے ہوتے ہیں۔ پہلی بار باپو کی آنکھوں میں چمک ان گاؤں میں ہی دیکھنے کو ملی۔ انہوں نے کہا بھی کہ ان لوگوں سے کیوں نہیں سیکھتے ہیں لوگ۔ میں انہیں کیا جواب دیتا۔ میں تو صرف انہیں دیکھ رہا تھا۔ باپو نے حالانکہ صحیح کہا تھا۔ رام راجیہ کی کلپنا تو باپو نے کی تھی، مگر اس رام راجیہ کی نہیں۔

گاندھی جی پھر مجھے لے کر احمد آباد کے اسپتال پہنچے۔ دنگا کے شکار لوگ وہاں داخل تھے۔ پانچ سال کے شاہ رخ کو نہیں پتہ تھا کہ ۲۷ر فروری کو کیا ہوا اور نہ ہی اسے یہ پتہ ہے کہ آئی ایس آئی کیا بلا ہے؟ لیکن دنگائیوں نے اسے بھی نہیں بخشا۔ اس اسپتال کے "برن وارڈ" میں شاہ رخ جیسے کئی معصوم بچے تھے جو احمد آباد دنگوں کا شکار ہوئے تھے۔ شاہ رخ کی بڑی بہن شاہانہ کبیر بھی اسپتال میں بھرتی ہے۔ وہ رُندھے ہوئے گلے سے پوچھتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ دونوں کو نہیں پتہ کہ ان کے ماں باپ کا کیا ہوا۔ دوسری طرف اسی وارڈ میں داخل ۳۰ر سال کی صوفی بی بی کی آنکھوں میں تب بھی آنسو نہیں آئے جب اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے چار سال کے بیٹے نے دم توڑ دیا۔ گودھرا حادثہ کے دوسرے دن ہوئے قتل عام میں اس کے شوہر اور دو بچوں شبنم اور شفیق احمد زندہ جلا دیے گئے تھے۔ آصف نوے فیصد جل گیا تھا اور ڈاکٹروں نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کی جان بچانی مشکل ہے۔ حالانکہ ڈاکٹروں نے کافی کوشش کی اسے بچانے کی۔ صدمے اور سکتے میں ڈوبی صوفی بی بی کو پتہ نہیں کہ اب اس کا

کیا ہو گا۔ باپو زخمیوں کا حال پوچھتے ہیں، ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اندر ہی اندر ٹوٹتے رہتے ہیں۔

اسپتال کے ایک اور وارڈ میں داخل ۱۷ سال کے یٰسین کی آنکھوں میں کرب ہے۔ ایک بے یقینی کی حالت میں وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ پھر وہ پوچھتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اسے سب سے زیادہ صدمہ اس بات کا ہے کہ انہیں ان کے پڑوسی نے مارا ہے۔ اس پڑوسی نے جس کی جان بچانے کے لیے انہوں نے کبھی اپنا خون دیا تھا۔ باپو کیا جواب دیتے اسے؟ وہ صرف دھیرے سے کہتے ہیں کہ دنگے کا زخم تو بھر جائے گا لیکن جس وشواس کا خون ہوا ہے، وہ کیسے واپس آئے گا؟ یٰسین نے کہا کہ اب اس کی زندگی میں کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ اس کی ماں ۲۸ر فروری کی رات سے ہی لاپتہ ہے۔ یٰسین کے والد عثمان منصوری بھی اسی وارڈ میں بھرتی ہیں۔ دونوں اب احمد آباد میں رہنا نہیں چاہتے۔ آٹو رکشہ ڈرائیور رام جی بھائی چوہان پر عید گاہ روڈ پر ایسیڈ پھینکا گیا۔ اس کا چہرہ اور ہاتھ جل گئے ہیں۔

باپو کے چہرے پر پڑھا جا سکتا تھا کہ یہ سب دیکھ کر انہیں کتنا کرب ہو رہا ہو گا۔ بے چین، پریشان اور کچھ ایسا کرنے کی للک جو ہنسا کی اس آگ کو لگام دے۔ وہ کہتے ہیں کہ بٹوارے کے وقت بھی لوگ اتنے وحشی نہیں بنے تھے۔ انسانوں کو زندہ جلانا کس دھرم میں لکھا ہے، بتا سکتے ہو تم؟ میں کیا بتاتا، میں تو اتنا ہی جانتا تھا کہ کسی بھی دھرم نے ہنسا کی اجازت نہیں دی ہے۔ پریم اور بھائی چارہ کا سندیش تو ہر دھرم نے دیا ہے، تو پھر رام کے نام پر لوگوں کا گلا کاٹنا اور انسانوں کو بانٹنا کب اور کہاں سے سیکھا ہم نے؟ باپو شاہ عالم کیمپ بھی گئے۔ لوگوں نے باپو سے سوال کیے؟ پوچھا، باپو ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ وہاں کئی عورتیں ملیں۔ ان کی عزت لوٹی گئی تھی۔ ان میں تو کئی حاملہ ہیں، لیکن دنگائیوں نے انہیں بھی نہیں چھوڑا۔ کتنے ہی بچے یتیم ہو گئے ہیں تو کتنوں کی اولادیں ماری گئی ہیں۔ ان کے لیے تو وہ مندر اور مسجد ہی تھے جو دنگے کا شکار ہو گئے۔ مگر دنگائیوں کو اس سے کیا لینا دینا۔ باپو کانکریہ راحت کیمپ بھی گئے۔ وہاں بھی لوگوں کی آنکھوں سے آنسو پونچھے۔

کیمپ سے نکل کر سڑک پر آگے بڑھے تو دنگائیوں کی ٹولی لوٹ پاٹ مچانے میں لگی تھی۔ باپو انہیں دیکھ کر رُکے۔ بھیڑ میں سے کسی نے پوچھا۔ "کیوں بڈھے، گھر سے کیوں نکلا؟" باپو کیا جواب دیتے۔ وہ خاموش رہے۔ لنگوٹی اور لاٹھی کو دیکھ کر ان میں سے ہی کسی نے قہقہہ لگایا۔ "لاٹھی سے کام نہیں چلے گا۔ ہاتھ میں ترشول لے، تبھی ہندوتوا کی رکھشا ہو گی، اور تیرے بدن پر کپڑے کیوں نہیں ہے؟ بول بڈھے جے شری رام۔" کسی نے باپو

کے بدن پر بھگوا کپڑا ڈال دیا۔ وہ کچھ بولتے کہ تبھی کسی نے کہا۔ "اور تیرے ساتھ یہ کون ہے؟ کتّا تو نہیں ہے؟" باپو پہلی بار تن کر بولے۔ "یہ میرا دنش ہے۔" بھیڑ پھر قہقہہ لگاتی ہے اور جے شری رام کا نعرہ اچھالتی آگے بڑھتی ہے۔ باپو بدبداتے ہیں۔ "ہے رام! انہیں چھما کرنا، یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟" مجھے لگا کہ اپنے یگ کا یہ ایک اور عیسیٰ مسیح ہے جو سب کچھ دیکھ کر بھی بھگوان سے کہہ رہا ہے کہ بھگوان انہیں معاف کر دینا۔ باپو مجھے ساتھ لے کر سابرمتی آشرم پہنچتے ہیں۔ آشرم میں سناٹا ہے۔ چاروں طرف وحشت اور سناٹا پھیلا ہے۔ آشرم کے سیوادار اداس ہیں۔ باپو کو دیکھتے ہی ٹرسٹ کے سکریٹری امرت بھائی مودی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ "باپو! کیا ہو گیا آپ کے گجرات کو۔ اہنسا، سچائی اور بھائی چارہ کا سندیش دینے والی دھرتی اب حیوانیت کی نئی تاریخ لکھ رہی ہے۔ آپ کچھ کرتے کیوں نہیں باپو......؟" ان کا گلا رُندھ جاتا ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی برس رہی ہے۔ جسم میں ایک سہرن سی ہوتی ہے۔ باپو آگے بڑھ کر ان کے آنسو پونچھتے ہیں۔ وہ پھر کہتے ہیں۔ "سیاسی موالیوں نے ووٹ کے لیے سب کچھ کیا ہے۔ گجرات جل رہا ہے اور سرکار اپنی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہے۔ دنگے لگاتار ہو رہے ہیں۔ دھرم کے نام پر اَدھرم ہو رہا ہے۔ کچھ کریں باپو۔" باپو انہیں تسلی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انیائے اور اندھیرا دور ہو گا۔ ہٹلر اور مسولینی، راون اور کنس کا جیون بہت نہیں ہوتا ہے۔ "امرت بھائی کی آنکھوں میں امید کا دیپک ٹمٹمانے لگتا ہے۔ باپو وہاں سے دوسری جگہ جانے کے لیے نکلتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پورے گجرات کو میری ضرورت ہے۔ مجھے جانے دو۔ امرت بھائی آنسو پونچھ کر انہیں رخصت کرتے ہیں۔ مگر جانے سے پہلے وہ اس میوزیم میں لے جانا نہیں بھولتے جس میں اہنسا کے پرچار اور سنگھرش کی تمام تصاویر موجود ہیں۔ مہاتما گاندھی کستوربا گاندھی کے ساتھ کافی عرصہ تک یہاں رہے ہیں۔ یہاں سے انسانیت کا پیغام دیا ہے۔ تمام یادیں اتہاس بن چکی ہیں لیکن باپو تو آج بھی اس سابرمتی آشرم میں ہر آدمی کی سانس میں زندہ ہیں۔

تھوڑی دور چلتے ہی سڑک پر ایک قافلہ آتا دکھائی دیتا ہے۔ آگے آگے پولیس کی گاڑی، لال بتیوں والی گاڑی، قافلہ مکھیہ منتری نریندر مودی کا ہے۔ باپو بیچ سڑک پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پولیس والے باپو کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں مگر باپو اپنی جگہ کھڑے رہتے ہیں۔ نہتے بوڑھے کو دیکھ کر پولیس پہلے تو باتوں سے ہی کام چلاتی ہے لیکن پھر افسروں کے کہنے پر کچھ پولیس والے ڈنڈہ لے کر باپو کی طرف بڑھتے ہیں۔ لال بتی لگی دوسری گاڑیاں بھی اس بیچ آ کر رُک جاتی ہیں۔ گاڑیوں کے لوگ پریشان ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ کوئی آتنک وادی

سامنے کھڑا ہے، مگر سیوم سیوک مکھیہ منتری انہیں پہچان لیتا ہے۔ وہ اپنی گاڑی سے اترتا ہے۔ باپو اب بھی اپنی جگہ خاموش کھڑے ہیں۔ مکھیہ منتری کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی گاڑی سے اترتے ہیں۔ ان میں ایسے منتری بھی ہیں جو ملک اور ریاست کے نہیں، سنگھ پریوار کے وفادار ہیں۔ عیسائی مخالف دنگوں میں یہی تو آگے آگے رہے تھے۔ ڈانگ میں گرجا گھر اور بائبل جلانے میں سنگھ کے یہ سیوم سیوک بھی شامل تھے۔ مگر وہ فی الحال گجرات کی حکومت میں مکھیہ منتری کے نورتنوں میں سے ہیں۔

سیوم سیوک مکھیہ منتری باپو کو دیکھتے ہی آپا کھوتا ہے۔ انہیں لگا کہ اس بوڑھے کے گجرات میں رہنے سے تو ان کے منصوبے پورے نہیں ہوں گے۔ وہ غصے میں بھرا باپو کی طرف بڑھتا ہے اور تمتما کر باپو سے پوچھتا ہے۔ ''یہاں آنے کی ہمت کیسے ہوئی، کسی نے روکا نہیں تمہیں؟''

باپو شانت ہیں۔ صرف اتنا ہی کہتے ہیں۔ ''مجھے کون روک سکتا ہے۔ مجھے تو یہاں آنا ہی تھا، اپنے بچوں کو دیکھنے ...... ان کے آنسو پونچھنے کے لیے۔ مجھے یہاں آنے سے بھلا کون روک سکتا ہے؟''

باپو کا یہ جواب اسے بھڑکانے کے لیے کافی تھا۔ اس کے چہرے پر وحشی پن کا عکس اُبھرا اور اچانک ہی اس کا چہرہ ناتھورام گوڈسے جیسا دکھائی دینے لگا۔ ''لیکن اگر تم یہاں رہے تو پھر ہمارے منصوبے پورے نہیں ہوں گے۔ تمہیں تو یہاں سے جانا ہی ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں سختی آگئی۔

باپو دھیرے سے طنزیہ مسکرائے اور کہا۔ ''میں تو لوگوں کو امن، پریم اور بھائی چارے کا سبق پڑھا کر ہی جاؤں گا۔''

مکھیہ منتری کو اس جواب کی امید نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر ایک مسکان اُبھری۔ ''پرتی کریا'' سے پہلے والی مسکان ...... پھر دھیرے سے اس نے کہا۔ ''یہ آخری موقع ہے، تم یہاں سے چلے جاؤ ......'' اب وہاں مودی نہیں تھا۔ وہ پوری طرح گوڈسے میں بدل گیا تھا۔ سیوم سیوک مکھیہ منتری کے چہرے سے ''مکھوٹا'' ہٹ گیا تھا۔

باپو اپنی جگہ خاموش کھڑے رہے۔ ایک عزم کے ساتھ ...... باپو کو اپنی جگہ کھڑا دیکھ کر مودی کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ وہ پھر باپو کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر باپو تو ایک مشن پر نکلے تھے۔ آدمی کو ہندو اور مسلمان بنانے سے پہلے ایک انسان بنانے کے مشن پر۔ مودی کا چہرہ اب پوری طرح گوڈسے میں بدل جاتا ہے۔ اس کے چہرے پر لکھی عبارت میں سنگھ پریوار کے

الفاظ دکھائی پڑتے ہیں۔ اس کے چہرے کی مسکان گہری ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن اس درمیان کئی ترشول دھاری آگے بڑھ کر باپو کو اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں۔ سبھی کے چہرے گوڈسے سے ملتے جلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ترشول دھاری مکھیہ منتری کی مسکان کا مطلب خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ بلکہ منتری کے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کے جانباز کارسیوک باپو پر کیروسن تیل چھڑک کر آگ لگا دیتے ہیں۔ باپو گرتے ہیں۔ ان کے بھیتر بیٹھے ہوئے رام باہر آتے ہیں۔ گرتے ہوئے باپو کے منھ سے "ہے رام" نکلتا ہے۔ ادھر کارسیوک جے شری رام کا نعرہ اچھالتے ہیں۔ اپنی جگہ حیرت زدہ کھڑا میں جلتے ہوئے باپو کو بچانے کے لیے آگے بڑھتا ہوں۔

مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے...... نہ باپو...... نہ مودی...... نہ پولیس کی گارد...... نہ جانباز ترشول دھاری کارسیوک...... سامنے ٹی وی چل رہا ہے۔ اس پر کئی منظر ابھرتے ہیں۔ ولی گجراتی کے مزار کو زمین بوس کر اس پر کولتار کی بنائی سڑک...... استاد فیاض خان کا ٹوٹا مقبرہ، شاہ عالم کیمپ میں جذباتی بھاشن دیتے دیش کے پردھان منتری، بغل میں بے شرموں کی طرح کھڑا اسیوم سیوک مکھیہ منتری۔ راج دھرم کی سیکھ دینے کے بعد پردھان منتری واپس لوٹتے ہیں اور سابرمتی آشرم میں سیوم سیوکوں کی نئی پودھ شانتی بیٹھک میں اشانتی پھیلاتی ہے...... مودی کی پولیس صحافیوں پر حملہ کرتی ہے...... لوک سبھا میں سنگھ پریوار کی بھاشا میں بولتے جارج فرنانڈیز...... کئی منظر ابھرتے ہیں...... مودی کی کرسی سلامت ہے۔ وزیر داخلہ اس کو کلین چٹ دیتے ہیں۔

میرے بھیتر گونج رہی ہے استاد فیاض خاں کی بندش اور ولی گجراتی کے اشعار ؎

مجھ کو روشن دلاں نے دی ہے خبر
کہ سخن کا چراغ روشن ہے

اور گاندھی جی کے رام، پوری لئے میں گا رہے ہیں۔ "اللہ ایشور تیرو نام...... سب کو سمتی دے بھگوان۔" یہ آواز آپ کو نہیں سنائی دے رہی ہے کیا؟ ○○

فہرست مطبوعات

سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن

61-65 انسٹی ٹیوشنل ایریا
جنک پوری، نئی دہلی۔110058

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت
	اے ہینڈ بک آف کامن ریمیڈیز ان یونانی سسٹم آف میڈیسن	
۱۔	انگریزی	19.00
۲۔	اردو	30.00
۳۔	ہندی	36.00
۴۔	پنجابی	16.00
۵۔	تامل	8.00
۶۔	تیلگو	9.00
۷۔	کنڑ	34.00
۸۔	اڑیہ	34.00
۹۔	گجراتی	44.00
۱۰۔	عربی	44.00
۱۱۔	بنگالی	19.00
۱۲۔	کتاب الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ۔I (اردو)	71.00
۱۳۔	کتاب الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ۔II (اردو)	208.00
۱۴۔	کتاب الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ۔III (اردو)	275.00
۱۵۔	امراض قلب (اردو)	205.00
۱۶۔	امراض ریہ (اردو)	150.00
۱۷۔	آئینہ سرگزشت (اردو)	07.00
۱۸۔	آئینہ سرگزشت (ہندی)	40.00
۱۹۔	کتاب العمدہ فی الجراحت ۔I (اردو)	57.00
۲۰۔	کتاب العمدہ فی الجراحت ۔II (اردو)	93.00
۲۱۔	کتاب الکلیات (اردو)	71.00
۲۲۔	کتاب الکلیات (عربی)	107.00
۲۳۔	کتاب المنصوری (اردو)	169.00
۲۴۔	کتاب الابدال (اردو)	109.00
۲۵۔	کتاب الابدال (انگریزی)	100.00
۲۶۔	کتاب التیسیر (اردو)	50.00
۲۷۔	کتاب الحاوی۔I (اردو)	195.00
۲۸۔	کتاب الحاوی۔II (اردو)	190.00
۲۹۔	کتاب الحاوی۔III (اردو)	180.00
۳۰۔	کتاب الحاوی۔IV (اردو)	143.00
۳۱۔	کتاب الحاوی۔V (اردو)	151.00
۳۲۔	کتاب الحاوی۔VI (اردو)	182.00
۳۳۔	کتاب الحاوی ۔VII (اردو)	197.00
۳۴۔	کتاب الحاوی ۔VIII (اردو)	151.00
۳۵۔	کتاب الحاوی ۔IX۔ (اردو)	153.00
۳۶۔	کتاب الحاوی ۔X (اردو)	230.00
۳۷۔	کتاب الحاوی ۔XI (اردو)	....
۳۸۔	کتاب الحاوی ۔XII (اردو)	....
۳۹۔	کتاب الحاوی ۔XIII (اردو)	....
۴۰۔	کتاب الحاوی ۔XIV (اردو)	....
۴۱۔	کتاب الحاوی ۔XV (اردو)	....
۴۲۔	المعالجات البقراطیہ۔I (اردو)	360.00
۴۳۔	المعالجات البقراطیہ۔II (اردو)	270.00
۴۴۔	المعالجات البقراطیہ۔III (اردو)	240.00
۴۵۔	عیون الانباء فی طبقات الاطباء۔I (اردو)	131.00
۴۶۔	عیون الانباء فی طبقات الاطباء۔II (اردو)	143.00
۴۷۔	رسالہ جودیہ (اردو)	109.00
۴۸۔	فزیکو کیمیکل اسٹینڈرڈس آف یونانی فارموليشنز۔I (انگریزی)	34.00
۴۹۔	فزیکو کیمیکل اسٹینڈرڈس آف یونانی فارموليشنز۔II (انگریزی)	50.00
۵۰۔	فزیکو کیمیکل اسٹینڈرڈس آف یونانی فارموليشنز۔III (انگریزی)	107.00
۵۱۔	اسٹینڈرڈائزیشن آف سنگل ڈرگس آف یونانی میڈیسن۔I (انگریزی)	86.00
۵۲۔	اسٹینڈرڈائزیشن آف سنگل ڈرگس آف یونانی میڈیسن۔II (انگریزی)	129.00
۵۳۔	اسٹینڈرڈائزیشن آف سنگل ڈرگس آف یونانی میڈیسن۔III (انگریزی)	188.00
۵۴۔	کیمسٹری آف میڈیسنل پلانٹس۔I (انگریزی)	340.00
۵۵۔	دی کنسپٹ آف برتھ کنٹرول ان یونانی میڈیسن (انگریزی)	131.00
۵۶۔	کنٹری بیوشن ٹو دی یونانی میڈیسنل پلانٹس فرام نارتھ آرکوٹ ڈسٹرکٹ، تامل ناڈو (انگریزی)	143.00
۵۷۔	حکیم اجمل خاں۔ دی ورسٹائل جینیس (مجلد، انگریزی)	71.00
۵۸۔	میڈیسنل پلانٹس آف آندھرا پردیش (انگریزی)	164.00
۵۹۔	پوٹینشل اینٹی ملیریل ہربل ڈرگس فرام ساؤتھ ایسٹرن انڈیا بہار اینڈ اڑیسہ اسٹیٹس (انگریزی)	90.00

ڈاک سے منگوانے کے لیے اپنے آرڈر کے ساتھ کتابوں کی قیمت بذریعہ بینک ڈرافٹ، جو ڈائرکٹر سی۔ سی۔ آر۔ یو۔ ایم، نئی دہلی کے نام بنا ہو، پیشگی روانہ فرمائیں۔ 100.00 سے کم کی کتابوں پر محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔ کتابیں مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کی جاسکتی ہیں:

سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، 65-61، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جنک پوری، نئی دہلی۔ 110058

فون: 5599-831, 852,862,883,897

مانس داس گپتا

خصوصی مطالعہ

ترجمہ: سفیان صوفی

گودھرا، آتش گیر مادّہ اور کمپارٹمنٹ

فارنسک سائنس لیبارٹری (FORENSIC SCIENCE LABORATORY) کی رپورٹ نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے جس کے مطابق گودھرا میں سابرمتی ایکسپریس کے ڈبوں کو جلائے جانے کے واقعے پر حکومت کے "اقلیتی فرقے کی سازش" کے مفروضے پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔

گجرات کانگریس کے صدر امر سنگھ چودھری نے ایک سنسنی خیز بیان میں گودھرا ٹرین قتل عام کے معاملے میں سنگھ پریوار کے سیدھے طور پر ملوث ہونے کا الزام لگایا ہے تاکہ صوبے میں فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلائی جا سکے۔ Forensic Science Laboratory کی رپورٹ کو بنیاد بنا کر امر سنگھ چودھری نے کہا کہ سابرمتی ایکسپریس کے S-6 ڈبے میں آتش گیر مادہ اندر سے انڈیلا گیا تھا۔ یہ رپورٹ مودی حکومت کے اس الزام کی نفی کرتی ہے کہ مقامی مسلمانوں نے ٹرین کے مذکورہ ڈبے کو آگ لگائی تھی۔ گودھرا واقعے کے بعد بھڑکے تشدد میں جس آتش گیر مادے کا استعمال کیا گیا تھا، اسی کا استعمال ڈبے کو نذر آتش کرنے میں بھی کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن شرپسند عناصر نے گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام کیا، ٹرین حادثے کے پیچھے بھی انہی عناصر کا ہاتھ ہے۔ امر سنگھ چودھری نے ان عناصر کی نشاندہی کے لیے تفتیش کی بھی مانگ کی ہے۔

FSL کی تین اوراق پر مشتمل رپورٹ گجراتی زبان میں شائع ہوئی ہے اور یہ رپورٹ اس چارج شیٹ کا حصہ ہے جو گودھرا ریلوے عدالت میں ۲۶ مسلم ملزمین کے خلاف دائر کی گئی ہے جن میں زیادہ تر گودھرا کے نواحی سگنل فالیا علاقے کے رہنے والے ہیں، جہاں سابرمتی ایکسپریس میں ۵۸ لوگ جلا دیے گئے تھے۔ FSL عہدیداروں نے اس رپورٹ پر کسی طرح کا تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ معاملہ ابھی عدالت میں زیر غور ہے۔ صوبائی وزیر برائے کاشتکاری پرشوتم روپالا اس رپورٹ کے باوجود حکومت کے نقطہ نظر میں تبدیلی کو

خارج از امکان قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں آتش گیر مادہ خواہ ڈبے کے اندر سے انڈیلا گیا ہو یا شر پسند عناصر نے ڈبے میں داخل ہو کر انڈیلا ہو اور آگ لگادی ہو یہ مفروضہ اپنی جگہ قائم ہے کہ کارسیوکوں سے بھرے ڈبے میں "گہری سازش" کے تحت آگ لگائی گئی۔ تاہم وشو ہندو پریشد کے ترجمان نے پرشوتم روپالا سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ وشو ہندو پریشد شروع سے ہی کہتی رہی ہے کہ ڈبے میں مقامی مسلمانوں کے ذریعہ اندر سے ہی آتش گیر مادہ پھینکا گیا تھا۔ ترجمان نے کہا کہ ڈبے کے دروازے اور کھڑکیاں پتھراؤ کی وجہ سے بند کردیئے گئے تھے اس لیے آتش گیر مادہ HOSE PIPE سے ڈبے میں انڈیلا گیا اور بعد میں آگ لگادی گئی۔ انہوں نے اس بات سے انکار کیا کہ FSL کی رپورٹ سے کسی نئی حقیقت کا انکشاف ہوسکے گا اور کہا کہ گودھرا اور اس کے بعد کے واقعات کی تفتیش کے۔جی۔ شاہ عدالتی تحقیقاتی کمیشن کے ذریعہ اسی زاویے سے کی جارہی ہے کہ آتش گیر مادہ ڈبے میں اندر سے ڈالا گیا تھا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ مسافر خود ہی آتش گیر مادہ طلب کرکے خود کو بھسم کر ڈالیں گے۔"

چند سبکدوش پولیس آفیسروں کے خیال میں "یہ ممکن ہے۔" ان کا قیاس ہے کہ یہ کام بے قصور مسافروں نے نہیں بلکہ ٹرین میں سفر کرنے والے سازشی شرپسندوں نے کیا ہے جو آتش گیر مادے کے ساتھ سفر کر رہے تھے اور فرقہ وارانہ طور پر حساس گودھرا سے زیادہ مناسب جگہ اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ انہوں نے دروازے اور کھڑکیاں بند کرکے اندر آتش گیر مادہ چھڑک دیا ہوگا اور ایک دروازے کو کھول کر فرار ہوتے وقت آگ لگادی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ FSL کو رپورٹ کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ سو ہندوؤں سے بھرے ڈبے میں جن میں کارسیوک بھی شامل تھے، کوئی مسلمان ڈبے میں داخل ہونے کی ہمت کا مظاہرہ کرے۔ حقیقت کو سامنے لانے کے لیے انہوں نے FSL کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ شروع سے ہی یہ بات مشکوک تھی کہ اس میں مقامی مسلمانوں کا ہاتھ ہے۔ "یہ سیاسی مفاد کے لیے دنگا بھڑکانے کی ہندو انتہا پسندوں کی سوچی سمجھی سازش ہوسکتی ہے۔"

"اب بلی تھیلے سے باہر آچکی ہے اور ۶۲ مسلم ملزموں کے خلاف پولیس کی چارج شیٹ کی FSL کی رپورٹ کے بعد کوئی بنیاد نہیں رہ جاتی۔ زیادہ سے زیادہ انہیں دنگا فساد اور لوٹ مار کے لیے سزا دی جاسکتی ہے، قتل کے لیے نہیں۔"

FSL کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ایس ایم دہیہ کی تیار کردہ رپورٹ جائے وقوع پر ہی

حادثے کی ہر طرح جانچ کرنے کے بعد Final کی گئی ہے۔ اس رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ڈبے کو جلانے کے لیے تقریباً ۶۰ لیٹر آتش گیر مادہ استعمال کیا گیا تھا اور اسے ڈبے کے باہر سے نہیں پھینکا گیا تھا جیسا کہ عام طور پر قیاس کرلیا گیا تھا۔ اگر یہ مادہ زمین سے سات فٹ اونچی کھڑکی سے ڈالا گیا ہوتا تو اس کی اچھی خاصی مقدار زمین پر گری ہوتی جبکہ ایسا نہیں ہے، اور پھر کھڑکی سے نیچے آگ کے اثرات بالکل دکھائی نہیں دیے اور نہ ہی ڈبے کے باہر جبکہ اندر کا حصہ بری طرح جل کر تباہ ہوا۔

الگ الگ زاویوں سے بار بار تجربہ کرنے کے بعد FSL اس نتیجے پر پہنچی کہ "جیسے ہی سیٹ نمبر ۷۲ کے قریب ایک چوڑے منہ والے بڑے سے کنستر میں رکھا ہوا ۶۰ لیٹر آتش گیر مادہ ڈبے میں انڈیلا گیا پورے ڈبے میں آگ لگ گئی۔"

OO

وشوناتھ ترپاٹھی

خصوصی مطالعہ

ترجمہ : نبی احمد

ہندو ہیں ہم سنگھی نہیں

گجرات کے حادثے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں فرقہ واریت کی آندھی چل رہی ہے۔ گجرات کے باہر ملک میں سب سے زیادہ دہلی میں فرقہ واریت مخالف لہر چل رہی ہے۔ لہر سے آندھی تھم نہیں رہی ہے۔ لگتا ہے اب وہاں فساد روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ گجرات کی 'کاریہ شالہ' نے 'بھسماسُر' کو جنم دیا ہے۔ وہاں شانتی مارچ بھی ہوا تو وزیر دفاع کی رہنمائی میں۔ یہ اشارہ ہے اخباروں نے لکھا کہ شانتی مارچ میں فوجی جوان زیادہ مگر شہری عوام کم تھے۔

گاندھی نے ہندستان تقسیم کی مخالفت کی تھی۔ نہرو اور پٹیل نے سوچا تھا کہ ہندستان تقسیم ہونے سے فساد ختم ہو جائیں گے۔ لیکن فرقہ واریت رُکی نہیں، بلکہ بڑھتی ہی گئی۔ آزاد ہندستان میں فرقہ وارانہ فساد گنتی میں زیادہ ہوئے، زیادہ خونریز اور شقی ہوئے۔ زیادہ تعداد میں لوگ شامل اور متاثر ہوئے۔ ایک بات اور ہوئی، نچلے درجے کے جن لوگوں کو عوامی بننا تھا، وہ فرقہ وارانہ تصادم میں شامل ہوئے۔ کہا جاتا تھا کہ ہندستان کے گاؤں میں فرقہ واریت نہیں پنپ سکتی۔ فرقہ وارانہ تصادم میں کسانوں نے حصہ لیا، پولیس نے حصہ لیا۔ ۱۹۸۴ء کے سکھ مخالف فساد میں سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر یما پوری، ترلوک پوری، جہانگیر پوری کے لوگوں نے حصہ لیا۔ بابری مسجد انہدام میں 'اودھ' کے اُن کسانوں نے حصہ لیا جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی لڑائی میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے جنگ کی تھی۔

یہ سب کیسے ہوا؟ آر ایس ایس 'بھاجپا' شیوسینا کا جلال کیسے بڑھا؟ نہرو کے زمانہ کے بعد فرقہ وارانہ فساد کی تعداد اور ہیبت ناکی میں فرق آگیا۔ ہم بڑھے تھے شوسلزم کی طرف اور پھنس گئے فرقہ پرستی میں۔ کیا اس شدید عدم تطابق میں فرقہ واریت مخالف آندولن کے نیتاؤں کی کوئی غلطی یا رول نہیں ہے؟ کیا فرقہ واریت صرف دنگوں کی مخالفت کرنے سے رک جائے گی؟ ہمیں اپنی معرکہ بدلنے اور خود احتسابی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سنگھ پریوار کی یا جہادیوں کی طاقت کیا ہے؟ وہ ماضی اور تہذیب کی بات کیوں کرتے ہیں۔ ماضی اور تہذیب کو ہڑپ لیا ہے سنگھ پریوار نے' اور ہم نے اپنا ماضی' اپنی تہذیب انہیں ایسے دے دی ہے جیسے شوسلزم کے راستے کا کانٹا ہم نے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ حالت یہ ہے کہ وہ نعرہ دیتے ہیں۔ "گرو (فخر) سے کہو ہم ہندو ہیں" اور یہ نعرہ ہماری مخالفت میں جاتا ہے۔ کیا ہم نے یہ کہا کہ اس نعرے پر تمہارا حق نہیں ہے؟ ابھی ٹی وی کے ایک پروگرام میں جاوید اختر نے بہت ٹھیک بات کہی۔ انہوں نے سنگھ پریوار کے ترجمان سے کہا کہ آپ ہندوؤں کے نمائندہ کب سے ہو گئے؟ آپ ہندوؤں کے نہیں آر ایس ایس' وشو ہندو پریشد' بجرنگ دل' شیو سینا کے نمائندے ہیں۔ مخالفت ہم نے نہیں کی۔ ہم مسکرائے' غصہ ہوئے۔ مسکرائے زیادہ اور غصہ کم ہوئے۔ ہم نے کہیں نہ کہیں تسلیم کر لیا کہ ہندو معنی سنگھ پریوار۔ ہم نے ہندو ہونے کی ان کی وضاحت بھی تسلیم کر لی۔ اب سرعام ہندو ہونے کا مطلب ہے ہندو فرقہ واریت۔ یہ ہے فرقہ واریت مخالف ذہنیت۔ بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں۔ جس طرح کٹر ہندو کو کسی دوسری ذات (اچھوت) کے یہاں کھانے پینے کی بنیاد پر ذات سے باہر کر دیتے ہیں' اسی طرح ہم نے شیوا جی' تلک وغیرہ کو باہر کر دیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سیکولرازم خود ایک فرقہ بنتا جا رہا ہے اور عظیم ترین سماج سے کٹتا جا رہا ہے۔ شیوا جی نے مسلم سرداروں یا جاگیرداروں سے کہیں زیادہ ہندو جاگیرداروں سے لڑائیاں کی تھیں۔ تلک میں کچھ روایتی رجحان بھی تھے' لیکن فرقہ پرست نہیں تھے۔ مسلم سیکولر سماج والے بھی سماج سے اسی طرح کٹے ہیں یا نہیں' اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ماضی کو آج کے نظریئے سے دیکھنا ایک بات ہے مگر ماضی کو حال سمجھ کر فیصلہ سنانا تو تاریخ مخالف ہے۔ مذہب کے دو حصے ہوتے ہیں۔ 'عبادت' اور اس کی باطنی روح۔ 'عبادت' مذہب کی باہری شکل ہے اور انسانی ہمدردی اس کی 'باطنی روح' ہے۔ تاریخ مخالف فرقہ وارانہ طاقتیں دھرم کے راستے پر چلنے والی ہوتی ہیں۔ انسانی ہمدردی دھرم کو عالمگیر اور سبھی کے لیے نفع بخش بناتا ہے۔ یہاں ہندو مسلم' سکھ' عیسائی کا بھید مٹ جاتا ہے۔ جھگڑے' مندر مسجد' روزہ' نماز' پوجا' آرتی' داڑھی اور چوٹی کو لے کر ہوتے ہیں۔ بھگتی آندولن کی بات چھوڑ دیجئے۔ آزادی کے آندولن میں مذہب کا قانونی رول رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ زیادہ تر قومی جذبے والے مسلم نیتا روزہ نماز کے پابند اور مذہبی خیال کے تھے۔ مولانا مدنی' مولانا آزاد جیسے نیتا۔ جبکہ مسلم لیگ کے نیتا جناح' لیاقت علی جیسے' جدید رہن سہن کے لوگ تھے۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی' پنڈت مدن موہن مالویہ' بال گنگا دھر تلک' لالہ لاجپت رائے جیسے لوگ خاص طور پر مذہبی خیالات کے تھے۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ مولانا آزاد کے مسلمان اور جناح کے مسلمان میں فرق ہے۔ مدن موہن مالویہ

کے ہندو اور گولوالکر کے ہندو میں فرق ہے۔ مولانا آزاد کا مسلمان پکا مسلمان ہوتے ہوئے بھی کٹر مسلمان نہیں' کیونکہ وہ ہندو مخالف نہیں ہے۔ اسی طرح مالویہ کا ہندو بھی پکا ہندو ہے مگر وہ مسلم مخالف نہیں ہے۔ پنڈت کملاپتی ترپاٹھی چھوا چھوت کرتے تھے۔ پیشانی پر ٹیکا لگاتے تھے۔ کاشی کے پکے برہمن۔ پہلی بار بابری مسجد منہدم کرنے کی ہلچل ہوئی تو اعلان کیا کہ اس دن میں ایودھیا میں رہوں گا۔ پہلے میری لاش گرے گی' تب بابری مسجد پر پہلا ہتھوڑا لگے گا۔ آزادی کا آندولن زیادہ تر اسی ذہنی سطح پر لڑا گیا تھا۔ گاندھی اعلانیہ ہندو تھے۔ سیکولر تو جواہر لال نہرو تھے۔ گوڈسے کی گولی ہندو کو لگی۔ سیکولر کو نہیں۔ کیونکہ ہندو فرقہ وارانہ عناصر کے لیے گاندھی بڑی رکاوٹ تھے۔ گاندھی سے پکے ہندو بدکتے نہیں تھے۔ گاندھی ہندوؤں کو کٹر یا مسلم مخالف نہیں بننے دیتے تھے۔ وہ آر ایس ایس سے مذہبی کٹرپن کی زمین چھین لیتے تھے۔ اللہ ایشور تیرے نام سب کو سمتی دے بھگوان۔ آزاد ہندوستان کے لیے 'مذہب اور فرقہ واریت مخالف آندولن کے لیے ایسا کوئی روایتی گیت اعلانیہ طور پر نہیں ہے۔ یہ گیت پرارتھنا بھی ہے اور نعرہ بھی۔

نئے زمانے کی چیزوں کو زیادہ سائنسی ہونا چاہئے' مابعد جدیدیت کو اور بھی زیادہ ہونا چاہئے۔ پہلے کی روایتی دھند چھٹ جانی چاہئے۔ کیا یہ سائنسی ہے' ہم اندرونی مخالفت نہ دیکھیں اور لوگوں کو اس پار یا اس پار قائم کریں؟ اب رامچندر شکل میں اندرونی مخالفت نہیں دیکھی جاتی ہے۔ انہیں 'برہمن وادی' بتایا جاتا ہے۔ انہوں نے جائیسی' رحیم' نظیر اکبر آبادی پر جس خوبصورتی سے لکھا ہے اس کی قدر و قیمت پر کوئی دباؤ نہیں۔ شہنشاہیت کی جو مخالفت کی ہے' وہ بالکل نظر انداز ہے۔ انہیں آشارام باپو بتایا گیا۔ یہ اندازہ سائنسداں کے لیے غیر جانب دارانہ ہے۔ سوامی دیانند سرسوتی کی خوبی اور خامی کو دیکھنا ایک بات ہے۔ لیکن ان کو پورا رجعت پسند اعلان کر دینا دوسری بات ہے۔ انہوں نے قرآن کی یعنی اسلام کی مخالفت کی' یہ ان کی برائی تھی۔ انہوں نے عورتوں کی تعلیم' بیوہ کی شادی اور ذات پات کی تردید کی' یہ ان کی ترقی پسندی تھی۔ کیا سائنس کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم 'ویدوں' پر کام کرنے کو جرم سمجھیں اور ڈاکٹر رام ولاس شرما کو برہمن وادی اور ہندو اعلان کریں۔ یہ تو سوچئے پھر تلک' ڈانگے' مکتی بودھ اور گرو ہزاری پر ساد دویدی کو سمجھنے کے طریقے کیا ہوں گے۔ مکتی بودھ گاندھی کو نہیں تلک کو پتا کہتے تھے اور مکتی بودھ بھی برہمن تھے۔ ماں کی جھریوں کے ساتھ تلسی داس کی ہمدردی یاد آتی تھی۔ شیواجی کو بہادر زمانہ کہتے تھے۔ نرالا نے "شاسن کرتے ہیں مسلمان" لکھا ہے تو یہ فرقہ وارانہ ہوا۔ مکتی بودھ کی یہ بھول یا غلطی تھی کہ انہوں نے سولہ آنا مسلم حکمراں سلطان کے دربار کا نقشہ کھینچا ہے۔ تو یہ سب برہمن وادی فرقہ پرست ہوں گے۔

مجنوں گورکھپوری نے اقبال پر ایک چھوٹی سی تنقیدی کتاب لکھی ہے۔ لکھا ہے کہ اقبال قومیت کی حدود پار کرتے ہوئے 'پین اسلام' میں پہنچے ہیں۔ وہ مرد آفاقی کی تلاش کرتے ہیں۔ لیکن ان کا مرد مومن مسلم ہی رہتا ہے۔ وہ بڑے شاعر ہیں۔ لیکن کہیں کہیں بعض اوقات نہایت اوچھے شاعر بھی معلوم پڑتے ہیں۔ ہمیں مجنوں گورکھپوری جیسے بڑے ادیبوں کی قدر کرنا سیکھنا چاہئے۔ لیکن ہندی اردو کی ایکتا کی بات پہلے کے رجعت پسند ادیب پریم چند' عبدالعلیم' فراق گورکھپوری' سجاد ظہیر' رام ولاس شرما کرتے تھے اب وہ صرف 'دو زبانیں' مانی جاتی ہیں۔

ہندو کٹر پنتھی فاشسٹ ہیں۔ لیکن ان سے خطرہ صرف اسلام کو نہیں ہے۔ ان سے خطرہ بودھیوں' جینیوں' سکھوں' عیسائیوں کو ہی نہیں ہندوؤں کو بھی ہے۔ ہندو فرقہ پرست مخالفوں کو چاہئے کہ آر ایس ایس' بجرنگ دلیوں' وشو ہندو پریشدیوں کو غیر ہندو مشہور کردیں۔ لیکن ایسا وہ خود ہندو رہ کر ہی کر سکتے ہیں۔ اگر آپ ہندو' 'ہندتو' کو کٹرپن کا مترادف مانتے ہیں تب انہیں کی جماعت بڑھے گی۔

ہم آزادی کے بعد ہندوستان میں شوسلزم' آزاد مذہب اور مذہبی اکثریت کو آندولن نہیں بناپائے ہیں۔ ہم نے عوام کے بیچ جاکر کام کرنے کے بجائے صدر دفتر کے بل پر شوسلزم اور سیکولرازم کو لانے کی کوشش کی۔ چونکانے والا مضمون لکھ کر 'سیمناروں' میں بہترین ظاہر کر اور منچ پر چمک کر۔ کیونکہ اب اس کا راستہ ہمارے لیے کھلا ہے۔ جیسے زیادہ پیسے والا خاص طور سے پیسہ استعمال کرکے اپنے سے عوام کو الگ کرتا ہے۔ ویسے ہی غیر مستعد ذہن والے چمک دمک دکھاکر اپنے کو دوسروں سے الگ کرلیتے ہیں۔ یہ جو حلقہ ادب میں جدت کی اتنی چہچہاہٹ ہے۔ ذاتی بندشوں اور غائب ہو جانے سے اتنی بیزاری اسی وجہ سے ہے۔ اس چمک سے دولت اور شہرت دونوں ملتی ہیں۔ اب گنیش شنکر ودیارتھی کی نسل نہیں ہے۔ جدت بگھارنے میں آگے اور تیاگ میں پیچھے۔ فرقہ واریت مخالفت حب الوطنی کی اندرونی وسعت ہے۔ دیش' دیش پریم' دیش بھکتی کی بات بھی نئی نہیں' جدید تو بالکل نہیں۔ دیش بھکتی اور دیش پریم بھی سنگھ پریوار نے ہڑپ لیا ہے۔ ہم اس سے نجات پاکر نئے زمانے میں مسرور ضرور ہیں۔ نتیجتاً وہ دیش بھکت مانے جاتے ہیں اور ہم ملک نجات یافتہ۔ انہوں نے پچھلے پچاس برسوں سے زیادہ وقت میں دور دور اپنے مشتہر بھیجے ہیں۔ خاندانی فلاح کے لیے تعلیمی منصوبے چلائے ہیں۔ غیر ملک میں قائم ہندوؤں کو فرقہ وارانہ ڈور میں باندھا ہے۔ سرسوتی ششو مندر کھولے ہیں۔ ڈاکٹر لوہیا کا تلسی میلہ ہڑپ لیا اور چترکوٹ میں اپنی یونیورسٹی کھولی ہے۔ دکن میں کنیا کماری میں 'وویکانند اسمارک' بنوالیا ہے۔ بائیں بازو اور فرقہ واریت مخالف لوگوں نے جس چیز کی سب سے زیادہ غفلت برتی ہے' وہ

ہے اپنی زبان اور تہذیبی مورچے کی۔ طرح طرح کے لوگوں کا یقین 'طرز زندگی سمجھ کر ان کے سلسلے میں تہذیبی آندولن چھیڑنے اور سیاست کرنے کی۔

یہ تہذیبی اور سیاسی آندولن آزاد بیوپار اور نئی سرمایہ پالیسی کی مخالفت کرے گا۔ مکتی آزادی کی قیمت ہے۔ لیکن بازار' آزاد بیوپار 'غیر تہذیبی' جھوٹ وغیرہ کے ذرائع ہیں۔ آزاد خیالی کے نام پر آپ دوردرشن کے سیریل اور فلمیں دیکھیے۔ وہ عصمت دری اور خون خرابہ کے نئے نئے طریقے اور گرپیش کرتے ہیں۔ ہمارا مشہور اداکار گنگا کنارے کا چھورا 'کوکا کولا' کی دلالی کرتا ہے۔ کیسا دیش' کیسی بھکتی۔ آپ گجرات کے دنگوں میں عصمت دری' آگ زنی اور قتل کے جو منظر دیکھتے ہیں' وہ ٹی وی پر بھی ہیں اور فلموں میں بھی۔ عصمت دری' قتل اور آگ زنی کے منظر پیسے اُگلتے ہیں۔ اس لیے انہیں دکھایا جائے گا۔ فرقہ واریت' خون ریزی اور عصمت دری یہ سب ایک دوسرے کے مساوی ہیں اور ان کو حوصلہ دینے والے ہیں نئی شہنشاہیت یا 'سامراجیہ واد'۔ اس لیے ہمارے تہذیبی سیاسی آندولن کا انحصار نئے 'سامراجیہ واد' کی مخالفت ہوگی۔ حب الوطنی' ہندو مسلم ایکتا' فرقہ واریت مخالفت اس کے اجزائے ترکیبی ہونے چاہئیں۔ ○○

ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی

خصوصی مطالعہ

بھیڑوں کی المیہ داستان

برسہا برس گزرے کہ چہار درویش اپنی اپنی آپ بیتی سنا کر چلے گئے اور راویان معتبر قرار پائے۔ بارے اب پانچواں درویش آیا ہے اور آپ بیتی کے بجائے جگ بیتی لایا ہے۔ ایک زبردست قوم کے عروج و زوال کی کہانی ایک دردمند کی زبانی چشم عبرت کو وا کر کے سنئے اور کف افسوس ملئے۔

قصہ ایک وسیع و عریض اور قدیم جنگل کا ہے' جہاں آج بھی تہذیب و تمدن' جمہوریت' آزادی و مساوات' عدل و انصاف اور حفاظت حقوق کے بلند بانگ دعووں کے باوجود جنگل راج ہی چل رہا ہے۔ 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کا بنیادی اور فطری اصول پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ ہر زبردست زیردست کو دبا رہا ہے اور اس میں رنگ و نسل' مذہب و زبان کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ ہر طرف گھپلوں اور گھوٹالوں کی بھرمار ہے' مکر و فریب کا کاروبار ہے' کمزور اور غریب مجبور و بے بس و لاچار ہے' زندگی سے بیزار ہے۔

اس جنگل میں طرح طرح کے جاندار' مختلف مذاہب اور تہذیب و تمدن کے علمبردار' مختلف نسلوں' ذاتوں اور برادریوں کے شہ سوار بود و باش رکھتے ہیں۔

ہزاروں سال پہلے یہاں بھیڑیئے فاتحانہ انداز سے داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنی فطری خوں خواری اور خوں آشامی کو بروئے کار لاتے ہوئے یہاں کے قدیم جانداروں کو مار بھگایا۔ کچھ مارے گئے' کچھ گھنے جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپے اور کچھ خوئے غلامی میں پختہ تر کر دیئے گئے۔ انہیں یقین دلایا گیا کہ پیدا کرنے والے نے انہیں اپنے پیروں سے پیدا کیا ہے' اس لیے وہ فطری طور پر ذلیل ہیں اور صرف خدمت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس یقین نے انہیں تقدیر پر صابر و شاکر بنا دیا اور ہر قسم کا ظلم و ستم اور استحصال برداشت کرنے پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ اسی حال پر صدیاں گزر گئیں۔ استحصال کرنے والے اسے اپنا حق اور فطری عمل سمجھتے رہے اور استحصال کا شکار ہونے والے اسے اپنا مقدر مان کر برداشت کرتے رہے۔

پھر یوں ہوا کہ تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار سال پہلے بھیڑیں ایک بڑی طاقت بن کر ابھریں۔ ان میں شیروں کی سی بہادری اور چیتوں کی چستی اور تیزی پیدا ہو گئی۔ وہ دنیا کے ہر جنگل میں پہنچیں اور فاتحانہ پہنچیں۔ انہوں نے ہر میدان میں فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑے لیکن یہ فاتح جلدی ہی مختلف تہذیبوں سے مغلوب ہو گئے۔

بھیڑیوں کے اس جنگل میں بھی بھیڑیں داخل تو فاتحانہ ہی ہوئی تھیں اور تقریباً ہزار آٹھ سو سال تک حکمراں بھی رہیں لیکن یہاں بھی تہذیبی مغلوبیت عیش و آرام بلکہ عیاشی نے انہیں کمزور سے کمزور تر کر دیا۔ انہوں نے اپنے ہزار آٹھ سو سالہ دور حکمرانی میں نہ تو اپنی طاقت بڑھانے کی کوشش کی اور نہ ہی تعداد۔ نتیجہ یہ کہ بھیڑیوں کے مقابلہ میں ان کی تعداد کبھی بھی ایک چوتھائی سے زیادہ نہ ہو سکی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بھیڑوں کے اثر و اقتدار کے کمزور ہونے پر بھیڑیے اپنی گمشدہ قوت اور اقتدار کو دوبارہ حاصل کرتے اور وہ اس کے لیے کوشاں بھی تھے، لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی دوران دور دراز کے ایک جنگل سے کچھ سفیدے آگئے جن میں بھیڑیوں کی خوں آشامی تو تھی ہی، لومڑی کی عیاری و مکاری بھی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ وہ مقامی باشندوں میں اپنے ہم نوا پیدا کرنے اور مقامی بھیڑیوں اور بھیڑیوں کی داخلی کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے میں بھی بڑے مشاق تھے۔ نتیجتاً کامیابی و کامرانی نے ان کے قدم چومے۔ انہوں نے بھیڑیوں اور بھیڑوں کو خوب لڑایا، ان کے اختلافات کو بھڑکایا۔ بھیڑوں کو اس لیے کچلا اور دبایا کہ اقتدار انہیں سے چھینا تھا اور ان میں اب بھی بوئے حکمرانی باقی تھی۔ ابتدا میں تو بھیڑیوں کو بھی اس لیے دبایا کہ وہ اپنے اقتدار کے لیے کوشاں تھے لیکن جلد ہی انہیں گلے سے لگایا کہ رنگ کے فرق کے باوجود انداز بھیڑیائی تو مشترک تھا۔ اب بھیڑیں چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پھنس کر پسنے لگیں۔

اے دوستو! پھر ایک بار وقت نے پلٹا کھایا۔ مقامی بھیڑیوں نے سفیدوں کے علوم و فنون، زبان، رسم و رواج، طور طریقے اور انداز حکمرانی سیکھنے کے بعد ان سے مقابلہ شروع کر دیا اور انہیں کمزور کر کے مار بھگانے کی ٹھان لی۔ یہی طریقہ تو وہ پہلے بھیڑوں کے مقابلے میں بھی اپنا چکے تھے لیکن دونوں میں فرق یہ تھا کہ بھیڑیں تو اپنا قدیم وطن بھلا چکی تھیں، وہ کہیں جانے کو آمادہ نہ تھیں بلکہ یہیں رہنے اور لڑنے مرنے پر بضد تھیں جبکہ سفیدوں نے نہ صرف اپنے قدیم وطن سے تعلق برقرار رکھا تھا بلکہ ان کے تمام اقدام اپنے اصل وطن کی فلاح و بہبود کے لیے ہی ہوتے تھے۔ وہ اس جنگل کو اجاڑتے اور اپنے گھر کو سجاتے تھے۔ جب انہوں نے جنگل کی ہوا اپنے ناموافق دیکھی تو یہی بہتر سمجھا کہ اپنا بوریہ بستر باندھ کر اپنے پورے جھنڈ کے ساتھ یہاں سے روانہ

ہو جائیں اور یہی انہوں نے کیا بھی۔

راویانِ معتبر کا بیان ہے کہ جب بھیڑیوں نے سفیدوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور انہیں اکھاڑ پھینکنے کا عزم مصمم کیا تو بھیڑوں کو بھی اپنے ساتھ ملالیا' انہیں سمجھایا کہ "ہم تو قدیم زمانے سے یہاں بود و باش رکھتے ہیں۔ جو کماتے ہیں یہیں لگاتے ہیں لیکن ان سفیدوں کو دیکھو کہ کھاتے یہاں کا ہیں اور گاتے وہاں کا ہیں۔ ہمارا گھر اجاڑتے ہیں اور اپنا بناتے ہیں۔ یہ تو ہم دونوں کے مشترکہ دشمن ہیں' کیوں نہ ہم دونوں کی مشترکہ کاوشیں ان سے نجات پانے میں لگیں۔ ان سے نجات پانے کے بعد ہم دونوں دل جمعی سے حکومت کریں گے اور عیش و آرام اٹھائیں گے۔ ان کو نکالنے کے بعد ہم دونوں مل کر یہاں جمہوری حکومت قائم کریں گے۔ سب کو آزادی' مساوات اور برابری کے حقوق حاصل ہوں گے' کوئی چھوٹا بڑا نہ ہوگا' جنگل میں گھی دودھ کی ندیاں بہیں گی۔ بھیڑ اور بھیڑئے ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے۔ ہماری قدیم لڑائی ختم ہو جائے گی۔ ہم سب شیر و شکر ہوں گے۔ مل کر ایک قوم بنیں گے۔ ہماری دیسی سنسکرتی ہوگی اور دیسی انداز۔ آؤ ہم سب مل کر کریں اس سپنے کو ساکار۔"

بھیڑوں کی ناعاقبت اندیشی اور بھیڑ اچال تو ضرب المثل ہے۔ وہ ان چکنی چپڑی باتوں میں آگئیں۔ نتائج و عواقب سے بے بہرہ ہو گئیں۔ بھیڑیوں نے اپنے مقاصد کی بجا آوری کے لیے جو دام ہم رنگِ زمین بچھایا اس میں بآسانی پھنس گئیں۔

بھیڑیوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک مضبوط جماعت کی تشکیل کی جس میں بھیڑوں کو بھی شامل کیا۔ بھیڑیوں نے تو ہر موقع پر عاقبت اندیشی' ضبط و تحمل اور ذہانت و فطانت کا دامن تھامے رکھا اور سفیدوں کے خلاف جو بھی قدم اٹھایا' بہت ہی سوچ سمجھ کر اور نتائج و عواقب کو دھیان میں رکھ کر اٹھایا لیکن بھیڑوں نے حماقت و ناعاقبت اندیشی کی تمام سنتیں تازہ کر دیں۔ جوش و جذبات سے مغلوب ہو کر ہر وہ کام کیا جو بالآخر ان کی تباہی و بربادی پر منتج ہوا۔

صاحبو! بھیڑیں آزادی و مساوات کے سنہری خواب سجائے ہر قسم کی قربانیاں پیش کر رہی تھیں اور بدلے میں سفیدوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہی تھیں۔ ایسے میں ناعاقبت اندیش بھیڑوں کی بھیڑ میں چند بھیڑوں نے ایک نیا راگ گایا اور قوم کو سمجھایا کہ تم جس آزادی اور جمہوریت و مساوات کے خواب دیکھ رہی ہو وہ سراب سے کم نہیں' اس کی تعبیر کبھی نہ پاؤ گی بعد میں پچھتاؤ گی اور ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی۔

"جمہوریت تو اکثریت کی حکومت ہوتی ہے اور اکثریت بھیڑیوں کی ہے۔ حکومت ہو گی تو اُن کی' آزادی ملے گی تو انہیں' تم کیا پاؤ گی؟ ایک کی غلامی سے نکل کر دوسرے کی غلامی

میں آ جاؤ گی' دوسرے درجہ کی شہری بن جاؤ گی' ان کے رحم و کرم پر وقت بتاؤ گی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اپنے حقوق کا تحفظ کرالو اور یہ نہ ہو تو اپنا حصہ الگ کرالو۔"

بھیڑیوں کو ذرا بھی یہ بات راس نہ آئی بلکہ کباب میں ہڈی نظر آئی۔ اس کی بدولت اپنی بچھائی ہوئی بساط ہی الٹتی نظر آئی۔ بس انہوں نے اس کے خلاف سخت واویلا مچایا۔ اسے ملک و قوم سے غداری بتایا۔ سفیدوں کی عیاری اور 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی پالیسی قرار دیا۔ بھیڑوں میں سے زر خرید غلاموں کو اس کے دفاع کا ذمہ دار بنایا۔ بھیڑوں کے جگادڑی مولویوں کو اس کام پر لگایا کہ وہ شہر شہر' نگر نگر' ڈگر ڈگر گھوم کر اس خیال کو خام کریں۔ منطق اور مذہب کے زور پر اسے ناکام کریں۔ تنخواہ دار جگادڑی مولوی جو ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں' اس کام میں جٹ گئے اور حق نمک ادا کر کے رہے۔ ایک منطقی اور چرب زبان نے بھیڑوں کو سمجھایا کہ دیکھو' تم اس وقت چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہی ہو' جس میں اوپر کا پاٹ یہ سفیدے ہیں اور نیچے کا بھیڑیئے۔ اب اگر تم بھیڑیوں کی مدد سے اوپر کا پاٹ اکھاڑ پھینکو تو تم اوپر ہو جاؤ گی اور بھیڑیوں کو ایک بار پھر دبا کر رکھ سکو گی"۔

اس پر اس منطقی کی خوب واہ واہی ہوئی۔ سبحان اللہ' ماشاء اللہ کے ڈونگرے برسائے گئے۔ قوم کی اکثریت اس نکتہ پر جھوم جھوم گئی۔ اپنی خیالی برتری کے تصور سے مست و بے خود ہو گئی اور اسی بے خودی میں بھیڑیوں کی دست و بازو بن گئی۔ منطقی مولوی نے حق نمک ادا کر دیا۔ اس لیے کیوں نہ انعام و اکرام کا مستحق قرار پاتا۔

لیکن ان سر توڑ کوششوں کے باوجود دانا بھیڑوں کی آواز کو دبایا نہ جا سکا۔ ان کے ہم نواؤں کی تعداد بڑھتی گئی' یہاں تک کہ سفیدوں نے بھی اسے اپنے لیے مفید سمجھا۔ بھیڑیوں سے بدلہ لینے کا ذریعہ جانا۔ اس آواز کو خدا لگتی مانا اور اس کی حوصلہ افزائی کو ضروری جانا۔

غرض بہت کچھ قیل و قال' نالہ و فریاد' جنگ و جدال اور جہد و عمل کے بعد بالآخر سفیدوں نے رخت سفر باندھا' لیکن چلتے چلتے جنگل کا بٹوارہ کر کے ایک حصہ دانا بھیڑوں کے حوالے کیا اور ایک حصہ کو دونوں کے درمیان ایسا وجہ نزاع بنایا کہ ہمیشہ لڑتے اور مرتے رہیں۔

بڑا حصہ بھیڑیوں کے ہاتھ تو آیا لیکن اس حصہ میں بھی بھیڑوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ان کی آبادیاں جنگل کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ انقلاب بڑا مہنگا' بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں بھیڑیں اور بھیڑیئے نقل مکانی کر کے جنگل کے ایک حصے سے دوسرے میں منتقل ہوئے۔ قتل و غارتگری کرتے ہوئے' آگ لگاتے ہوئے' ماؤں کے دامان عصمت کو تار تار کرتے ہوئے' بچوں' بوڑھوں کو تہ تیغ کرتے ہوئے' نفرت اور دشمنی کی صدا بہار فصل اگاتے ہوئے۔

صاحبو! اب داستان کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ سفیدوں کے انخلاء کے بعد جنگل پر بھیڑیوں کی حکومت کا دور شروع ہوا۔ انہوں نے سیاست اور ڈپلومیسی اپنے استاد سفیدوں سے سیکھی تھی۔ بغل میں چھری اور منہ میں رام کا اصول توان کا خانہ زاد تھا۔ قول و عمل میں تضاد کا گر ان سے سیکھا۔ بظاہر ایک آئین بنایا' جمہوری حکومت قائم کی' عدل وانصاف' آزادی و مساوات' سب کے یکساں حقوق' مذہبی و لسانی اور تہذیبی آزادی وغیرہ وغیرہ۔ جس قدر خوشنما اور دل فریب نعرے ہو سکتے تھے' وہ لگائے۔ بظاہر اپنے مہذب ہونے کا یقین دلایا لیکن عملاً جنگل میں جنگل راج ہی رہا۔ 'مائٹ از رائٹ' کا اصول ہی کار فرمارہا۔ خصوصاً بھیڑوں کا قافیہ تنگ کرنے کے لیے وہ تمام اقدامات کیے گئے جو ممکن ہو سکتے تھے۔ ان کی تہذیب و تمدن' علوم و فنون' زبان اور مذہب کو مٹانے کی سعی بلیغ کی گئی۔ ان پر روزگار کے دروازے بند کر دیے گئے۔ ان کی عبادت گاہوں کو ڈھایا گیا اور ان کے آثار کو مٹایا گیا۔

اس سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا عرصہ حیات ہی تنگ کر دیا گیا۔ ان کے خلاف قتل و غارت گری کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ انہیں کچلنے اور مٹانے کے لیے وردی دھاری' نیکر دھاری اور ترشول دھاریوں کا ایک مثلث قائم کیا گیا۔ جن کا مقصد حیات ہی بھیڑوں کا شکار کرنا اور انہیں تاراج کرنا تھا۔ یوں دکھانے کے لیے اور اپنے نعروں کی لاج رکھنے کے لیے حکومت کے چند عہدے زر خرید اور ذہنی غلام بھیڑوں کے حصے میں بھی آتے رہے اور وہ 'شو بوائے' بنائی جاتی رہیں۔

ظلم و ستم اور قتل و غارت گری کی یہ کہانی بڑی دردناک' بڑی دلدوز اور بڑی جگر پاش ہے۔ ہر جگہ خوں آشامی کی ایک نئی تاریخ رقم کی گئی۔ ہزاروں واقعات ہیں۔ کہاں تک سنایئے اور کہاں تک لکھیے۔ سن کر اور پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ آنکھوں سے جوئے خوں رواں ہوتی ہے۔ چنگیز' ہلاکو اور ہٹلر کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ بطور نمونہ چند واقعات سن لیجیے۔

ایک بستی میں جبکہ بھیڑیں یکجا ہو کر اپنا تیوہار منا رہی تھیں کہ یکایک ان پر وردی دھاری ٹوٹ پڑے۔ جی بھر کے مارا' جان و مال کو نذر آتش کیا اور تباہی و بربادی کی ایک داستان رقم کر دی۔

اسی طرح ایک بستی سے وردی دھاریوں نے جوان بھیڑوں کو پکڑا اور دور لے جا کر مارا اور پانی میں بہا دیا۔ اس ظلم و ستم کے ساتھ پوری بستی پر قیامت توڑی۔ نر' مادہ بچے' بوڑھے اور جوان سب ان کا شکار ہوئے۔

ایک بستی میں قتل عام کے بعد ان سب کو کھیتوں میں بو دیا گیا اور اس پر سبزیاں بھی

اُگادی گئیں۔ ایک بستی میں مادہ بھیڑوں کو عریاں کر کے ان کا جلوس نکالا گیا اور مصوری کا نادر نمونہ بنانے کے لیے اس کی تصویر کشی بھی کی گئی۔

تازہ ترین اور سب سے بڑا ظلم و ستم، قتل عام بلکہ نسل کشی جنگل کے ایک کونے میں روا رکھی گئی ہے۔ یہ ایسا بھیانک واقعہ ہے جس کی صدائے بازگشت نہ صرف پورے جنگل میں گونجی بلکہ دور دور کے جنگل اس سے ہل گئے، دہل گئے۔ اس کے خلاف آوازیں اٹھانے لگے۔ خود بھیڑیوں میں سے بھی بہتوں نے اسے بُرا جانا، ظلم و ستم ہی گردانا، نسل کشی ہی مانا۔

یہ ظلم و ستم اور قتل و غارت گری اس نوعیت کی تھی کہ تمام جاندار اس سے شرمسار ہوئے، بیزار ہوئے۔ اس ظلم و ستم کی داستان ہے بھی بڑی خونچکاں۔ پوری پوری بستیاں نذر آتش کر دی گئیں، بھیڑوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان کے گلوں میں جلتے ہوئے ٹائر ڈال کر رقص بسمل کا لطف اٹھایا گیا۔ مادہ بھیڑوں کو قطار در قطار کھڑا کر کے انہیں جنسی بھوک کے مارے ہوئے بھیڑیوں کے حوالے کر دیا گیا جنہوں نے سرعام ان کے دامن عصمت کو تار تار کیا، انہیں نوچا، بھنبھوڑا اور جی بھرنے پر تہہ تیغ کر دیا یا نذر آتش کر دیا۔ ایک مادہ بھیڑ جو جلد ہی بچہ جننے والی تھی نوک شمشیر سے اس کے پیٹ کو چاک کیا گیا۔ اس وجود کو جس نے ابھی دنیا بھی نہ دیکھی تھی نوک شمشیر پر نچا کر لطف لیا گیا اور پھر نذر آتش کر دیا گیا۔ ہزاروں ہزار پر تیر، تبر، تلوار، خنجر، بھالے اور ترشول آزمائے گئے۔ غرض وہ کون سا ظلم و ستم تھا جس کی آزمائش نہ کی گئی ہو، جو بروئے کار نہ لایا گیا ہو۔

یہ چیدہ چیدہ واقعات تھے ورنہ تو پورا جنگل خانہ جنگی کا منظر پیش کرتا رہتا ہے۔ بھیڑ اور بھیڑیوں کی یہ لڑائی کسی طرح بھی مقابلہ کی لڑائی نہیں۔ بھیڑیں تو اپنا دفاع کرنے سے بھی معذور ہیں جبکہ بھیڑیے ہر جگہ جارح اور حملہ آور ہوتے ہیں۔ انہیں ہر طرف سے پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ حمایت ملتی ہے۔ پھر ان کے حوصلے کیوں نہ بلند ہوں؟ ان کے جارحانہ عزائم کیوں نہ پروان چڑھیں؟ ان کی درندگی اور خوں آشامی میں کیوں نہ اضافہ ہو؟ انہیں کسی کا ڈر کیوں ہو؟

یہ ہے وہ داستان جسے پھیلایا جاتا تو الف لیلیٰ بن جاتی اور ہزار راتوں تک سنائی جاتی لیکن اب کسے فرصت کہ یہ طویل داستان سنے۔ دور انتشار میں اختصار ہی لازمی ہے اس لیے دریا کو نہیں سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے۔ اشاروں سے کام لیا ہے کہ عقلمند کو اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

اور ہاں آخری اور ضروری بات اور سن لیجیے اور داستان گو کو اجازت دیجیے۔

جہاں بھیڑیوں کی جارحیت اور ظلم و ستم بے پناہ اور بے مثال ہیں، وہیں بھیڑوں کی بے حسی، بے بسی، اپنے دفاع سے غفلت، عیش کوشی اور لاپرواہی بھی قابل داد اور بے مثال ہے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ کٹ مریں گے مگر اپنے داخلی انتشار و افتراق کو ہاتھ سے جانے نہ دیں

گے۔ اتحاد و اتفاق کی ہر کوشش کو ناکام کریں گے۔ دنیاوی ترقی اور خوش حالی کے ہر نسخے کو نظر انداز کریں گے اور اجتماعی خودکشی کر کے دشمنوں کے ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

سامعین! با تمکین! عجب نہیں کہ جلد وہ دن آجائے گا کہ جب جنگل سے بھیڑوں کی نسل کا مکمل خاتمہ عمل میں آجائے اور بھیڑیوں کا مطمع نظر اور خاندانی مقصد پورا ہو۔ اسی خوف اور اسی انتباہ پر یہ داستان مکمل ہوتی ہے۔ جب کبھی چھٹا درویش آئے گا تو اس داستان کو آگے بڑھائے گا۔ جنگل کی تاریخ کو مکمل کرے گا۔ بھیڑوں کا انجام بتائے گا......

اللہ بس باقی ہوس۔

OO

اِبّار رَبّی

خصوصی مطالعہ

ترجمہ : سفیان صوفی

حُسین ورما اور فاشسٹ

گذشتہ دس مئی کو نیوز ایجنسی **بھاشا** کی خبر "حسین کی گرفتاری کے لیے پولیس دستہ ممبئی جائے گا" شائع ہوئی۔ دتیہ (مدھیہ پردیش) سے دی گئی خبر یوں ہے:

"دتیہ پولیس کا ایک دستہ معروف پینٹر مقبول فدا حسین کو گرفتار کرنے کے لیے ممبئی روانہ ہوگا۔ پولیس کمشنر روی گپتا نے بتایا کہ حسین کے خلاف دتیہ کی ایک عدالت نے گرفتاری وارنٹ جاری کیا ہے۔ ۱۹۹۶ء میں دنیش دانگی نے دتیہ کے First Magistrate کی عدالت میں ایک استغاثہ پیش کر کے رسالوں میں دیوی دیوتاؤں کی بے ہودہ تصویریں بنانے کے لیے حسین کے خلاف کارروائی کیے جانے کی مانگ کی تھی"۔

— **بھاشا**

جلتے ہوئے گجرات کے ماحول میں دوبارہ حسین کو لے کر خبریں آنا اسی سلسلے کی کڑی ہے جب دلیپ کمار اور دیپا مہتہ پر بنیاد پرستوں نے حملے کیے۔ حسین اور جتن داس کی گیلریوں میں توڑ پھوڑ کی گئی۔ ان کی بنائی تصویریں جلائی گئیں۔ گجرات میں ہی عیسائیوں پر حملے ہوئے اور اڑیسہ میں پادری اسٹیفن کو زندہ بھسم کیا گیا۔ اسی لمبی تحریک کا نتیجہ ہے آج گجرات میں مسلمانوں کو زندہ جلادینے کا سنگھی کارنامہ۔

بیسویں صدی کے عظیم مصور حسین کے خلاف بنیاد پرستوں نے صدی کی اواخر دہائیوں میں مخالفت کی مہم چلائی۔ اسی طرح کی مخالفت انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے پہلے جدید مصور روی ورما کو بھی بنیاد پرستوں کی جانب سے جھیلنا پڑی تھی۔ حسین کی طرح ان پر بھی فحاشی اور دیوی دیوتاؤں کی توہین کے الزامات لگے تھے۔ روی ورما ہندو تھے، حسین مسلمان ہیں۔ دونوں بیسویں صدی کے اوّل اور آخر میں اور تاریخ کو بدل دینے والے فنکار ہیں۔

راجہ روی ورما کی پیدائش ۲۹ راپریل ۱۸۴۸ء کو کلیمانور (کیرل) میں ہوئی۔ وہ نمبودری برہمن تھے۔ والد نیل کانتن ویدوں کے بہت بڑے عالم اور سنسکرت کے پنڈت تھے۔

روی کی ماں اوما امبابائی کو موسیقی سے خاصہ شغف تھا۔ روی ورما سے پہلے ہندوستانی مصوری میں اجنتا ایلورا اور Miniature Paintings تھیں۔ قدیم اور وسطی زمانوں سے نکال کر ہندوستانی مصوری کو جدید عہد میں لانے کا سہرا روی ورما کے سر ہے۔ انہوں نے یوروپ کی حقیقت پسندانہ روش کو اپنایا۔ ہندوستانی مصوری میں ان کا مقام وہی ہے جو ہندی ادب میں بھارتیندو ہریش چندر اور روسی ادب میں پشکن کا ہے۔ انہوں نے Perspective کے اصولوں سے ہندوستانی فنونِ لطیفہ کو پہلی بار روشناس کرایا۔ ۱۸۷۳ء میں Viena (آسٹریا) کی بین الاقوامی مصوری کی نمائش میں اُن کو نوازا گیا۔ شکاگو کی نمائش میں بھی روی ورما کو اعزاز دیا گیا۔ یہ نمائش وویکانند نے شکاگو میں دیکھی تھی۔ ہندوستان لوٹنے پر وویکانند ان سے ملنے بھی گئے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں انہیں 'قیصرِ ہند' کا خطاب عطا کیا گیا۔ وہ پہلے مصور تھے جنہیں 'راجہ' کا خطاب ملا۔ ۲اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ان کی وفات ہوئی۔

ان کی جن چار تصویروں کو لے کر ہنگامے ہوئے' ان میں پہلی تصویر شری کرشن اور بلرام (میسور آرٹ گیلری) ہے۔ تصویر میں دیوکی کرشن کو پیار کر رہی ہیں۔ ان کے جسم پر صرف ساڑی ہے بلاؤز نہیں۔ ان کے شانے اور کمر عریاں ہیں۔ دوسری تصویر شکنتلا (تریویندرم آرٹ گیلری) ہے۔ شکنتلا پاؤں سے کانٹا نکال رہی ہے۔ آگے کی طرف دو سکھیاں ہیں۔ دونوں کی پیٹھ اور کمر ننگی ہے صرف چولی کی پٹی نظر آرہی ہے۔

دوسری دو تصویریں **اندرجیت کی وجے** اور **ماں اور بچہ** کو لے کر کافی تنازعہ ہوا۔ اندرجیت کی وجے (آرٹ گیلری میسور) میں راون کا دربار لگا ہے۔ بیٹا اندر کو ہرا کر آیا ہے اور اس کی اپسرا اپنے باپ کو پیش کر رہا ہے۔ اپسرا کے جسم پر صرف ساڑی ہے' جس سے وہ چھاتی ڈھک رہی ہے۔ کمر کے اوپر کوئی لباس نہیں ہے۔ ایک خادم اسے پکڑ رہا ہے۔ اپسرا کی چھاتیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ چوتھی تصور **ماں اور بچہ** میں عورت کی دونوں چھاتیاں کھلی ہیں۔ آنکھیں بند کئے بچہ دودھ پی رہا ہے۔

ان تصویروں پر وید شیرومنی چتامنی شاستری نے "برہم گیان منڈل" کی جانب سے مقدمہ دائر کر دیا۔ روی ورما کے خلاف الزام تھا کہ انہوں نے ہندو دیوی دیوتاؤں کو گھر گھر پہنچا کر ان کے تقدس کو برباد کیا ہے۔ روی ورما نے ہی ہندوستان میں سب سے پہلے پوسٹر چھاپ کر دیوی دیوتاؤں کو گھر گھر میں پہنچایا تھا۔ اس سے پہلے چھپی ہوئی تصویریں گھروں میں نہیں ہوتی تھیں۔ ۱۸۹۴ء میں انہوں نے خود Lethogarph سے چھپائی شروع کی۔

دوسرا الزام تھا کہ انہوں نے دیوی دیوتاؤں کی ننگی تصویریں بنا کر انہیں مضر شکل دی

ہے۔ ان کی تذلیل کی ہے اور ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔

دادا بھائی نوروجی، جسٹس راناڈے، گوپال کرشن گوکھلے اور اس وقت کے انگریز گورنر تک روی ورما کے دوست تھے۔ اگر روی ورما چاہتے تو یہ مقدمہ رفع دفع ہو سکتا تھا۔ نوروجی اور گوکھلے وغیرہ نے مقدمہ نہ لڑنے کا مشورہ دیا، لیکن روی ورما نہیں مانے۔ ایک وکیل باپٹ نے ان کی طرف سے مفت مقدمہ لڑنے کی پیش کش بھی کی، جسے انہوں نے قبول نہیں کیا۔ بنا کسی وکیل کے خود اپنی پیروی کی اور سرکار کی جانب سے وکیل دیے جانے کی بات بھی ٹھکرا دی۔

ممبئی میں گرگاؤں کی مقامی عدالت میں مقدمہ چلا۔ مدعی کی جانب سے وکیل تھے کیشو شاستری۔ جج رچرڈ نے الزام پڑھ کر سنایا۔ "تصویروں کے ذریعہ آپ عوام میں عریانیت اور فحاشی کی تبلیغ کر کے مخربِ اخلاق، بے ہودہ تصورات کی تشہیر کر رہے ہیں اور ہندو مذہب میں مقدس مانے جانے والے دیوی دیوتاؤں کو گھر گھر پہنچا کر انہیں حقیر بنا کر، ان کے تقدس کو مجروح کر کے مذہبی لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں؟" مراٹھی ادیب رنجیت دیسائی نے روی ورما کی سوانح لکھی ہے، وہاں یہ واقعہ اس طرح درج ہے:

"عدالت میں وکیل نے کہا: دیوی دیوتا کی پوجا ہمیشہ مندر میں ہی ہونی چاہئے، ان کے تقدس کی حفاظت ہونی چاہئے یہی ہمارے مذہبی جذبات ہیں۔ لیکن ملزم نے سرسوتی، لکشمی اور رام وغیرہ کی جو تصویریں بنائی ہیں ان کی لاکھوں کاپیاں آج سارے ہندوستان میں بیچی جا رہی ہیں اور گھر گھر میں پوجا کی جگہ پر ہی نہیں اشتہار کی طرح نمائش کی چیز کی شکل میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ دیوتا اتنے گھٹیا درجے کے کب سے ہو گئے۔

دراصل یہ ملزم دکھن کا ہے، ترویندرم صوبے کا ہے۔ عدالت میں آتے وقت یہ ماتھے پر بھسم لگا کر آتا ہے۔ لیکن بھسم لگانے والے اس شخص کے روپ میں ہندوستانی تہذیب کو بھسم کرنے پر آمادہ ایک بھسماسُر ہی سینہ تانے گھوم رہا ہے۔ کھیت میں کبھی کبھی غلطی سے گانجے کا پودا اگ آتا ہے، جب اس کا پھول کھلتا ہے تو پورے کھیت میں اس کی مہک پھیل جاتی ہے۔ لیکن وہ پھول نہ ہرسنگار کا ہوتا ہے، نہ چمپا کا۔ وہاں تو گانجے کا پھول ہے۔ ہماری ہندوستانی تہذیب میں یہ ایک گانجے کا پودا ہے۔ نشہ لانے والا، بے ہوش کرنے والا۔

اس کے جرم کا موازنہ دشاسن کے جرم سے کرنا ہو گا۔ لیکن دشاسن نے ایک عورت کو بے لباس کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس گنہ گار انسان نے ہمارے سبھی دیوی دیوتاؤں کو بے لباس کرنے کے لیے کمر کس لی ہے۔ وہ نیم عریاں سیتا! وہ بے لباس اُروشی! وہ دمینتی، وہ یشودا کتنے نام لوں۔ اپنے اس جرم کا بچاؤ وہ فن کے میٹھے نام پر کرنا چاہتا ہے۔ میں اسے خونی نہیں کہوں گا

کیونکہ خونی ایک دو انسانوں کا قتل کرتا ہے۔ یہاں تو پورے سماج کی اخلاقی قدروں کو تباہ کر کے اسے مکمل طور پر نیست ونابود کرنے کی بے جا کوشش کی جاری ہے۔ ان دونوں میں صرف اسلحے کا فرق ہے۔ برش جیسے نہایت معصوم نظر آنے والے ہتھیار کا اس نے اتنے خوفناک طور پر استعمال کیا ہے۔

اس نے اپنی سنک کے مطابق دیوی دیوتاؤں کو بالکل عام انسان بنا ڈالا ہے۔ گویا وہ دیوی دیوتا ہی نہیں ہیں۔ وہ عام مرد عورت نہیں ہو سکتے۔ انہیں عام مرد عورت بنا کر ان کے جسم کی جو بھونڈی نمائش اس نے کی ہے' اس سے ہمارے مذہب کی توہین اور فن کا زوال ہوا ہے۔ اس نے واقعات بھی اٹھائے تو کون سے؟ وشوامتر...... مینکا اروشی...... پورروا' یشودا...... بال کرشن' فتح اندر جیت' سیتا ہرن' دروپدی کا بے لباس کیا جانا...... کتنے نام لیں۔ اس کا ایک ہی سبب ہے۔ شہوانیت اور عورت کی عریاں تصویروں میں ہی اس کا من لطف لیتا ہے۔ اسے اس نے مذہب کا پُر فریب نام دیا۔ ان تصویروں نے عام آدمی کو مسحور کر لیا ہے۔ مہابھارت' رامائن اور پُران میں کیا کوئی اور واقعہ نہیں؟ وہ معصوم واقعات اسے کیوں نہیں سوجھے؟ شیو کی زہر نوشی' جمنا کا واسو دیو کو راستہ دینا۔ پاروتی کا عبادت سے شیو کو خوش کرنا...... لیکن ایسے واقعات یہ کیوں لیتا۔ ایسے سینکڑوں واقعات چھوڑ کر گھٹیا اور شہوانی واقعات ہی اس نے تصویر کئے ہیں۔

بائبل پر مبنی عیسیٰ مسیح کی زندگی کی تصویروں کو ذہن میں لائیے۔ ان تصویروں میں مریم کو کبھی نیم عریاں دکھایا گیا ہے؟...... اتنا ہی نہیں۔ آپ نے کبھی حضرت محمدؐ کی تصویر دیکھی ہے؟ کوئی مصور ان کی تصویر بنانے کی ہمت دکھائے؟ اس جرم کی سزا اسے سماج کی طرف سے سزائے موت کی شکل میں ملے گی۔ لیکن ہمارے ہندو مذہب کی رواداری کا غلط استعمال کرتے ہوئے اس ٹٹ پونجیے مصوّر نے ہمارے دیوی دیوتاؤں کی من مانے ڈھنگ سے تصویریں بنائی ہیں۔ اس کا ہمیں بے حد ملال ہے۔ ہندو ہونے کے ناطے ہم اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتے۔"

روی ورما کے پریس میں چھپی وشوامتر...... مینکا کی تصویر وکیل نے عدالت میں پیش کرتے ہوئے کہا......

"آپ فنکار ہیں' آپ کو ایسے ہی واقعات اچھے لگیں گے۔ رامائن' مہابھارت میں بے شمار عظیم واقعات ہیں لیکن آپ نے یہی کیوں چنا؟ وشوامتر مینکا کے عشق میں گرفتار ہوتے ہیں۔ وہ حاملہ ہوتی ہے...... پیدائش کے بعد شیر خوار بچی کو لے کر مینکا وشوامتر کے پاس آتی ہے اور وشوامتر ہاتھ جھٹک کر اپنے گناہ سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ یہی نا؟ لوگوں پر ایسے ہی سنسکار ڈالتے ہیں؟"

روی ورما نے کہا......

"مجھے بہت انکساری سے عرض کرنا ہے کہ میں بھی ایک عالم' ویدوں کے پنڈت کا بیٹا ہوں۔ آپ کی بہ نسبت وشوامتر...... مینکا کے واقعات کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں...... ذرا آنکھیں کھول کر تصویر کو دیکھیے۔ اس میں ایک غیر ذمہ دار عاشق دکھائی نہیں دے گا۔ وشوامتر کی آنکھوں میں بے بسی اور انتہائی دکھ ملے گا۔ اتنا ہی نہیں' ہاتھ میں بچی کو لے کر کھڑی مینکا کی آنکھوں میں ممتا کے ساتھ ساتھ وشوامتر کے تئیں عشق کے جذبات بھی آپ کو دکھائی دیں گے۔ وشوامتر اور مینکا دو سخت جان مخلوق ہیں۔

موضوع کی شہوانیت کا تذکرہ کر کے ان کی تذلیل کرنے کی جرأت کم از کم آپ تو مت دکھائیے۔ لیکن تصویر دیکھنے کے لیے فنکارانہ نظر چاہیے۔ بدقسمتی سے وہ نظر آپ کے پاس نہیں۔ افسوس اسی بات کا ہے کہ شاستری ہوتے ہوئے بھی آپ کو ایک سادہ اور آسان سی تصویر کو دیکھنا نہیں آتا۔ یہی آپ کی بدنصیبی ہے۔ حسن کو دیکھنے کی صلاحیت اس کی قدر و قیمت جان پانا خداداد شئے ہے۔ میں نے اپنی تصویر کا مفہوم بتا دیا ہے۔ اب اس تصویر کو دیکھیے' آپ خوش بخت ہوں گے تو آپ کو یہ مفہوم دکھائی دے گا۔

میرے جیسے مصوّر پر یہ الزام لگے اور اس کے لیے مجھے عدالت میں کھڑا کیا جائے یہ ایک طرح سے میری عزت افزائی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مذہب کے ٹھیکیدار کے روپ میں آج جو میرے خلاف کھڑے ہیں مجھے شک ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مذہبی ہیں بھی یا نہیں۔ ان کی روایت بڑی عظیم ہے۔ مذہب کے ان ٹھیکیداروں نے بڑے بڑے سنتوں کی ہولی جلا کر اس کی بھسم اپنے ماتھے پر لگائی ہے۔ مہاراشٹر میں ہی نہیں سارے ہندوستان میں سنتوں کا یہی حشر کیا گیا۔ گیا نیشور نے گیتا دیسی بھاشا میں لکھی' لیکن انہیں اور ان کے بھائیوں کو کیا نتیجہ بھگتنا پڑا؟ یہی انجام تکارام' نرسی مہتہ' میرابائی وغیرہ کا ہوا۔ پورندرداس بھی اس سے بچ نہیں پائے۔ تمام نسل آدم کا یہی حال ہے' نہیں تو حضرت عیسیٰ مسیح کو سولی پر کیوں چڑھنا پڑتا۔ ان بھی مذہبی ٹھیکیداروں نے دیوتا صفت لوگوں کے ساتھ یہی سلوک کیا اور بعد میں انہیں سنت کہہ کر ان کی تحریروں اور کتابوں سے اپنی روزی روٹی چلائی۔ نام رہا ان سنتوں کا اور روایت چلی مذہب کے ٹھیکیداروں کی۔"

روی ورما نے مزید کہا......

"دو الزامات کے لیے یہ مقدمہ دائر کیا گیا ہے۔ پہلا الزام یہ ہے کہ میں نے دیوی دیوتاؤں کی تصویریں عام لوگوں کے گھروں تک پہنچا کر ان کے تقدس کو ختم کیا ہے۔ اس الزام

کی صفائی کے طور پر مجھے اتنا ہی کہنا ہے کہ بھگوان کسی ایک انسان یا طبقے کی جاگیر نہیں ہوتا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ جنہیں ذات پات کی تفریق کے باعث مندر میں داخل ہو کر دیوتا کے درشن کا موقع نہیں ملتا انہیں میری تصویروں سے یہ شرف حاصل ہوا۔ اس بات کا مجھے اطمینان ہے۔ اس سے میری زندگی اور میرا فن دونوں بامعنی ہو گئے ہیں ایسا میرا عقیدہ ہے۔

دوسرا الزام ہے کہ میں نے دیوی دیوتاؤں کی فحش تصویریں بنائی ہیں اور ان کی توہین کی۔ یہ الزام مجھے بالکل تسلیم نہیں۔ پوتھیوں 'پرانوں سے کرشن لیلا کا آنکھیں مٹکا مٹکا کر بیان کرتے وقت ان شاستریوں کو کبھی حیا نہیں آتی' کوئی لحاظ نہیں ہوتا لیکن بے فکری سے یشودا کا دودھ پیتے ہوئے بچے کرشن کو دیکھتے ہوئے ان مذہب کے گروؤں کو اس میں ماتا اور شفقت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

میں بھی ایک باپ ہوں' میرے بھی بچے ہیں' ان کی پیدائش کے زمانے مجھے یاد ہیں۔ میرے سامنے بے تکلفی سے بچے کو دودھ پلاتی بیوی مجھے یاد آتی ہے۔ اس کی عریانیت یا اس کی بے لباسی کا لحاظ ہم دونوں میں سے کسی کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ اس معصوم بچے کو دیکھ کر ہم مسرور ہو جاتے ہیں۔ یہ ہر گھریلو انسان کا تجربہ ہے۔ مصوری کی دنیا میں فحش اور غیر فحش کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہاں اخلاقی اور غیر اخلاقی کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں۔

انسان کے جسم سے زیادہ حسین اور متاثر کن کوئی اور روپ نہیں۔ اپنے متناسب اعضاء سے وہ سیکڑوں احساسات کو ظاہر کرتا ہے۔ غیر جانب داری اور شہوانیت کا عریانیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ عریانیت حقیقت سے وابستہ ہوتی ہے۔ پوشیدگی فن نہیں ہوتی' ایسا نہیں ہے۔ وہ بھی حسن کی دریافت ہی ہے لیکن ڈھکے چھپے حسن کو ظاہر کرنا بھی فن کا مقصد ہے۔ حسن سے زیادہ سچ کی دریافت فن کا مقصد ہے۔

جن کی روح میں شفافیت ہوتی ہے' انہیں ہی تصویریں اچھی لگتی ہیں' لیکن ماتھے پر بھسم لگانے کے باوجود جن کی عقیدت اندھی ہو' ان کی آنکھوں کو یہ تصویریں فحش لگیں گی۔ دراصل فحاشی تصویر میں نہیں' دیکھنے والے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

اس بے لباسی میں قابل اعتراض کیا ہے' یہ میں نہیں جان سکا۔ جو بھی انسان انسانی زندگی سے گہرا لگاؤ رکھتا ہے' اس میں انبساط تلاش کرتا ہے' اس کے لیے عریانیت سے دور رہنا ناممکن ہے۔ عریانیت نہیں ہوتی تو زندگی بھی شفاف نہیں ہوتی۔ زندگی صرف لباسوں اور گہنوں سے سجی ہوئی نہیں ہوتی۔ عریانیت کی تلاش نے ہی زندگی کو زندگی دی ہے۔ یہ زندگی اگر حقیقت ہے تو اس حقیقت کی تصویر کشی جرم نہیں ہو سکتی۔

شنکر کو عریاں کہنا مذہب اور عقیدے کو گوارہ ہوتا ہے لیکن یہی شنکر جب تصویر میں عریاں ہوتے ہیں تو یہ فحش کیسے ہو جاتی ہے؟ یہ میرے لیے ایک معمہ ہے۔ عریاں لفظ کا تلفظ کرتے ہی انسان کے درون میں بے چینی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ دراصل عریاں لفظ اتنا حسین ہے کہ سچ مچ اس لفظ کی کھوج کرنے والے انسان کی تعریف کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔

(ہندی زبان میں عریاں کے لیے नगन استعمال ہوتا ہے: مترجم)

नग کا مطلب ہے چپکنا۔ नगन یعنی جو کسی سے چپکا نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں جو صرف روح کا ہم شکل ہے اُسے नगन کہتے ہیں اور جو سر سے پاؤں تک مادیت سے چپکا ہوا ہو' اسے کہتے ہیں लगन۔ پھر اس عریانیت کو تہذیب کے برعکس کیسے مانتے ہیں۔

مندروں کی مورتیاں دیکھئے' ویرول اور اجنتا کی گپھائیں دیکھئے اجنتا کا فن عالمی شہکار کا درجہ رکھتا ہے' وہاں کیلاش گپھا میں شیو پاروتی کی مورتی ہے۔ بھگوان شیو کے زانو پر بیٹھی ہوئی پاروتی تقریباً برہنہ ہیں۔ اس مورتی کے بارے میں فحاشی کا الزام میرے سننے میں نہیں آیا۔ مصوری کے بارے میں اگر کچھ کہنا ہو تو کیا آپ اجنتا کی تصویروں کو اس لیے فحش کہیں گے کہ ان میں برہنہ عورتوں کے اعضاء دکھائے گئے ہیں۔ سنگ تراشی ہو یا مصوری — یہ فن ہے۔ فن کو دیکھنے کے لیے فنکارانہ نظر کے ساتھ ہی جانا ہوتا ہے' تبھی ہم فن کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ فن کو نہیں سمجھ پانے پر طرح طرح کے الزامات جڑے جاتے ہیں۔ اس عریانیت سے اگر ہمارے آباواجداد خائف ہوتے تو انہوں نے مندروں پر جنسی فعل کی تصویریں نہیں بنائی ہوتیں۔ کیا ان تصویروں کو فحش کہہ کر آپ تباہ کرنے والے ہیں؟ اور اگر ایسا کیا گیا تو فن کے صارف کی حیثیت سے میری رائے ہے کہ ایسا کرنے والوں کو پرمیشور بھی معاف نہیں کرے گا۔

میں فن کے مطالعے کے لیے کنیا کماری سے شمال تک گیا۔ وہاں کے مندروں کو دیکھنے کا شرف مجھے حاصل ہے۔ فحاشی کا یہی تصور ان کے ذہن میں ہوتا تو ہمارے آباواجداد نے مندروں کو ایسی صناعی سے نہیں آراستہ کیا ہوتا۔ فحاشی کے اس تصور کے مطابق تو شیوالے کا شیولنگ بھی فحش ہے۔ یہی کیوں جین مذہب کے باہوبلی کی برہنہ مورت...... اس تصور کے مطابق تو انہیں لباس پہنانے ہوں گے۔ اس کے صناع اور عقیدت مندوں کو ملزم کے طور پر کھڑا کرنا ہوگا۔

بیرونی حملوں اور مختلف مذاہب کے عقیدوں کی وجہ سے ہندوستانی صناعی اور مذہب کی جو خوفناک تباہی ہوئی ہے اسے ان مذہب کے ٹھیکیداروں کی وجہ سے کیا آگے بھی جاری رہنے

دینا ہے۔ فن کار ہونے کے ناطے میرا یہ سوال ہے۔"

اروشی پورورواکی تصویر کو فحش کہنے والوں کو روی ورما نے جواب دیا......

"رات میں دونوں ایک ہی بستر پر سوئے ہیں۔ بھیڑیں ہانک کر لے جائی گئی ہیں۔ یہ شور سے پتہ چلتا ہے۔ پورورو ابرہنہ حالت میں دوڑ کر چھجے پر آتا ہے۔ پیچھے پیچھے نیم برہنہ اروشی آتی ہے۔ تبھی آکاش میں بجلی چمکتی ہے۔ اس روشنی میں اروشی پورورواکو برہنہ حالت میں دیکھتی ہے اور وہ پورورواکو چھوڑ کر سورگ (स्वर्ग) کی طرف جانے لگتی ہے۔ یہ پُران کا واقعہ ہے نا!! اگر اس واقعے کو جوں کا توں تصویر کرنا ہوتا تو پورورو ااور اروشی کو آدم اور حواؑ کی طرح مکمل طور پر بے لباس دکھانا پڑتا۔ فن کے لیے حسن مقدس ہوتا ہے۔ اسے عریانیت کا خوف نہیں ہوتا۔ فنکار حسن کو تلاش کرتا ہے۔ میں نے حسن کے تقدس کا خیال رکھا ہے۔ کیا اسی لیے مجھے مجرم کے طور پر یہاں کھڑا کیا گیا ہے؟ اس مقدمے کو میں اپنی توہین نہیں مانتا بلکہ ہندوستانی تہذیب اور فن کی توہین مانتا ہوں۔"

بنیاد پرستی کا فن، تہذیب اور آزادیٔ اظہار سے خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے۔ ہٹلر کے زمانے میں آئن اسٹائن سے لے کر بریخت تک سب کو جرمنی سے جلاوطن ہونا پڑا تھا۔ روی ورما کے بعد حسین کی شکل میں کیا پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے؟ OO

مشرف عالم ذوقی

کہانی

لیبارٹری

گندہ تالاب، کیکڑے اور 'وہ'

یہ قیاس لگانا بہت آسان ہے کہ وہ کہاں پیدا ہوئے ہوں گے۔ وہ سابرمتی آشرم سے دلی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ کہیں بھی، کسی بھی طرح، کسی بھی حال میں، لیکن معاف کیجئے گا، ان کی پیدائش کے عمل کو کسی بھی طرح میں کلوننگ پروسیس سے جوڑنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اس لیے کہ کلوننگ کے ذریعہ چاہے وہ بھیڑ ہو یا انسان، اور یقیناً آپ تسلیم کریں گے کہ سائنس کی تجربہ گاہیں، انسانی تجربہ گاہوں کے مقابلے کم خطرناک ہیں۔ نہیں، اس بحث کے لیے 'ڈولی بھیڑ' یا پہلے انسان 'مکاؤف' کے تصور سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ سائنس کا پیدا کردہ انسان بھی گوشت پوست کا ہی انسان ہوگا مگر اس انسان سے کم خطرناک ہوگا جو انسان کے ذریعہ، انسانی فضا میں، انسانی گھر، انسانی کمرے میں، انسانی عمل، کے دوران عالم وجود میں آگیا ہوگا۔ اس لیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ کلوننگ کا انسان دوئم درجے کا انسان ہوگا، کہ اس کے اندر جنگ اور تہذیب کے جراثیم وہ شدت اختیار نہیں کر پائیں جو......

اس لیے فرض کرتے ہیں کہ وہ وہی تھے جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں، انسانی عمل کے دوران......اور فرض کرتے ہیں کہ وہ سابرمتی آشرم سے دلی کے آشرم چوک تک کہیں بھی 'وارد' ہو سکتے ہیں۔

☆☆

وہ کئی تھے۔ چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ...... یعنی کل ملا کر اتنے کہ ان کی گنتی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ وہ بیحد نرم، ملائم، سادہ لوح یا ایسے تھے، جن کو لے کر پانیوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔ یعنی کسی بھی برتن میں ڈال دو......وہ ایسے تھے کہ آپ ان کا کچھ بھی استعمال کر سکتے تھے، اور جس دن کا واقعہ ہے، اس دن دوپہر کا سورج آگ برساتا ہوا، اپریل کے مہینے کو

جلانے اور جھلسانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دو بجے کا وقت ہو گا۔ وہ بہر کیف ساری رات کے تھکے ہوئے، ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے بیٹھے، گندے پانی سے بار بار نکلتے اور اندر جاتے کیکڑے کا لطف لے رہے تھے۔

"کیکڑے کے کتنے پیر ہوتے ہیں۔"

دوسرا زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "کیکڑے کی آنکھیں کہاں ہوتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا۔"

"سالے میں نے پیر کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"اور میں نے آنکھوں کے بارے میں۔"

اُن میں ایک سن رسیدہ تھا۔ اس کی بڑی بڑی دانشورانہ آنکھوں میں چمک لہرائی۔

"دیکھو، کتے کو......"

"کتا نہیں کیکڑا۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"ایک ہی بات کیسے، تم اور میں کیا؟"

وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا۔ "ایک ہی بات ہے......دیکھو......دیکھو۔ کیکڑا مٹی سے پھر باہر نکل آیا۔"

"بارش ہو گی۔"

"اُن سالوں کو پتہ کیسے چل جاتا ہے۔"

"بارش کی اطلاع ملتے ہی کیکڑے سالے اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں۔"

اسی سنجیدہ قسم کے دانشور نے اطلاع بہم پہنچائی۔ "کیکڑے کے بارہ پاؤں ہوتے ہیں۔ کیکڑے اپنے پاؤں کا حساب نہیں رکھ پاتے۔ ان کے لیے زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو، دیکھو...... سالا گرا......"

"بارہ پیر نہیں۔ کیکڑے کے دس پیر ہوتے ہیں۔"

"آٹھ......"

"چھ......"

پہلے نے گفتگو کے رخ کو ہی بدل دیا تھا۔ "کیکڑے کے ہاتھ کہاں ہیں؟ آں؟ ہاتھ۔"

"ہاں، ہاتھ کہاں ہیں؟"

پہلا پُر امید تھا۔ "دراصل آپ لوگ جسے پیر سمجھ رہے ہیں وہ......"

"ممکن ہے۔"

"نہیں...... یا تو کیکڑے کے ہاتھ نہیں ہوتے یا پاؤں۔"

☆☆

دھوپ سخت تھی، لیکن اچانک بادلوں کا ایک کارواں دھوپ کے آگے سے گزر گیا تھا۔

"بارش ہو سکتی ہے۔"

"نہیں بھی۔"

"کیکڑے زمینوں سے باہر آ رہے ہیں، اس لیے ممکن ہے......"

"کیکڑے زمینوں سے باہر نہیں آ رہے ہیں، جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔"

"جان بچا کر۔"

"بارش کے موٹے موٹے قطرے، پتھر بن کر......"

"معصوم کیکڑے۔"

"قطعی نہیں۔" بے حد سنجیدہ نظر آنے والے دانشور نے منطق کا حوالہ دیا۔ "ایسے بدنما، بدصورت، بدہیبت اور آپ اس گندے آکٹوپس کی چھوٹی قسم کو کیا نام دیں گے۔ یہ کچھ بھی ہو سکتا ہے، معصوم نہیں ہو سکتا۔"

وہ دیر تک سر جوڑے بے بنیاد، غیر دلچسپ گفتگو میں الجھے رہے کہ کیکڑہ عالم وجود میں کیسے آتا ہے۔ کیکڑہ دیکھتا کیسے ہے؟ کیکڑہ زندہ کیسے رہتا ہے۔ کیکڑے کی زندگی کتنے دنوں کی ہوتی ہے یا، کیکڑوں کے پاس زندگی کا تصور کیوں نہیں ہے۔ کیکڑے اپنی حفاظت کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔

وہ دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے تھے کہ بادلوں کی اوٹ میں گم ہوتے سورج نے ان سکنیٹرس' کی تفریح طبع کے لیے بارش کی کچھ موٹی بوندیں آسمان سے بھیج دیں۔ کیکڑہ کچھ لمحے تک تڑپا۔ پانی کے چھوٹے سے گڈھے میں اچھلا، کودا، اوپر نیچے ہوا۔ بارش ذرا تیز ہوئی تو چھوٹے سے گڈھے میں کیکڑے کی لاش تیر رہی تھی۔

وہ قہقہے لگاتے ہوئے اٹھے۔

"جو اپنی حفاظت نہیں کر پاتے ہیں۔"

دوسرے نے جوڑ لگایا۔ "جو زندہ رہنا نہیں جانتے ہیں۔"

تیسرا مسکرایا۔ "اور جو اقلیت میں ہوتے ہیں...... "اقلیت، وہ اس لفظ پر دل کھول کر ہنسا۔

"ہم نے جو کچھ دیکھا، وہی اس کی زندگی تھی۔ یعنی بس اتنی ہی زندگی، جتنی ہم دیکھ

سکے۔ اس نے ذرا سا ہاتھ پاؤں مارا اور......"

"اس کی لاش کا کیا کیا جائے۔" دانشور، سنجیدہ تھا۔ بارش سے گیلی ہوئی مٹی اس نے دونوں ہاتھوں میں بھری۔ کیکڑے کے جسم پر ڈالی۔ عقیدت سے آنکھیں بند کیں۔

"رام نام سیتہ ہے۔"

دوسرے نے نزکہ لگایا۔ "جھوم کے بولو ستیہ ہے۔"

"ناچ کے بولو ستیہ ہے"

"گا کے بولو ستیہ ہے۔"

"رام نام ستیہ ہے......"

بارش کی رم جھم جاری تھی۔ کپڑے بھیگ چکے تھے۔ چلتے چلتے یہ کئی، ٹھہر گئے۔ پہلے نے دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے...... تیسرے نے چوتھے...... یعنی سب نے ایک دوسرے کو باری باری سے دیکھا۔

پہلے کی آواز مدھم تھی...... "رام نام......"

اس کے بعد کوئی کچھ نہیں بولا۔ سب خاموش تھے اور اٹھ کر یوں ہی آوازہ گردی کے لیے نکل گئے۔

کالی رات، مہذب لوگ اور تجربہ گاہ

وہ مہذب لوگ تھے۔ وہ اتنے مہذب تھے کہ اپنے مہذب ہونے کی دلیلیں دے سکتے تھے، اور ان کی دلیلیں اتنی باوزن ہوا کرتی تھیں کہ ان دلیلوں پر لوگ چپ چاپ سر جھکا لیا کرتے تھے۔

محترم قارئین، یہاں ان بہت ساری سیاہ راتوں کا ذکر ضروری نہیں ہیں، جو تجربے کے لیے ان کی لیبارٹری میں رکھی ہوئی تھیں۔ لیبارٹری۔ وہ تہذیب سے جڑی ہوئی ہر شے کو اپنی تجربہ گاہ میں لے جاتے تھے۔ انہیں سائنس میں مکمل یقین تھا۔ ردر فورڈ سے آئن اسٹائین اور گراہم بیل سے نیوٹن لاء کے بارے میں ان کی معلومات خاصی وسیع تھیں۔ جیسے وہ جانتے تھے کہ ہر ایک عمل کا اس کے مساوی اور مخالف ایک رد عمل ہوتا ہے۔ مادہ کے فزیکل اور کیمیکل ریکشن پر ان کی خاص نظریں ہوا کرتی تھیں، اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم آج تک کی اس سب سے زیادہ مہذب دنیا کے، سب سے زیادہ مہذب باشندے ہیں، اور یہ بات انہوں نے اپنی گرہ میں باندھ لی تھی کہ اس مہذب دنیا کا اصول ہے، جو طاقتور ہیں، وہی زندہ

رہیں گے۔ یعنی جو اقلیت میں ہیں، کیڑے مکوڑے یا کیکڑے، وہ ویسے بھی مردہ ہیں اور انہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔

تو یہ مہذب لوگوں کی لیبارٹری تھی، جہاں یہ جاننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ تہذیب اور جنگوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جنگیں ہی وہ بیش قیمت زیور ہیں، جن سے ہمیشہ تہذیبوں کو آراستہ کرنے کا کام لیا جاتا رہا ہے۔

تو فرض کر لیتے ہیں، یہ وہی تھے جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں اور انسانی عمل کے دوران...... اور فرض کر لیتے ہیں کہ وہ سابرمتی آشرم سے دلی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا ہو سکتے تھے۔

وہ کئی تھے اور پچھلی کئی راتوں سے لیبارٹری کے لیے کام کر رہے تھے۔

اور یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ وہ کوئی بہت دل سے اپنے کام کو انجام نہیں دے رہے تھے۔ نہ انہیں مجبور کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ ایک چھوٹے سے خوف کی بنیاد پر، کہ اس طرح مہذب لوگوں کی دنیا سے انہیں دیش نکالا مل سکتا ہے، وہ اپنے ضمیر کی آواز پر اس کام کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

اور اس لیے بھی...... کہ ان میں سے سب کے پاس ایک خاندان تھا۔ خاندان میں ماں باپ تھے۔ بھائی بہن تھے۔ بیوی تھی اور بچے تھے......

اور اس لیے بھی...... کہ بچے معصوم ہوتے ہیں......

اور ان سے کہا گیا تھا...... جو مضبوط ہوتے ہیں، بس انہیں ہی جینے کا حق ہوتا ہے۔

تہذیب کا فرمان بھی یہی ہے۔ اکثریت کی آواز بھی یہی...... اور اقلیتوں کو......

انہیں چانکیہ کے اشلوک پڑھائے گئے تھے۔

(برے انسان اور سانپوں میں اگر موازنہ کیا جائے تو سانپ بہتر ہے۔ کیونکہ سانپ اسی وقت ڈستا ہے جب موت آتی ہے اور انسان تو قدم قدم پر ڈستا رہتا ہے......)

اور انہیں بتایا گیا، اس سے پہلے کہ وہ آپ کو ڈسیں، آپ کی تہذیب کو۔ آپ......

☆☆

وہ کئی تھے۔

'اور کئی، گیس کے سلنڈروں سے بھرے ٹرک پر لد کر ساری رات تہذیب کے نام نئی
نکیفنتاسی کو جنم دیتے رہے...... یعنی ایسی فنتاسیوں کو جن کے تذکرے نہیں ہو سکتے۔ جن پر
گفتگو نہیں ہو سکتی۔ زندہ معصوم بچوں کو نئے نئے دلچسپ طریقوں سے آگ میں زندہ جلانے
سے لے کر، آبروریزی اور حاملہ عورتوں کی کوکھ میں ہاتھ ڈال کر......

نہیں جانے دیجئے۔ فنتاسی لفظوں کا لباس اوڑھ لے تو ذائقہ جاتا رہتا ہے۔

آپ ایسا کیجئے۔ آپ خود ہی اچھی سی فنتاسی گڑھ لیجئے۔ کیونکہ آپ نے ایک طرف
جہاں 'اتہاس' کے قصے پڑھے ہیں، وہیں ہٹلر، مسولینی، چنگیز خاں اور نریندر موذی کے نام
بھی سنے ہیں۔ آپ بابر سے بابری مسجد تک سب کچھ جانتے ہیں۔

اس لیے ذائقہ دار فنتاسیاں گڑھ لیجئے۔ جتنے چاہیں 'رس' یا گھول' ملالیں۔ آپ کی
مرضی......

☆☆

محترم قارئین!

وہ کئی تھے......

اور وہ ہی تھے جو سابرمتی آشرم سے آشرم چوک تک......

اور وہ ہی تھے جو انسانی فضا، انسانی گھر اور انسانی عمل......

اور ہمیشہ کی طرح نئی نئی فنتاسیوں سے گزر کر اس رات بھی وہ اسی گندے تالاب کے
کنارے اکٹھے ہوئے تھے اور سر جوڑ کر باتیں کر رہے تھے۔

"پہلی بار میں......"

"پہلی بار میں ڈر لگتا ہے۔ پھر مزہ آنے لگتا ہے۔"

"جنون سے...... بارود سے......؟"

"لوگوں کو ڈر کیوں ہے۔ جیسے پہلی پہلی بار دھرم بھرشٹھ ہونے کا بھئے، گوشت کھاتے
ہوئے ہوتا ہے۔"

"پھر بار بار کھاتے ہوئے......"

"دھرم بھی گوشت کھانے لگتا ہے۔"

سنجیدہ چہرے والے آدمی کی آنکھوں میں عجب سی چمک تھی...... "بچپن سے ہی ہمیں
"جنون" سے الگ رہنے کو کہا جاتا ہے۔ لیکن کیوں...... ہمیں زندگی کے سب سے اچھے
ذائقے سے محروم کیوں کیا جاتا ہے؟"

''...... ہمیں آدھے پاٹھیہ پڑھائے جاتے ہیں۔ زندگی کے آدھے تجربوں سے گزارا جاتا ہے۔''

''بھئے ...... بھئے بس پہلی بار ہوتا ہے۔ خوبصورت چیخ، آگ اور جسم کی مہک ...... بچپن میں کبھی چھوٹے چھوٹے چوہوں کو پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ یا بلی چوہے کا کھیل دیکھا ہے ...... یا ...... برساتی مٹی سے نکلتی چیونٹیوں کو پاؤں سے روندتے ہوئے ......''

''...... اتہاس پڑھتے ہوئے بھی ہمیں اتہاس سے باہر کر دیا جاتا ہے۔''

''...... گھر گرہستی میں اس آدمی کو سو جانے کے لیے کہا جاتا ہے، جو الگونڈر سے لے کر، چنگیز، ہلاکو، نادر شاہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔''

دانشور بوڑھے کی سفید داڑھیاں آہستہ سے ہلیں ...... چشمہ کے اندر آنکھوں میں چمک لہرائی ...... ''سرائے کے یگ میں لکھاڑیوں اور ٹھگوں کے قصے پڑھتے تھے۔ لوٹ مار کی دلچسپ داستانیں۔ تب زیادہ مزہ لکھاڑیوں کو آتا تھا۔ وہ قبر تیار رکھتے تھے۔ ادھر ٹھگوں نے مسافروں کو ہلاک کیا ادھر لکھاڑی تیار۔ آدھے گھنٹے کے اندر کھیل ختم ...... کچی مٹی سے زمین لیپ دی گئی ...... ''دانشور نے گہرا سانس لیا۔ ''وہ جینا جانتے تھے اس لیے ہلاک کرنے کے لیے ان کے پاس ہزاروں طرح کی فنتاسی ہوتی تھی۔''

''تمہیں یاد ہے ...... ''پہلا کہتے کہتے ٹھہرا ......

''وہ ...... کیکڑا ...... ''چاند کی روشنی میں گرتے چڑھتے کیکڑے کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے لفظ چبائے ...... ''وہ۔ عضو تناسل کا تجربہ ......''

''عضو تناسل کا ...... ''سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' پھر زور کا ٹھہاکا لگایا۔ ''اس سے پہلے کبھی اتنا دلچسپ کام ہاتھ نہیں لگا تھا۔''

دانشور سنجیدہ تھا ...... ''عضو تناسل۔ اقلیت اور اکثریت کے عضو تناسل میں فرق کیوں ہوتا ہے۔؟''

''تمہیں پتہ ہے، اس دن، اس گھر میں کتنے لوگ تھے؟''

''نہیں۔''

''یاد کرنے دو۔''

پہلے نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اکثریت والوں کے گھر کے پانچ افراد۔ ایک مکان مالک، اس کی بیوی۔ ایک بہن۔ ایک گیارہ سال کی لڑکی اور آٹھ سال کا بیٹا۔''

دوسرا بولا۔ ''اقلیت والوں کے یہاں کل ملا کر چار لوگ۔ ایک تو وہ داڑھی والا، دوسری

اس کی جوان بیوی۔ ایک سولہ سال کی لڑکی اور ایک آٹھ سال کا ہی...... کیوں؟"

"ہاں کل نو لوگ تھے۔"

پہلے نے ماچس جلائی۔ جیب سے مڑا تڑا سگریٹ نکالا...... "مجھے سب کچھ یاد ہے۔ وہ علاقہ ہی ایسا تھا، جہاں دونوں گھرانے برابری کے تھے۔ یعنی جس کی مرضی آجاؤ...... اور بیشک جو مضبوط ہوتے ہیں، جو اکثریت میں ہوتے ہیں......"

بوڑھے نے اس کے منہ سے سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں کے درمیان پھنسالیا۔

"مجھے بھی ایک کش تو لگانے دے۔" دھواں چھوڑتے ہوئے وہ کھانس رہا تھا۔

"بہر حال، وہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ اور لیبارٹری میں اتنا عجیب تجربہ......"

"اور اگر تم نہیں ہوتے سلائی ماسٹر......"

"میں نے کیا کیا؟" پھولی ہوئی ناک والا وہ شخص ڈھٹائی سے مسکرایا۔ "لاش سینے کی کہانیاں سنی تھیں...... عضو تناسل سینے کا......"

"بہر حال۔ بہر حال۔" دانشور نے دوسرے کش کے بعد سگریٹ پہلے کو تھمادیا۔

"وہاں ایک بچہ تھا اور مجھے لگتا تھا......"

"بچے دو تھے......"

"نہیں۔ وہ...... اقلیت والے کے بچے......"

"تمہارا خیال ہے......"

"آہ، فنتاسی۔ پہلے اس فنتاسی کو یاد کرو۔ جلی ہوئی دکانیں۔ جلے ہوئے گھر۔ دیوالی سے زیادہ روشنی۔ آہ، ہم سب کچھ ایک تہذیب کو بچانے کے لیے کر رہے تھے......"

محترم قارئین!

یہ اس کہانی کا ایک دلچسپ موڑ ہے اور یقین کیجئے۔ "ایسا ہو سکتا تھا، ہو سکتا ہے۔" جیسی باتیں اس واقعہ سے متعلق مت سوچئے کیونکہ یہ واقعہ واقعی پیش آیا تھا......

تجربہ گاہ اور تجربہ

سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا......

اور یقیناً یہ وہی تھے جو سابرمتی آشرم سے دلی کے آشرم چوک تک......

اور جو انسانی فضا...... انسانی ماحول......

وہ بس اس آدمی کو دیکھ رہے تھے، جو کھسیائی ہوئی آواز میں ان لوگوں کو دیکھ کر چیخ پڑا تھا۔

"مجھے نہیں، میں تو اکثریت......"

"اکثریت!"

"ہاں۔ میری متی ماری گئی تھی...... " وہ پاگلوں کی طرح چیخا۔ "یہ میری بیوی ہے۔ یہ بہن۔ یہ بیٹی ہے۔ اور یہ بیٹا۔ یہ سب میرے ہیں۔ ہاں میرے۔ انہیں لے جاؤ۔ جو بھی کرنا ہے کرو۔ کرو۔ میری متی ماری گئی تھی۔ میں بیوی کے بہکاوے میں آگیا تھا۔ دوست ہے، بچالو۔ میں گھر لے آیا۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ وہ چاروں...... لے جاؤ...... لے جاؤ...... " وہ اپنے گھر کے لوگوں کو ایسے گھیر کر کھڑا تھا، جیسے چڑیا انڈے سیتی ہے۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ بدن ڈول رہا تھا۔ آواز میں گھبراہٹ تھی۔ بیوی، بہن اور بچوں کی حالت بھی وہی تھی۔

"تم نے بچایا کیوں؟"

"میں نے نہیں۔ " بیوی چیخی۔ "جھوٹے ہو تم۔"

"م...... م...... میری بیٹی نے......"

"خیر جو بھی ہو۔ " یہ کئی، ان کی طرف گھومے۔ "وجہ جو بھی ہو لیکن تم نے بچانے کی کوشش کی۔ اس لیے کہ...... دوست!"

"میں نے کہا نا، متی ماری گئی تھی۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ اقلیت ہے۔"

بیوی نے بیٹی کو ایک گندی سے گالی بکی...... "وہ اس کے ساتھ پڑھتی ہے۔ اس لیے دوست لگتی ہے۔"

"دوست کوئی نہیں ہوتا۔ " دانشور سنجیدہ تھا۔ "دوستی برابر والوں میں ہوتی ہے۔ اکثریت کی اکثریت سے اور......"

"ہمیں چھوڑ دو...... چھوڑ دو...... انہیں لے جاؤ......"

دانشور نے اقلیت کے چاروں گنہگاروں کی طرف دیکھا۔ وہ سچ مچ لاش بن گئے تھے۔ چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔ جسم میں خون نہیں۔ چاروں مذبح کے جانوروں کی طرح اداس کھڑے تھے۔ یعنی کس کی باری پہلے آتی ہے۔ پھر کس کی باری۔

دانشور نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔

"باہر آؤ۔ " اس نے گھر کے لوگوں کو غصے میں اشارہ کیا۔ "باہر کوئی نہیں بھاگے گا۔ جو جیسے ہے۔ جس حال میں ہے، ویسے ہی۔ میرا مطلب......"

اکثریت والا اب بھی چلّا رہا تھا۔ ''انہیں لے جاؤ...... لے جاؤ۔ میری تو مَتی ماری گئی تھی۔''

☆☆

یہ کئی، اب باہر تھے۔ باہر، ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے۔

''دیکھو۔'' ...... دانشور سنجیدہ تھا۔ ''ذرا سوچو۔ یہ ایک بے حد حسین تجربہ ہوگا، یعنی اس سے پہلے جتنے تجربے ہم کر چکے ہیں، یا ہم کریں گے۔ یا ہم کرنے والے ہیں۔''

سب نے ایک دوسرے سے کانا پھوسیاں کیں۔ پھر پُر امید ہو گئے۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' دانشور جلد از جلد اپنی پیاس کو انجام دینا چاہتا تھا۔

''باس۔ مکان مالک کا کیا کیا جائے؟''

''وہ تو اکثریت کا......'' پہلا بولتے بولتے ٹھہر گیا۔

دانشور غصے میں بولا۔ ''پریشانی اب ایسے ہی لوگوں سے پیدا ہوئی ہے۔ ایسے ہی لوگ...... یہی لوگ ہمارے اب تک کے تجربے کو ناکام کرتے رہے ہیں۔''

''تو سب سے پہلے......''

دانشور نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''ساری باتیں یہیں کر لوگے کیا۔ کچھ ان لوگوں کے لیے چھوڑو۔ اُنہیں معلوم ہونا چاہئے، ان کے ساتھ کچھ لمحوں میں، آنے والے کچھ لمحوں میں کیا ہونے والا ہے۔''

اگلے ہی لمحے، یہ لوگ اندر تھے...... سامنے اکثریت اور اقلیت کے سہمے ہوئے نو افراد ان کے فیصلے کے منتظر تھے۔

''آہ، فنتاسی۔'' دانشور چلایا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آواز بدل گئی...... ''تہذیب ہر بار انصاف کرتی ہے۔ جیسے کو تیسا۔ یہ تہذیب کا اصول ہے۔ یہ، بہت زیادہ چلّا رہا تھا، اس کے منہ میں تیزاب کے قطرے ٹپکاؤ۔ تیزاب کے قطرے...... آہ، اور اس کی بیوی۔ وہ بہت تیز بولتی ہے۔ مرچی کی طرح۔ پہلے اس کے جسم پر، آنکھوں میں مرچی کا پاؤڈر ڈالو۔ بیٹی نے بچانے کی کوشش کی تھی۔ ہے نا۔ ایک بے حد پیاری عمر۔ اور اس عمر میں ایک بیحد پیارا چہرہ۔ جیسا ہونا چاہئے۔ اسے بانٹ لو۔ ایسا کرو۔ دونوں بچیوں کو بانٹ لو۔ ان کے سامنے...... تفریح کرو۔ ان میں سے کوئی کچھ نہیں بولے گا۔ جسم تفریح کے لیے ہوتا ہے۔ کمسن کا گوشت زیادہ ذائقہ دار ہوتا ہے۔

''اور...... اقلیت والوں کے لیے باس۔''

''ایک بار میں ایک فنتاسی۔ ان کے لیے کچھ الگ سوچتے ہیں۔ سب سے پہلے اس

سنپولیے کو۔ اس کا بھیجا اڑا دو۔ اقلیتی طبقے کا سنپولیا خطرناک ہوتا ہے۔ حرامی۔"

بچے نے تھوک دیا تھا۔

پہلے نے ریوالور تان لیا، اور اس درمیان ایک گندی گالی بکتا ہوا اکثریت کا بچہ سامنے آگیا تھا۔

"تو بھاگ جا......"

"سائیں۔"

دوسرا بچہ ایک لمحے کے لیے دوسرے کمرے میں پھرر...... ہو گیا۔ گولی سیدھے سینے پر لگی تھی۔ سینے سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے تھے۔ کوئی بھی نہیں چیخا۔ سب جیسے اس کھیل کے خاتمے سے پہلے ہی 'انجام' کو جان چکے تھے۔

دانشور نے کھیل کا طریقہ سمجھایا۔ "اسے پنکھے سے لٹکا دو۔ اس کی ساڑی ہٹاؤ۔ پہلے بلیڈ سے وہاں تک...... پھر......" اس نے بچیوں کو جلتی آنکھوں سے دیکھا...... "یہ نئے کپڑے کی طرح ہیں۔ قینچی سے کبھی نئے کپڑے کو کاٹا ہے۔ ان کی گولائیاں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ "بلیڈ گھماتے ہوئے، تم ایک عجیب سے نشے میں ڈوب جاؤ گے۔"

تو یہ کمرہ اب ایک لیبارٹری تھا۔ تجربے چل رہے تھے۔ نئے نئے تجربے۔ موت۔ عورتیں اور مرد، جوان بچیاں اور فنتاسی، زندگی اور ایڈونچر...... زمین پر ایک گھنٹے کی تفریح کے بعد آٹھ لاشیں بچی تھیں۔

"حکم باس۔" پہلا آہستہ سے بولا۔

یہ طے تھا کہ سب تھکن سے چور ہو گئے تھے۔

ابھی آخری فنتاسی باقی ہے۔ یعنی آخری تجربہ۔ دونوں مردوں کی لاشیں چھوڑ دو۔ باقی گھسیٹ کر اندر لے جاؤ۔ اب یہ کمرہ لیبارٹری ہے۔ ہم ایک نیا تجربہ کریں گے۔"

"ان کے عضو تناسل کاٹ دو۔" دانشور سنجیدہ تھا۔ "اور تم...... تم سلائی جانتے ہو نا۔ ماڈرن ٹیلرس کے بچے۔ کپڑے سیتے سیتے انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں تیری۔"

"حکم...... حکم باس۔"

"ان کے عضو تناسل بدل دو۔"

"مطلب...... مطلب باس؟"

"ان سالے سو کالڈ......" اس نے پھر گندی سی گالی بکی۔ "ان سالوں کو بتانا ہے اب...... سمجھانا ہے...... دھرم کو کھیل سمجھنے والوں کو مزہ چکھانا ہے...... یہ، جو ہر بار ہمارے تجربوں

کو...... "اس نے پھر گالی کا سہارا لیا۔ پھر اچانک چونکا۔ "آوازیں سن رہے ہو۔ ہمارے دوسرے ساتھی یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔ انہیں دیکھنے دو کہ ایسے لوگوں کے پاس نہ اپنا دماغ ہوتا ہے، نہ عضو تناسل۔ اب آپریشن شروع کرو۔"

آپریشن شروع ہو گیا۔

ٹیلر ماسٹر نے جیب سے قینچیاں، فیتے اور بلیڈ کا پیکٹ نکال لیا۔ وہ ایک منجھے ہوئے درزی کی طرح بدن کی چادر کو لے کر بیٹھ گیا...... چمڑے کی تھیلی، جو نئے انسانی وجود کے لیے زندگی کا امرت بن جاتی ہے، فنکاری اور صفائی سے بدل دی گئی تھی۔ ٹیلر ماسٹر نے انتہائی مہارت سے اپنا کام انجام دیا تھا۔ ساتھیوں نے شاباشی دی۔ کندھے تھپتھپائے۔ دونوں لاشیں باہر مین گیٹ پر ٹانگ دی گئیں......

تجربہ کامیاب تھا۔

مگر کھیل اب شروع ہوا تھا۔

تہذیب کے علمبردار ڈھول، تاشہ بجاتے آتے...... عضو تناسل کو دیکھتے۔ گندی گالیاں بکتے گزر جاتے...... وہ دیر تک، بلکہ کہنا چاہیے، کئی گھنٹوں تک اس کھیل سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ چلتے وقت دانشور نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"صرف بدن کی ایک چمڑی بدل دینے سے۔ تم سب سمجھ رہے ہو نا، آہ، کیا دلکش کھیل تھا۔ آہ، اس کھیل کو ہم بہت دن تک بھول نہیں پائیں گے۔ اور ہمیں اس مکار، مکان مالک کو اس کے کیے کی سزا بھی دینی تھی۔ اب اس کی لاش دیکھو۔ اس کی لاش کی تکابوٹی ہو چکی ہو۔ جب کہ اقلیت کی لاش۔"

"باس، اس پر تو پھول مالائیں چڑھی ہیں۔"

"اب چلو، اس کھیل کا سرور تازندگی قائم رکھنا ہے۔"

وہ جھومتے ہوئے نشہ کی حالت میں آگے بڑھ گئے۔

بچہ اور زندگی

"تمہیں وہ، بچہ یاد ہے؟"

"بچہ؟"

"باس، وہ اقلیت کا بچہ، ہم تو اس بچے کو بھول ہی گئے۔"

"اسے بچانے مکان مالک کا بچہ آگیا تھا۔"

"پھر ہم کھیل میں الجھ گئے تھے۔"

"......اور بچہ بھاگ گیا تھا۔"

"وہ بچہ کہاں جاسکتا ہے؟" دانشور کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

"اس کی نیلی نیلی آنکھیں۔" پہلا مسکرایا۔ "تمہیں اس بچے کی یاد ہے۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی ڈر یا گھبراہٹ نہیں تھی۔"

"اس کے ہونٹ......" دوسرا کہتے کہتے ٹھہرا......

"بولو......بولو......" دانشور کی آنکھیں مند گئی تھیں۔

"کھٹے کھٹے بیر جیسے تھے۔ اور پیارے۔"

"اس کا چہرہ۔" تیسرے نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "یقیناً وہ ایک بہت خوبصورت بچے کا چہرہ کہا جاسکتا ہے۔"

"وہ کہاں چھپا ہوگا؟" دانشور کو اپنی غلطی پر غصہ آرہا تھا۔

"اسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔"

"اسے مارنا......" پہلا کہتے کہتے ٹھہر گیا......

دانشور نے حیرانی سے پوچھا...... "کہیں تم سب اس بچے پر رحم تو نہیں کر رہے۔"

"نہیں باس۔ قطعی نہیں۔"

"مگر کیا اسے مارنا......؟"

دانشور غصے میں گھوم گیا۔ "مطلب۔ تم لوگ کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"بچہ ہے۔"

"بچے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔"

"کیوں نہ ہم اسے اکثریت کا بنادیں؟"

"اکثریت......؟" دانشور چونک گیا تھا۔

"ہاں۔ دھرم پریورتن۔ بچہ تو پانی ہوتا ہے۔"

دانشور کی آنکھیں پھیل گئی تھیں...... ابھی زیادہ گھنٹے نہیں ہوئے۔ بچہ بھوک پیاس سے بے حال ہو رہا ہوگا۔ وہ یقیناً کہیں چھپا اور زندہ ہوگا۔ ہمیں بچے کو تلاش کرنا چاہئے۔"

"اور بچانا بھی۔"

پہلا ابھی بھی مطمئن نہیں تھا۔ "کیا وہ وہاں موجود ہوگا، میرا مطلب ہے......"

دانشور نے پُر امید لہجے میں کہا۔ "فضول کی باتیں نہیں۔ ہم اس مدعے پر بہت باتیں

کر چکے ہیں۔"

"بچے کی زندگی ضروری ہے۔" ٹیلر ماسٹر نے لمبا سانس لیا۔

"ہاں، اس کی زندگی بیش قیمت ہے۔" یہ پہلا تھا۔

"ہمیں اس کی زندگی سے، یعنی اب کی زندگی سے۔ نئی زندگی سے بہت کام لینے ہیں۔" یہ دانشور تھا۔

☆☆

محترم قارئین!

تو یہ سارا کچھ اس چھوٹے سے بچے کے لیے ہوا، اس چھوٹے سے آٹھ سالہ بچے کے لیے، جس کی آنکھیں نیلی تھیں، چہرہ خوبصورت تھا اور جس کا تعلق اقلیت سے تھا۔ تو یہ سب کچھ اس چھوٹے بچے کے لیے ہوا، جس کے لیے اکثریت کے بچے نے اسے بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی اور جو تہذیب کی اس جنگ کے دوران جان بچانے کے لیے اپنے ہی گھر میں لاپتہ ہو گیا تھا، اور یقیناً ایسے بچے کو بچانا ایک اہم فریضہ تھا، اور جیسا کہ دانشور نے سوچا، تہذیب کے عروج کے لیے مذہب کو ہی واحد ہتھیار کے طور پر سوچا جا سکتا ہے۔ بچے کا دھرم پریورتین ہو جائے تو......

اور یقیناً یہ ساری جنگ تہذیب کے لیے، تہذیب کے نام پر لڑی گئی تھی، اور ان کے سوچنے کا پڑاؤ ہی گندہ نالہ یا تالاب تھا، جہاں انہیں وہ کیکڑا ملا تھا، یا بلوں سے نکلتی برساتی کالی چیونٹیوں کو انہوں نے پاؤں تلے روند دیا تھا۔

وہ دوبارہ جھلسے ہوئے مکانوں اور جلی ہوئی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے اس مکان تک پہنچ چکے تھے۔ آسمان پر کوؤں اور گدھوں کی اڑان دور تک دیکھی جا سکتی تھی...... ابھی بھی آس پاس کئی مکانوں سے دھواں نکل رہا تھا۔

"بچے طاقتور ہوتے ہیں۔"

دانشور مسکرایا...... "ہاں۔"

"اور اسی لیے بچے سب کچھ سہہ لیتے ہیں۔ عذاب، بارش اور جنگ!"

"ہاں۔"

"بچے مرتے نہیں ہیں۔"

""بچے مر کر بھی نہیں مرتے ہیں۔" دانشور پھر مسکرایا۔ "اسے آواز لگاؤ۔ کھوجو۔"

"لیکن ہم پکاریں گے کیا؟"

"ہاں یہ مسئلہ تو ہے۔"
"بچہ۔ ہم اسے بچہ کیوں نہیں کہہ سکتے۔"
"بچے تو سب ہوتے ہیں...... اکثریت......" پہلا کہتے کہتے ٹھہر گیا۔
دانشور کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ "نہیں، اسے بچہ کہہ کر آواز لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"پھر......"
"پھر...... یہ سوچتے ہیں۔"
"اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔"
"ہاں۔"
"بال بھورے تھے۔"
"ہاں۔"
"نیلی آنکھوں والے بچے؟"
"یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"
"بھوری آنکھوں والے......؟"
"یہ بھی نہیں۔"
"وہ شاہزادے جیسا دکھتا تھا! کیا شاہزادہ کہہ کر......"
"نہیں۔" دانشور سنجیدہ تھا۔ "اقلیت پر شہنشاہیت برسوں پہلے ختم کر دی گئی۔ نہ تاج نہ تخت، نہ وہ بادشاہ، نہ شہزادے......"
"لیکن اب تو وہ ہمارے ہو رہے ہیں۔ یعنی دھرم پریورتن......"
"اس کے باوجود نہیں۔"
"پھر......؟"
دانشور فیصلہ کر چکا تھا۔ "اقلیت۔ یہ نام بہتر ملا۔ چلو، اُسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔"
اس نے کسی فوجی کی طرح "کمانڈر" کا رول نبھاتے ہوئے کہا۔ "ایسا کرو۔ تم اس طرف۔ تم اس طرف۔ ایک میرے پیچھے پیچھے آئے...... اور......"
"باس، الگ الگ بٹ کر ہم کمزور نہیں ہو جائیں گے؟" ٹیلر ماسٹر کی آنکھوں میں چمک تھی۔
"پوائنٹ۔" دانشور چونکا۔
"اس طرح تو بچہ ہم پر حملہ بول سکتا ہے۔ وہ آٹھ سال کا ہے۔ آٹھ سال کے بچے کا

دماغ انتہائی شیطان کا اور سازش سے بھرا ہوتا ہے۔"

"پوائنٹ۔"

"سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بچہ سب کو ایک ساتھ دیکھ کر ڈر جائے گا۔" یہ بھی ٹیلر ماسٹر تھا......

"بچے کو ڈرانا نہیں ہے۔" دانشور کا چہرہ غصے سے پیلا پڑ گیا۔ "چلو دیر مت کرو۔ تلاش کرتے ہیں۔ اق...... لیت...... اق...... لیت، بیٹے......"

"اقلیت......"

"میرے اقلیت......"

"اقلیت ڈارلنگ......"

وہ بچے کو تلاش کر رہے تھے۔ گھر کی کوئی شے سلامت کہاں تھی۔ زمین سے چھت، دیوار سے لے کر کمرے اور کمرے کے مہنگے سامان...... لاش کی ہڈیاں، کتے، گدھ اور کوے کھا چکے تھے۔ سامانوں کے جنازے بکھرے تھے...... ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں ان کی ملی جلی آوازیں بازگشت کر رہی تھیں۔

"اق...... لیت......"

"میرے بچے اقلیت......"

"یہاں تو کوئی نہیں ہے۔"

"اوپر...... اوپر دیکھتے ہیں۔"

"بالائی منزل کی سیڑھیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔"

دانشور کی چیخ نکل گئی۔ "سنبھل کر آنا۔"

پہلا چیخا۔ "سر بچاؤ۔"

چھت کا ایک چھوٹا سا حصہ بھڑ بھڑا کر تیز آواز کے ساتھ گرا۔

دانشور مطمئن تھا۔ "بچہ اوپر نہیں ہو سکتا۔"

دوسرے کا خیال تھا۔ "چھت بری طرح بیٹھ چکی ہے۔ یعنی ایک کوا بیٹھنے کے تصور سے بھی، بچہ کا چھپنا تو دور کی چیز ہے۔"

"کیا بچہ اسی گھر میں ہوگا۔؟" ٹیلر ماسٹر ناامید تھا۔ "یعنی وہ بھاگ کر کہیں اور، بھی تو پناہ لے سکتا ہے۔ کہیں اور......"

دانشور مطمئن تھا۔ "بچہ کہیں اور پناہ لے ہی نہیں سکتا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ آندھی تیز تھی۔ درخت سارے گر گئے تھے۔"

دانشور اپنے جواب سے مکمل طور پر مطمئن تھا۔ "ایسی صورت میں بچے کو سوائے اس کھنڈر میں چھپنے کے کوئی راستہ نہیں بچتا ہے۔"

"آگے اندھیرا ہے۔"

"ٹارچ...... ٹارچ نکالو۔"

ان میں ایک نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹارچ نکالی۔ ٹارچ نکالتے ہوئے پھسپھسایا۔

"سنتے ہیں، کچھ ملک ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں رات ہی رات ہوتی ہے، دن نہیں ہوتے۔"

"ہاں۔"

"باس یہاں بھی کچھ ایسا لگتا ہے۔"

دانشور کا لہجہ غصے سے بھرا تھا۔ "ہم ایک نیک مقصد کے لیے۔ سمجھ رہے ہو نا، بچے کو بچانے کے لیے۔"

"وہ زندہ ہوتا تو ہماری آواز ضرور سنتا۔"

"وہ زندہ ہے اور یقیناً ہماری موجودگی سے گھبرایا ہوا ہے۔"

"اقلیت......"

"اقلیت بیٹے......"

"مائی ڈارلنگ اقلیت۔"

آواز لگاتے ہوئے وہ ایک بار پھر آگے بڑھ رہے تھے۔ آگے، ٹوٹے ہوئے کھنڈر کے ملبے میں۔ دروازے، کھڑکیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے۔ کہ اچانک......

"کوئی ہے۔" آواز گونجی۔

"ٹارچ۔"

"کوئی ہے......" دانشور اندر ہی اندر خطرے کے سائرن، کے طور پر کانپ گیا تھا۔ پہلے نے ٹارچ جلائی......

دوسری آواز اٹھی۔ "بچہ ہے۔"

"کہتا تھا، نا......"

ٹارچ کی روشنی ٹوٹی ہوئی لکھوری اینٹوں، بھربھرائی مٹی سے ہوتی ہوئی بچے کے چہرے پر ٹھہر گئی......

"باس......"

ٹیلر ماسٹر نے چیخ کر کہا...... "باس بچہ ہی ہے۔"

"اوہ گاڈ۔"

دوسری آواز آئی۔ "بچے کی نبض دیکھو۔"

"کوئی ضرورت نہیں باس۔"

ٹیلر ماسٹر کی آواز گونجی۔ "بچے کے سر میں گولیاں لگی ہیں۔"

پہلے نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "بچہ مر چکا ہے۔"

دوسرا ٹارچ کی روشنی میں بھیانک بدبو دیتے ہوئے بچہ کی لاش پر جھک گیا۔

"بچہ کو مرے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔"

☆☆

محترم قارئین!

کہانی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن یقیناً، کچھ باتوں کا قیاس لگایا جا سکتا ہے۔ جیسے لوٹتے وقت یہ بہت مایوس رہے ہوں گے۔ ممکن ہے بچے کو نہیں بچا پانے کی صورت میں، یا اس سے زیادہ، ممکن ہے، دھرم پریورتن کے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا پانے کی صورت میں۔ یا ممکن ہے۔

کوئی اچھا سا قیاس آپ بھی کیوں نہیں لگا لیتے۔

لوٹتے ہوئے ان کے چہرے جذبات سے عاری تھے اور ایسے چہروں کا فائدہ یہ ہے کہ آپ کچھ بھی قیاس لگا سکتے ہیں۔

لیکن قارئین، سب سے ضروری جو بات ہے، وہ یہی ہے کہ یہ وہی تھے جو سابرمتی آشرم سے دلی کے آشرم چوک تک......

اور جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں، انسانی کمرے میں...... اور انسانی عمل کے دوران۔

کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں ہے کہ یہ 'کئی' پیدا بھی ہوئے ہوں گے......؟

○○

بیگ احساس

اَدھیاتم

دھرت راشٹر نے پوچھا۔

"اے سنجے۔ مجھے بتاؤ اتنے سارے لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں ہتھیار اٹھائے اس سرزمین پر کیا کر رہے ہیں؟"

سنجے نے جواب دیا۔

"اے دھرت راشٹر! وہ لوگ پوری ایک جاتی کو نشٹ کر دینا چاہتے ہیں۔ انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔"

"کیا ایسا ممکن ہے سنجے...... کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا ایسا کبھی ہوا تھا؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا ہوگا؟"

"ایسا ہوتا ہے دھرت راشٹر۔ وہ سمجھتے ہیں وہی اس دھرتی کے پتر ہیں۔ دوسروں کو یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ وہ اکثریت میں ہیں، اس لیے وہ انہیں اور ان کی نشانیوں کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس پوری جاتی کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ ذرا یہ تصویر دیکھیے۔ کتنا خوف ہے اس کی آنکھوں میں...... موت کا خوف...... وہ کس طرح دونوں ہاتھ جوڑے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔"

"تصویر نہیں سنجے۔ ہمیں پورا منظر دکھاؤ۔"

"کونسا منظر دکھاؤں دھرت راشٹر۔ منظر ہی منظر ہیں۔ بلکتے بچوں کا منظر، آگ میں جلتے ہوئے جسم، تنوروں میں جلتے بدن، اپنی عصمت کا ماتم کرتی ہوئی عورتوں کا منظر، عبادت گاہوں کا ملبہ، خاک کا ڈھیر بنی عمارتیں، اجڑے بازار، سڑتی ہوئی لاشیں...... انہوں نے کسی کو نہیں چھوڑا دھرت راشٹر! نہ علاج کرنے والوں کو، نہ زخمیوں کی مدد کرنے والوں کو، نہ انصاف کرنے والوں کو اور نہ مزدوروں کو...... آگ ہی آگ ہے...... چاروں اور آگ ہے۔"

"ہاں، میں وہ آگ، دیکھ رہا ہوں۔ آگ جس نے سب کچھ نگل لیا ہے۔ میں آوازیں

سن رہا ہوں۔ مارو، کاٹو، جلادو...... ان میں خوف زدہ چیخیں اور بلکتی ہوئی آوازیں اور سسکیاں بھی ہیں، کیسا عجیب سا شور ہے۔"

"اے دھرت راشٹر! کرشن نے کہا تھا...... حریص عمل کی طرح رجحان، بدافعالی، بے چینی اور خواہش رجکے غلبہ کی پیداوار ہیں۔

کرشن نے کہا تھا...... اس جہنم کے تین دروازے ہیں۔ شہوت، غصہ اور طمع۔ یہ روح کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہی دروازے کھل گئے ہیں دھرت راشٹر!"

"سمئے کے ساتھ ساتھ پر مپرا بھی بدلتی ہے سنجے...... ایک نیا اتہاس وجود میں آتا ہے۔"

"اے دھرت راشٹر ...... یہ منظر لکھیے۔ اتہاس اس منظر کو جنم دینے کے بارے میں کیا لکھے گا، یہ تو آنے والا سمئے ہی بتائے گا۔ یہ شہر کی ایک خوبصورت کالونی ہے۔ یہاں سب اقلیتی فرقے کے افراد رہتے ہیں۔ ان میں ایک بہت ہی عزت دار آدمی بھی ہے، جو اقتدار کے ایوان میں بیٹھا کرتا تھا۔ اسی آدمی نے انہیں یہاں مکانات بنانے اور یہاں رہنے کی ترغیب دی تھی۔ اطراف میں اکثریتی فرقے کے لوگ رہتے ہیں۔ لیکن وہ سب شریف آدمی ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ کسی بھی ناگہانی صورت حال میں وہ عزت دار آدمی انہیں بچالے گا۔ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے گا۔ سورج نکلنے کے بعد سے وہ پریشان ہیں۔ صبح ایک ذمہ دار محافظ عزت دار آدمی کے گھر آتا ہے۔ کچھ اس کے ساتھی بھی ہیں۔ وہ اطمینان دلاتے ہیں کہ وہ محافظوں کو بھیج دیں گے۔ ان کی مکمل حفاظت کی جائے گی۔ اس کے چہرے پر اطمینان ہے لیکن ان لوگوں کو گئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے کہ ایک روٹی کی دکان اور تین پہیوں کی ایک سواری جلادی گئی۔ آدھا گھنٹہ بعد پتھر پھینکے جانے لگے۔ تمام مکین سہم کر عزت دار آدمی کے گھر جمع ہو گئے۔ عزت دار آدمی کی انگلیاں مسلسل حرکت میں ہیں۔ وہ کوئی نمبر بار بار ملا رہا ہے یا کئی نمبر ملا رہا ہے۔ لیکن کوئی نمبر نہیں ملتا۔ ایک اضطراب کی کیفیت ہے۔ بے چینی ہے۔ محافظوں کا دور دور تک پتہ نہیں۔ وہاں ایک ہی مکان دوسرے فرقے کا ہے۔ انہوں نے اپنا گھر ہجوم کے حوالے کر دیا ہے۔ اب گھروں پر سنگباری زیادہ آسان ہے۔ عقبی حصے سے بھی پتھر، ایسڈ بلب، کیروسن کی بوتلیں، پٹرول بم پھینکے جا رہے ہیں۔ سورج سر پہ آگیا ہے۔ ہجوم ایک شخص کو گھیرے ہوئے ہے۔ پتہ نہیں وہ وہاں کیسے پھنس گیا۔ وہ اس پر جھپٹے۔ تلوار چمکی۔ اس کا جسم تین ٹکڑوں میں کٹ گیا۔ جئے شری رام ...... ان کے نعرے میں جوش ہے۔

آگ کا ایک الاؤ بہت پہلے ہی تیار کر لیا گیا ہے۔ جسم کے وہ ٹکڑے آگ میں جھونک دیئے گئے۔

چر...... چر...... چر...... تازہ گوشت کے جلنے سے عجیب سی بو پھیل گئی ہے۔ آگ، شعلے، دھواں، جلتے گوشت کی بو، پتھروں کی بارش...... عجیب خوفناک فضا ہے۔ عزت دار آدمی اور دوسرے خوف زدہ ہیں۔ ان کی کالونی کا مضبوط آہنی گیٹ ہجوم نے توڑ دیا ہے۔

"گھس جاؤ......" ہجوم نے حلق پھاڑ کے آواز لگائی۔

عزت دار آدمی کی انگلیاں درد کرنے لگی ہیں لیکن کہیں رابطہ قائم نہیں ہوتا۔ سارے نمبر بے معنی ہو گئے ہیں۔ انگلیاں شل ہو گئی ہیں۔ تمام اعضا شل ہوتے جارہے ہیں۔ وہ سب اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں مایوسی اور بے بسی اتر آئی تھی۔ جلتے ہوئے آگ کے گولے اور پتھر ان کی چھتوں اور دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ ایک اور شکار پکڑ لائے...... تلواریں اٹھیں اور جسم کئی ٹکڑوں میں بکھر گیا۔ گوشت کے وہ ٹکڑے آگ میں پھینک دیے گئے۔

وہی بو، سارے ماحول میں پھیل گئی۔ بو بھی کتنی وحشت ناک ہوتی ہے۔

سورج عروج پر پہنچ کر ڈھلوان میں اتر رہا تھا...... اب وہ ان کے گھروں تک پہنچ گئے ہیں۔ سروں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ تلواریں، گپتیاں، ترشول، لاٹھیاں...... گھروں کے دروازے ٹوٹنے لگے ہیں۔ مردوں کو بڑی بے دردی سے باہر کھینچا جارہا ہے...... ہجوم ان کے ٹکڑے کر رہا ہے۔

وندے ماترم...... جے شری رام۔

بے رحمی، سفاکی، آنکھوں میں خون، خوف زدہ چیخیں، بے بس خاموشی، بے عزتی...... عورتوں کے لباس تار تار ہوئے، عصمتیں تار تار ہوئیں، شفاف جسم داغ دار ہوئے، وہ جسم جن کی جھلک بھی کسی نے نہ دیکھی تھی، انہیں سڑکوں پر بھنبھوڑا جارہا ہے۔ آہ و بکا، چیخیں، آنسو...... ہوس کا ساتھ جسم نہیں دے پا رہے ہیں۔ جھلاہٹ۔ جسم کے ٹکڑے ٹکڑے پھر آگ۔

چر...... چر...... چر...... وہی عجیب سی وحشت ناک بو......

تیسرا پہر۔ کوئی محافظ نہیں آیا۔ سورج نیچے آگیا ہے۔ بالآخر عزت دار آدمی تک وہ پہنچ گئے۔ وہی ان کا اصل شکار ہے۔ وہ بری طرح ٹوٹ پڑے۔ اسے دھکے مار کے باہر نکالا گیا...... اسے بے لباس کرنے میں چند لمحے لگے۔ وہ مادر زاد برہنہ ہو گیا۔ وہ چیخ چیخ کر اس سے مطالبہ کرنے لگے۔

"بول...... وندے ماترم...... بول......" اس کی زبان گنگ تھی۔

"بول...... جے شری رام...... بول......" وہ چپ رہا۔

ان کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا لیکن اس کی زبان پر تالے پڑے تھے۔ جھلا کر انہوں نے اسے تھپڑ اور گھونسے لگائے۔ لاتوں سے مارا۔ پھر ایک ہتھیار چمکا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹ دی گئیں۔ انگلیاں، جن کے سہارے وہ نمبر گھما کر مدد مانگ رہا تھا۔ تحفظ چاہتا تھا۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔

"بول...... بول......" مغلظات کا طوفان ابل پڑا...... اس کے جسم کو جگہ جگہ سے زخمی کیا گیا۔ اس کے پورے بدن سے خون بہنے لگا۔ وہ زخموں سے چور ہو گیا۔ اسے دھکا مار مار کے سارے علاقے میں گھمایا جانے لگا۔ جسم سے ٹپکتا خون۔ بے لباس بدن...... اس کے پیروں کے اگلے حصے کاٹ دیئے گئے۔ وہ بار بار گرتا رہا۔ جب وہ بالکل چلنے کے قابل نہیں رہا تو ایک طرف لڑھک گیا۔ تب ایک تیز دھار کا ہتھیار اس کی گردن میں دھنسا دیا گیا۔ اسے نجات مل گئی۔ اس کے جسم کو گھسیٹ کر درمیان میں لایا گیا۔ اس کے جسم کے تین ٹکڑے کئے گئے اور پھر آگ کا الاؤ......

چر...... چر...... چر...... وہی بو...... انسانی گوشت کے جلنے کی بو......

"دیکھا...... دھرت راشٹر؟"

"ہاں...... دیکھا......"

"اے دھرت راشٹر، اب آپ کیا کریں گے؟"

"میں تو مکھوٹے بدلتا رہتا ہوں سنجے...... پتہ نہیں کون سا مکھوٹا لگانا پڑے۔"

"اے دھرت راشٹر...... کرشن نے ارجن سے کہا تھا...... اے بھارت! تمام جان دار آغاز میں نامعلوم، درمیان میں معلوم اور مرنے کے بعد پھر نامعلوم ہوتے ہیں۔ جب سب کی حالت ایسی ہے تو پھر افسوس کس بات کا ہے؟"

(۲)

"دھرت راشٹر! ایک بہت ہی انوکھا منظر ہے۔ نہ ماضی میں ایسا منظر ہوا، نہ حال میں۔ مستقبل...... مستقبل کس نے دیکھا ہے۔ ایسا منظر دھرت راشٹر کہ رُدر، وَسو، سادھیہ، آدِتیہ، وِشو، اَشوِن، مردت، اشمپ، گندھرو، یکھش، سدھ اسور، سب متحیر ہیں۔ سارے بھگوان حیرت زدہ ہیں۔ دیوتاؤں نے ایشور سے کہا تھا کہ وہ منش کو نہ بنائے، وہ ہنگامہ کرے گا۔ لیکن اتنا ہنگامہ کرے گا یہ شاید دیوتا بھی نہیں جانتے تھے......"

"کیا ہوا سنجے......؟"

"اے دھرت راشٹر...... یہ غریبوں کی بستی ہے۔ اسے چال کہتے ہیں۔ یہاں بھی ہجوم ہے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار ہیں۔ ان کے ساتھ محافظ بھی ہیں۔ جو انہیں روک نہیں رہے ہیں بلکہ ان کی مدد کر رہے ہیں۔ دھواں دھواں ہے۔ گیس کے شل برسائے جا رہے ہیں۔ وہ چوہوں کی طرح دبک کر بیٹھے ہیں۔ جن کا فرض آگ بجھانا ہے، وہ ایندھن فراہم کر رہے ہیں۔ وہی نعرے...... ویسا ہی شور...... آگ کا الاؤ روشن ہے۔ یہاں ایک عبادت گاہ بھی ہے، جہاں پچھڑی جاتی کے یہ لوگ عبادت کرتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے عبادت گاہ مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی۔ مقدس کتاب کے صفحات بکھرے ہوئے ہیں۔ ایشور کی شکل بدل دی گئی۔ دیکھئے دھرت راشٹر وہ کتنی مہارت سے ایک ہی وار میں ٹکڑے کرتے ہیں۔ عورتوں کو بے لباس کرتے ہیں۔ کیسا ننگا کھیل جاری ہے۔ ایک کے بعد ایک وہ مردانگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ بے بس عورتوں کو جہنم میں دھکیل رہے ہیں۔ پوری بستی ڈھیر ہوتی جا رہی ہے۔ آگ اور دھواں ہے۔ یہ منظر دیکھئے دھرت راشٹر۔ میں اسی منظر کی بات کر رہا ہوں۔"

"سنجے۔ وہ تو گربھ وتی ہے۔ پورے نو مہینے کی گربھ وتی۔"

"ہاں دھرت راشٹر۔ وہ اسی عبادت گاہ کے سامنے والے مکان میں رہتی ہے...... وہ کتنا گھگھیا رہی ہے۔ اسے چلنا کتنا دوبھر ہو رہا ہے۔ اسے بے لباس کیا جا رہا ہے......"

"اوہ...... وہ مر جائے گی سنجے۔" دھرت راشٹر بے چین ہو گئے۔

"مرنا تو اس کا مقدر ہے دھرت راشٹر!۔ لیکن یہ کیسی موت ہے۔ وہ سب اس پر پل پڑے ہیں۔ وہ ہاتھ جوڑے بھیک مانگ رہی ہے۔ وہ بے دم ہو گئی ہے۔ بالکل بے جان...... جگہ جگہ سے خون رس رہا ہے۔ اچانک وہ راکھشش تلوار لے کر آگے بڑھا۔ وہ دیکھئے۔ کتنی مہارت سے اس نے گربھ وتی کا پیٹ چیرا ہے...... دھرت راشٹر!۔ بچہ باہر نکل آیا ہے۔ بچہ زندہ ہے۔ زندہ ہے وہ...... اوہ دھرت راشٹر یہ کیسا جنم ہے۔ ابھی ماں کے جسم کو داغ دار کیا گیا، لیکن بچہ کیسا بے داغ اور شفاف ہے۔"

"وہ اس کیا کریں گے سنجے...... کیا ہو گا اس کا؟"

"دیکھئے...... اس نے بچے کو آگ میں اچھال دیا ہے...... کتنی مختصر زندگی ہے دھرت راشٹر...... آگ میں جلنے والا سب سے کم عمر آدمی...... بس ایک لمحہ اس نے زندگی جی لی۔ اب انہوں نے ماں کے بھی ٹکڑے کر دیئے...... اچھا ہی کیا...... وہ تو ویسے ہی مر گئی تھی۔ ظلم کی تاریخ میں ایک نئے پنے کا اضافہ ہوا ہے گرودیو......

...... آپ کی آنکھوں میں آنسو...... دھرت راشٹر۔"

"ہاں سنجے...... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ میں تو سب کے لیے ہوں۔ سب کے لیے......"

"پرہلاد کے لیے آگ گلزار بن گئی تھی دھرت راشٹر...... کیا اس معصوم کے لیے بھی؟"

"پتہ نہیں سنجے...... اس یگ میں ایسا کچھ نہیں ہوتا......"

"پھر آپ کچھ کریں گے؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں حالات کے مطابق اپنا مکھوٹا بدل لیتا ہوں۔ جب بھائی کے مقابلے میں راج پاٹھ سے محروم کیا گیا تب بھی میں نے کچھ نہیں کیا۔ راج پاٹھ ملا تو میں نے مکھوٹا بدل لیا۔ میں شکونی کی سازش کو روک سکا، نہ دروپدی کے وستر ہرن کو...... تو ان استریوں کے وستر ہرن کو کیا روک سکتا ہوں۔ میں دریودھن کو روک سکا نہ یدھ کو روک سکا۔ میں تو رتھ یاترا روک سکا، نہ عبادت گاہ کو مسمار کرنے سے روک سکا۔ میں تو خاموش تماشائی ہوں۔ تماشا بھی تمہارے ذریعہ سے دیکھتا ہوں۔"

"آپ کس طرف ہیں دھرت راشٹر؟"

"میں تو ہمیشہ اکثریت کی طرف رہا۔ چاہے انہوں نے کتنا ہی انیائے کیا ہو۔"

"دھرتی کے اس ٹکڑے پر آپ نے جس کو راج کرنے بھیجا تھا اس موذی نے راکھشس کا روپ دھارن کر لیا ہے اور چن چن کر ایک ہی جاتی کے لوگوں کو ختم کر رہا ہے۔"

"ہم اس سے کہیں گے کہ وہ دھرم راج کرے، دھرم راج......"

"دھرت راشٹر! کرشن نے کہا تھا...... تکبر، طاقت، اکھڑپن، شہوت اور غضب کے بندے ہو کر یہ کینہ پرور اپنا برا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ میں ہی سب میں موجود ہوں۔"

"تم بار بار کرشن کا ذکر کیوں کر رہے ہو۔ کیا کرشن پیدا ہو گیا؟"

"اس یگ میں ایسا کچھ ہونے والا نہیں ہے دھرت راشٹر۔ یہ آپ نے ہی کہا ہے۔"

"سنجے یہ کیسا شور ہے؟"

"کچھ لوگ ہیں جو شور مچا رہے ہیں۔ انہوں نے بھی وہ سارے منظر دیکھے ہیں۔"

"پھر وہ شور کیوں کر رہے ہیں؟"

"اس لیے دھرت راشٹر کہ ان کے اندر انسان زندہ ہے...... اب لفظ تصویر بن جاتے ہیں اور تصویریں گھر گھر پہنچ جاتی ہیں۔ ظلم کو چھپانا اب ممکن نہیں۔"

"لیکن شور تو ہمارے درباری بھی کر رہے ہیں۔ وہ بھی جنہوں نے ہمارا سنگھاسن اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔"

"ہاں دھرت راشٹر...... وہ بھی انسان کا مکھوٹا لگانا چاہتے ہیں۔"

"تو کیا وہ ہمارا سنگھاسن گرا دیں گے؟"

"آپ دربار لگائیں دھرت راشٹر۔"

(۴)

دربار لگا۔ باہر کی آوازیں بچی تھیں، لیکن دربار کے اندر چیخنے والوں کی نظر سنگھاسن پر تھی...... بار بار اس گربھ وتی اور بچے کی دہائی دی جا رہی تھی۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ جب شور بہت بڑھ گیا تو اس راکھشس نے جس کا خمیر سور کی لید سے اٹھا تھا اور جسے دھرت راشٹر نے سپاہیوں کا محافظ بنایا تھا، جوان کے دستر اور ہتھیار بیچ کر اپنا گھر بھر رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا۔ "یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ایسا یگ سے ہوتا آیا ہے۔" سب کانپ گئے اور دربار میں سناٹا چھا گیا۔

اتہاس لکھنے والے نے اس سارے واقعے کو اس طرح قلم بند کیا۔

"اس یگ کی شناخت ہٹ دھرمی، بے حیائی اور بے ضمیری ہے۔"

(۵)

"سنجے اس بار ہم جیت گئے...... ہمارا مکھوٹا کام آیا، تم جانتے ہو ایسا کیوں ہوا؟"

"ہاں دھرت راشٹر۔ ان میں کوئی ارجن ہے نہ کرشن۔ جو چیخ رہے ہیں وہ بد نیت ہیں، جو مظلوم ہیں ان کی آوازیں حلق میں پھنسی ہوئی ہیں۔"

"چلو یہ مرحلہ بھی ٹل گیا۔"

"ایک اور منظر باقی ہے دھرت راشٹر۔"

"اب کون سا منظر باقی رہ گیا......؟"

"یہ منظر...... تھان کے نیچے بیٹھے لوگ۔ ان کی آنکھوں میں دہشت ناک منظر جم گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بے آبرو ہوتے ہوئے دیکھا۔ عزیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ آگ نے ان کا سب کچھ جلا دیا...... ان کا گھر...... ان کا بیوپار، ان کا دھن،

ان کی انا، سب جل کر خاک ہو گیا...... سڑی ہوئی لاشوں کو، بے شناخت جسموں کو مٹی میں دبا کر آئے ہیں۔ ان سب کے لیے دھرو چکے، زندگی ایک بھیانک روپ میں سامنے کھڑی ہے۔"

"ہم نے دربار میں وعدہ کیا ہے کہ ان کو دھن دیں گے......"

کئی راکھشس منہ کھولے کھڑے ہیں دھرت راشٹر...... دھن ان تک پہنچنے نہیں دیں گے۔ میں تو یہ منظر دکھا رہا ہوں دھرت راشٹر کہ مایوسی اور ناامیدی کے اندھیروں میں کتنے بچوں نے جنم لیا ہے۔ وہ اپنا دکھ بھول کر ان بچوں کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں...... کبھی سب کچھ ختم نہیں ہوتا...... کہیں کچھ بچ رہتا ہے۔"

"یہ بچے......" دھرت راشٹر بے چین ہو گئے۔ "مجھے ایسا کیوں دکھائی دے رہا ہے سنجے......؟"

"کیا دھرت راشٹر؟"

"ان بچوں کے چہرے کرشن اور موسیٰ جیسے کیوں ہیں؟"

اب سنجے کے پاس دھرت راشٹر کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ OO

انور خان کی کہانی "کوؤں سے ڈھکا آسمان" کے نام

آگ اور پتنگے

رات کے گہرے سناٹے کو چیرتی ہوئی گولی چلنے کی آواز سے بے خبر خراٹے دار نیند سو رہے گاؤں کے لوگ اچھل پڑے۔ کچھ خوف کے مارے اپنی چارپائیوں کے نیچے چھپ گئے...... مسلسل گولیاں چلنے کی آوازوں کے بیچ، احمد کی بیوہ زمیں بیگم کی حویلی سے لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان کی حویلی کی چھت پر کچھ لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا اور وہ لوگ چھت پر سے صحن میں گولیاں داغ رہے تھے۔

اماں کو بیوہ ہوئے ایک عرصہ بیت چکا تھا۔ وہ اپنے دیوروں، دیورانیوں، بیٹے، بیٹیوں اور ان سب کے بچوں کے ساتھ چند چھوٹے چھوٹے کچی مٹی کے بنے ہوئے گھروں کی ایک حویلی میں رہتی تھیں۔ پورے گاؤں میں سب سے زیادہ عمر کی ہونے کی وجہ سے، گاؤں کے سب چھوٹے بڑے انہیں اماں کہہ کر پکارتے تھے۔ اماں حویلی کے جس حصہ میں رہتی تھیں وہ حصہ سرنگ نما دالان اور چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں پر مشتمل تھا۔ دالان کے آگے لمبا صحن تھا، جس کے بیچ میں پھونس کا چھپر پڑا ہوا تھا، جہاں ان کی بھینس بندھتی تھی۔ ایک طرف پانی کے لیے ہینڈ پمپ لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی غسل خانہ اور پاخانہ تھا۔ حویلی کے اندر آنے کے لیے اور اندر سے باہر جانے کے لیے کئی دروازے تھے۔ حویلی کے اندر ایک گھر سے دوسرے گھر میں آنے جانے کے لیے موریاں بنی ہوئی تھیں۔

چھت پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ حویلی کے سب چھوٹے بڑے باشندے اپنی جان بچانے کے لیے، اماں کی سرنگ نما کوٹھریوں میں پناہ گزیں تھے۔ ان لوگوں کو لگ رہا تھا کہ انہیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا ہے، جوان کو ماریں گے بھی، لوٹیں گے بھی اور جوان بہو بیٹیوں کی آبرو کو بھی خطرہ تھا۔ لہٰذا وہ سب مل کر زور زور سے چلا رہے تھے۔ "ڈاکو آگئے بچاؤ...... "گاؤں والوں ڈاکو آگئے بچاؤ۔" حویلی سے باہر نکلنے والے دروازوں کی کنڈیاں ڈاکو پہلے ہی آگے سے

بند کر چکے تھے، تاکہ حویلی کے اندر کے لوگ باہر نہ نکل سکیں۔
اماں کا کنبہ مسلسل چیخے جا رہا تھا۔ "ڈاکو آگئے بچاؤ۔" لیکن انہیں بچانے کے لیے یا ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کے لیے گاؤں کا کوئی آدمی نہیں آرہا تھا۔ جو لوگ گولی چلنے کی آواز سن کر چارپائیوں کے نیچے چھپ گئے تھے وہ حویلی کی طرف جانا چاہتے تھے، لیکن انہیں اپنے نادار اور بے سہارا ہونے کا شدید احساس تھا۔
جب اماں کا کنبہ چیختے چیختے تھک گیا تب وہ سب لوگ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ چھت پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ گاؤں والوں کی خاموشی دیکھ کر اماں کے بڑے بیٹے نے کہا۔
"آخر گاؤں کے لوگ ہماری مدد کو کیوں نہیں آرہے؟" یہ سن کر چھوٹے بیٹے نے کہا۔
"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ چھت پر جو لوگ ہیں وہ ڈاکو ہیں ہی نہیں۔ ورنہ پورا گاؤں اس طرح مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے کیوں ہوتا؟"
"ہو سکتا ہے تیری بات ٹھیک ہو، کیونکہ ڈاکو اس طرح آتے ہی نہیں، اور ویسے بھی یہ پہاڑی علاقہ تو ہے نہیں جہاں ڈاکوؤں کے ہونے کی خبر ہو...... ہمارے علاقہ میں تو دور دور تک ڈاکوؤں کے ہونے کی خبر تھی نہیں۔ پھر اچانک یہ ڈاکو کہاں سے آگئے؟" بڑے بیٹے نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔
"مجھے تو آج شام ہی سے کسی انہونی کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔" چھوٹا پھر بول اٹھا۔
"وہ کیسے؟"
"آج شام ہی سے کتے منہ اوپر اٹھا کر رو رہے تھے۔ پرندے بھی بہت جلد اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ گئے تھے۔ گلی کوچوں میں بچے بھی نظر نہیں آرہے تھے اور پھر اس بے موسم میں دور کسی گاؤں سے ڈھول بجنے کی آواز آرہی تھی، جیسے کوئی خاص قسم کا پیغام کچھ خاص لوگوں کو بھیجا جا رہا ہو۔ فضا پر شام ہی سے نحوست چھائی ہوئی تھی۔"
"یہ سب باتیں بند کرو اور یہ معلوم کرو کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟" اماں نے بہت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔
"اگر یہ ڈاکو ہیں تو ان سے کہو کہ یہ اپنا ایک آدمی نیچے بھیج دیں۔ وہ ہماری پوری حویلی کی تلاشی لے لے گا۔ آخر ہمارے پاس ہے ہی کیا؟"
"یہ بات نہیں ہے اماں۔" بڑے بیٹے نے کہا۔
"یہ لوگ ہمیں صرف لوٹنے ہی نہیں آئے ہیں، اگر یہ صرف لٹیرے ہوتے تو اب

تک پورا گاؤں ہماری مدد کو آچکا ہوتا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس ہتھیار ہیں یا نہیں، یہ لوگ نیچے اتر آئیں گے اور ان سرنگ نما کوٹھریوں میں ہمیں کاٹ کر گاڑ دیں گے، اور اس حویلی کو مسمار کر دیں گے۔"

"یعنی ہمیں بے نام قبروں میں سلا دیں گے۔" چھوٹے بیٹے نے کہا۔

"تم ان لوگوں سے بات تو کرو۔" اماں نے سخت لہجے میں اپنے بڑے بیٹے سے کہا۔ اس نے گھبرا کر اپنا منہ دروازے کے کواڑوں کی جھری میں لگایا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"بھائیوں ہماری بات سنو۔ آپ اپنا ایک آدمی ہمارے پاس نیچے بھیج دو۔ وہ ہماری پوری حویلی کی تلاشی لے لے گا کہ ہمارے پاس کیا ہے اور کیا نہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ کو اگر کچھ چاہیے جو کہ آپ کے خیال میں ہمارے پاس ہے تو وہ بھی آپ لے لیجیے۔" جواباً چھت پر کھڑے ہوئے ایک آدمی نے جو، اس گروہ کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا، مغلظات گالیاں بکتے ہوئے کہا۔

"تم جنم جات ملیچھ اور دغاباز ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم نے پورے گاؤں کو اڑانے کے لیے حویلی کے اندر گولہ بارود جمع کر رکھا ہے۔ تم ہمارے ایک آدمی کو نیچے بلا کر اسے قابو میں کر لو گے اور ہمیں بلیک میل کرو گے کہ یہ تمہاری صدیوں پرانی پریکٹس ہے۔ تمہارے پورو جوں نے تمہیں عیاری مکاری ہی کی شکشا دی ہے۔ اچھے سنسکار کیا ہوتے ہیں یہ تم نہیں جانتے۔ ہم اس طرح کے بے شمار دھوکے تم سے کھا چکے ہیں۔ اب نہیں کھائیں گے۔ پہلے ہم تمہیں اس حویلی میں زندہ گاڑیں گے۔ اس کے بعد جو تم نے گولہ بارود اور خزانہ یہاں جمع کیا ہوا ہے، اس پر قبضہ کریں گے۔" اس کے ساتھ ہی کئی فائر ہوئے۔ پھر اچانک پوری فضا پر سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد حویلی والوں کو چھت کے دوسرے کونے سے نرم و ملائم، کچھ جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔ "تم لوگ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر باہر نکل آؤ تو ہم تمہیں معاف بھی کر سکتے ہیں کہ ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں۔" یہ سن کر بڑے بیٹے نے اماں کی طرف دیکھا۔ اماں نے ہاں میں سر ہلایا۔ بڑے بیٹے نے دالان کا دروازہ کھولا اور باہر کو جھانکا تو معلوم ہوا کہ دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ گولیوں کی بوچھار دروازے پر آ کر لگی۔ اگر بڑا بیٹا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ زمین پر لیٹ نہ گیا ہوتا تو کئی گولیاں اس کا بھیجا چھلنی کرتی ہوئی دیوار میں جا لگی ہوتیں۔

اس کے بعد اپنی ہی حویلی میں گھرے اماں کے کنبہ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ خوف کی لہروں نے ان کے اعصاب ٹھنڈے اور دماغ سن کر دیئے، اور وہ چھپنے کے لیے کونے کھدرے ڈھونڈنے لگے۔ یہ دیکھ کر اماں کی آواز بلند ہوئی، وہ بولیں۔

"اس طرح چھپنے کے لیے چوہوں کے بھٹ ڈھونڈنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایسا کرو کہ صحن کے چھپر میں جہاں بھینس بندھی ہے آگ لگادو۔"

"آگ لگانے سے کیا ہوگا؟" چھوٹے بیٹے نے سوال کیا۔

"پورا گاؤں جو کہ مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ متحرک ہو جائے گا۔ سب اپنے چھپروں کو بچانے کی خاطر ہمارے گھر میں لگی آگ بجھانے دوڑ پڑیں گے۔" اماں کی ٹھہری ہوئی پر اعتماد آواز سن کر ان کے پورے کنبہ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ چھوٹے بیٹے نے ایک اور سوال کیا۔

"ہمارے گھر میں لگی آگ کو گاؤں والے کیونکر بجھانے آئیں گے، جو کہ ہمیں ڈاکوؤں سے بچانے نہیں آئے۔" اس بات کا بڑے بیٹے نے جواب دیا۔

"گاؤں والے ہمیں بچانے نہیں آئیں گے، وہ آگ بجھانے آئیں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے ہمارے گھر کی آگ نہیں بجھائی تو اس تیز ہوا میں پتنگے اڑ کر ان کے چھپروں پر جا گریں گے۔ تو ان کے گھر خود بخود دھو دھو کر کے جل اٹھیں گے۔ لہذا وہ اپنے گھروں کو آگ کی لپٹوں سے بچانے کے لیے ہمارے گھر کی آگ بجھانے دوڑے آئیں گے۔"

"جب آگ لگے گی تو روشنی بھی ہوگی اور روشنی ہوگی تو چھت پر جو لوگ بندوقیں اور رائفلیں لیے کھڑے ہیں، ہم ان کو پہچان سکیں گے کہ وہ واقعی ڈاکو ہیں یا ڈاکو نما ہیں۔ اندھیرے کی نفسیات الگ ہوتی ہے اور اجالے کی الگ۔ اجالے میں بڑے سے بڑا پاپی بھی شریف ہونے کا ڈھونگ کرتا ہے۔" اماں نے بہت ہی ہموار لہجے میں اپنی بات کہی۔

"لیکن جن گھروں پر چھپر نہیں ہیں۔ جو لوگ پختہ مکانوں میں رہتے ہیں، وہ کیونکر ہمارے گھر کی آگ بجھانے آئیں گے۔" چھوٹے بیٹے نے ایک بار پھر اپنا شک ظاہر کیا۔ اس پر بڑا بیٹا کہنے لگا۔

"پختہ مکانوں میں رہنے والے بھی آئیں گے بلکہ وہ چھپر والوں سے پہلے آئیں گے۔ انہیں دھویں کا خوف ہی ہمارے گھر کی آگ بجھانے کے لیے مجبور کردے گا۔ یوں بھی پختہ مکانوں میں رہنے والے لوگ زندگی کا مطلب دوسروں سے زیادہ اچھی طرح سے سمجھتے ہیں، اور وہ جانتے ہیں کہ معمولی سا دھواں ان کا دم گھونٹنے کے لیے کافی ہے۔ انہیں چھپر والوں سے کہیں زیادہ آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"بحث مت کرو۔ سر پر موت کھڑی ہے، ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، یہ سوچو کہ چھپر کو آگ

کیسے لگائی جائے؟" اماں نے ایک بار پھر ان سب کو چپ کر کے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ بڑے بیٹے نے فکرمندی کے انداز میں کہا۔ "چھت پر سے مسلسل فائرنگ ہو رہی ہے۔ دالان کا دروازہ کھول کر جو بھی صحن پار کرے گا، ڈاکوؤں کی گولیوں کا نشانہ بن جائے گا۔"

اماں کا پورا کنبہ پریشان تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ چھپر تک کیسے پہنچا جائے اور آگ کیسے لگائی جائے۔ سب کو خاموش دیکھ کر ایک چھوٹے بچے نے اماں سے کہا۔ "اماں، ماچس مجھے دو، میں چھپر میں آگ لگاتا ہوں۔" یہ سن کر اماں کے ہاتھ میں دبی ہوئی دیاسلائی پر پکڑ اور مضبوط ہو گئی۔

"اپنے ہی گھر میں آگ لگانا کہاں کی دانشمندی ہے۔" چھوٹے بیٹے نے بھرائی ہوئی آواز میں ایک بار پھر سوال کیا۔ اس پر بڑے بیٹے نے اسے ڈانٹتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم اپنے گھر کو آگ نہیں لگا رہے ہیں۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اپنی جانیں بچانا چاہتے ہیں۔ یوں بھی اگر اس آگ میں ہم جل بھی گئے، جل کر مر بھی گئے۔ تب بھی ہم اپنی آنے والی نسلوں کو بچانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔"

"تم لوگ خاموش رہو۔ جیسے ہی چھپر میں آگ لگے، تم سب مل کر اپنی پوری قوت کے ساتھ نعرہ لگانا کہ "گاؤں والو دوڑو آگ لگ گئی۔" اماں نے کہا۔ دالان کا دروازہ کھولا اور چیتے کی مانند صحن میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی دنادن کئی فائر ہوئے۔ اچانک چھپر کے نیچے ایک چمک پیدا ہوئی اور پھونس کا چھپر پلک جھپکتے ہی دھو دھو کر جلنے لگا۔ یہ دیکھ کر سرنگ نما گھر میں قید اماں کے کنبہ نے اپنی پوری قوت کے ساتھ شور مچایا۔ "گاؤں والو! دوڑو آگ لگ گئی۔" دیکھتے ہی دیکھتے پورا گاؤں آگ بجھانے کے لیے اماں کے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

آگ لگتے ہی چاروں طرف روشنی ہو گئی۔ روشنی ہوتے ہی چھت پر کھڑے ڈاکو نما جو کہ مسلسل فائرنگ کر رہے تھے، غائب ہو گئے۔ پورا گاؤں مستعدی کے ساتھ آگ بجھانے میں مصروف ہو گیا۔ جن کے پھونس کے چھپر تھے وہ اپنے چھپروں پر پانی ڈال کر گیلا کرنے لگے تاکہ ہوا کے زور سے اڑنے والے پتنگے ان کے چھپروں پر آ گر بھی جائیں تب بھی چھپر آگ نہ پکڑیں۔ جن لوگوں کے پختہ مکان تھے انہوں نے فوراً ہی اپنے دروازے کھول دیئے تھے تاکہ لوگ ان کے نلوں سے پانی بھر سکیں، وہ خود بھی بالٹیاں بھر بھر کر لوگوں کو مہیا کرا رہے تھے۔ جس سے آگ پر جلد سے جلد قابو پایا جا سکے۔

کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد گاؤں والوں نے آگ پر قابو پا لیا۔ آگ بجھتی دیکھ کر اماں

کے کنبہ اور گاؤں والوں کو اماں کا خیال آیا۔ انہیں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی بھینس کو بچانے کے چکر میں جھلس گئی ہیں۔ سب لوگ ان کے لیے فکر مند ہو گئے۔ انہیں جلد سے جلد سرکاری ہسپتال لے جانے کے لیے آناً فاناً میں بیل گاڑی کا بندوبست کیا گیا۔ اماں درد سے بری طرح کراہ رہی تھیں .... ہسپتال لے جانے کے لیے جب ان کو بیل گاڑی میں لٹایا گیا تو رات تین پہر بیت چکی تھی۔ OO

اشتیاق سعید

کہانی

اِستھتی سامانیہ ہے!

ریڈیو نے اعلان کیا، ٹی وی نے بانگ دی، اخباروں نے یہ جملے لکھے۔

"پچھلی رات شہر میں ہوئے سامپرادئیک دنگوں میں کچھ استھانوں پر چھٹ پٹ گھٹنائیں گھٹیں۔ بلوائیوں نے پتھراؤ کیا، سوڈا، واٹر کی بوتلیں پھینکیں، پٹرول بم کا استعمال کیا، پولیس نے آنسو گیس کے گولے داغے، کہیں کہیں فائرنگ بھی کی۔ پولیس آیوکت نے اٹھارہ تھانہ چھیتروں میں سنچار بندی کا نردیش دیا ہے۔"

سنچار بندی یعنی کرفیو! شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ زندگیاں گھر کی چار دیواریوں میں محبوس ہو گئیں۔ بازاروں، اسکولوں، سڑکوں، کالجوں، سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر کی چہل پہل، شور شرابے کو سناٹے کے وشال اژدہے نے نگل لیا...... میری بلڈنگ سے ملحق سڑک پر جہاں دن رات بسوں، ٹیکسیوں، نیز دیگر موٹر گاڑیوں کے ہارن کی پکار اور بریک کی چرمراہٹ گونجا کرتی تھی، وہاں اب فقط بھاری بوٹوں کی دھمک ہے۔ البتہ پچھلی شب اسی سڑک سے متصل جھونپڑپٹی سے دستی بم اور گولیوں کی دلدوز آوازیں اور آسمان کی جانب اٹھتے کثیف دھوئیں کے کفن میں لپٹے اَدھ مرے سماج کو انسانیت کی موت پر نوحہ کرتے ضرور سنا تھا۔ ایسا دلخراش نوحہ جس کی تاب نہ لا کر امن کا چاند یکجہتی کے بادلوں میں چھپ کر سسک پڑا۔ اخوت کے تارے اپنی روشنی کھو بیٹھے، تہذیب کا سورج منہ پر رات کی کالک مل کے نہ جانے کہاں جا ڈوبا۔ قومیت کے فلک پر محض تعصب کے ستارے اپنی ہولناک تجلی بکھیر رہے تھے۔ جن کے زیر سایہ بندوقیں گولیاں اگل رہی تھیں، شعلے لپک رہے تھے، تلواریں کھنک رہی تھیں۔ خون وکشت اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ پو پھٹتے پھٹتے اسپتالوں میں زخمیوں کا تانتا بندھ گیا۔ مردہ گھروں میں لاشوں کے انبار لگ گئے، قبرستانوں میں قبریں کھودتے گورکنوں کے ہاتھ شل ہو گئے، چتاؤں کے لیے لکڑیاں کم پڑنے لگیں۔ مرنے والوں کے پس ماندگان رو رو کے بے حال ہو رہے ہیں۔ جو بچ رہے تھے بظاہر تو خاموش تھے لیکن اندر ہی اندر وہ بھی رو

رہے تھے۔ اگر رو نہیں رہے تھے تو صرف وہ جنہوں نے اقتدار ہتھیانے کی خاطر اپنی شعلہ بیانیوں سے لوگوں کے ذہنوں کو مشتعل کر کے "ہندوتو" کے منچ پر بربریت کا تانڈو پیش کیا تھا۔ نتیجتاً کل تک جو خوشحال تھے آج وہ بدحال و خانہ برباد ریلیف کیمپوں و ریلوے اسٹیشنوں پر پناہ گزین تھے اور بڑی تعداد میں اپنے اپنے آبائی وطنوں کی سمت کوچ کر رہے تھے۔ اس کے برخلاف اقتدار پرست بھیڑیئے لہو سے سیر اپنی اپنی کمین گاہوں میں شراب و شباب سے شغل فرما رہے تھے اور برسراقتدار کوے سیاست کی منڈیر پر بیٹھے عروس البلاد یعنی شہروں کی دلہن کہی جانے والی بمبئی کا سہاگ لٹتے دیکھ رہے تھے۔

کرفیو کا آج پانچوں دن ہے۔ پچھلے پانچ دنوں سے شہر متواتر سلگ رہا ہے۔ گو شہر کے تمام حساس علاقوں میں فوج کا فلیگ مارچ جاری ہے۔ سی، آر، پی اور ایس، آر، پی کے کئی کئی پلاٹون تعینات ہیں۔ سٹی پولیس برابر گشت کر رہی ہے۔ گرچہ کرفیو کی خلاف ورزی کرنے والوں کو دیکھتے ہی گولی داغ دینے کا حکم ہے۔ بھلا پھر وہ کون لوگ ہیں جو ان سب انتظامات کے باوجود بے خوف و خطر آگ زنی کر رہے ہیں؟ پاکیزہ عصمتوں کو داغدار کر رہے ہیں؟ بے گناہوں کو لقمہ اجل بنا رہے ہیں؟ میں سوالات کی زنجیر میں جکڑتا جاتا ہوں کہ آخر پولیس والے اور حفاظتی دستے انہیں تشدد سے باز رکھنے میں ناکام کیوں ہیں؟ ان پر گولیاں کیوں نہیں برسا رہے ہیں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ اسی آن دروازے پر ہولے سے دستک ہوتی ہے۔ میں اس غیر متوقع دستک پر چونک پڑتا ہوں۔ غالباً اسی سبب سوالات کی زنجیر کڑیاں کڑیاں بکھر کر خوف کی صورت مجھ پر پھیل جاتی ہیں۔ اس سے پیشتر کہ خوف کی یہ کڑیاں میرے رگ و پے میں سرایت کر جائیں، دستک کے ساتھ دبی دبی آواز ہم آہنگ ہوتی ہے۔

"سنگھ صاحب! کواڑ کھولئے۔" آواز جانی پہچانی لگتی ہے پھر بھی تشویش ہوتی ہے کہ اس ناگہانی حالات میں کون ہو سکتا ہے؟ بیوی بھی خوف کا پیکر بن جاتی ہے۔ "آخر کون ہو سکتا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" میں لبوں کو سکوڑ کر لاعلمی کا اظہار کرتا ہوں۔ بیوی کا خوف مزید بڑھ جاتا ہے، وہ جھٹ ہاتھوں کو جوڑ کر اوپر نگاہیں اٹھا کر بدبداتی ہے۔ "ہے بھگوان۔ ہے سرسوتی میا، کوئی آفت ہو تو ٹال۔"

"آفت!" میں تھر تھر کانپنے لگتا ہوں۔ بیوی ہنومان چالیسا کا جاپ کرنے لگتی ہے۔ اس دوران باہر سے آنے والی دبی دبی آواز قدرے واضح ہو جاتی ہے۔ "سنگھ صاحب! کواڑ

کھولیے۔ گھبرایئے نہیں...... میں ہوں...... میں رام چندر!"

"آں! رام چندر بابو؟" میں یکسر نارمل ہو جاتا ہوں۔ خوف غلط کرنے کی غرض سے بیوی سے مخاطب ہوتا ہوں۔ "اپنے پڑوسی ہیں۔ رام چندر بابو...... شاید انہیں کسی چیز کی ضرورت ہوگی۔" اور لپک کر دروازہ کھول کے انہیں اندر کھینچ کر دروازہ بند کر لیتا ہوں۔ یہ عمل اس تیزی سے ہوتا ہے کہ میری سانسیں اکھڑ جاتی ہیں۔ باوجود اس کے میں ایک ہی سانس میں استفسار کرتا ہوں۔ "کہیے کیا بات ہے؟ میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟" جواب میں ان کے ماتھے پہ حیرانی کی سلوٹیں ابھر آتی ہیں۔ آنکھوں میں تردد کے سائے لہرانے لگتے ہیں۔ پھر ان کی تردد سے پر نگاہیں میرے اندر کی تلاشی لینے لگتی ہیں۔ مجھے سبکی کا احساس اور اپنے اندر کسی چور کا گمان ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی نگاہیں مبذول کرنے کی غرض سے صوفہ کی جانب اشارہ کر کے کہتا ہوں۔

"تشریف رکھیے نہ...... آپ ...... آپ کھڑے کیوں ہیں؟"

"ہنہ!" وہ معنی خیز ہنکاری بھر کے قدرے اطمینان سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوتے ہیں۔

"سنگھ صاحب...... معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کانڈ سے کافی بھئے بھیت ہیں۔"

نہیں، نہیں تو...... ایسا کچھ نہیں ہے...... میں...... میں تو محض آپ کے آنے کا مقصد دریافت کر رہا تھا۔"

"مقصد! اوہ سوری...... یہ تو میں بھول ہی گیا، بھائی اس میں دوش میرا نہیں۔ آپ کا ہے، جو آپ نے کواڑ کھولنے میں تاخیر کی۔ خیر چھوڑیے۔ خبروں میں سنا ہے آج حالات کچھ نارمل ہیں، اس لیے گھنٹہ بھر کے لیے کرفیو میں ڈھیل دی گئی ہے۔ سوچا اگر آپ نے خبریں نہ سنی ہوں تو مطلع کرتا آؤں۔"

"کیا حالات نارمل؟...... کرفیو میں ڈھیل ......؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ خبریں تو ہم نے بھی سنی ہیں۔ کیوں آشا؟" بیوی سے استفسار کرتا ہوں۔ بیوی اثبات میں سر کو خفیف سی جنبش دیتی ہوئی کہتی ہے۔ "جی، ہم نے تو ایسا کچھ نہیں سنا۔ لیکن رام چندر بابو...... اس کے برعکس یہ ضرور سنا کہ شرپسندوں نے ماہم رانچہ واڑی میں تین لکڑیوں کی بکھاریں پھونک دیں۔ دھاراوی میں دو بیکریوں کو لوٹ کر تہس نہس کر دیا...... ہاں! خبروں کے آخر میں یہ بھی سنا کہ شہر کے حالات سامانیہ ہیں۔ یہ جملہ غالباً پانچ دنوں سے میری سماعت سے ہم آہنگ ہو رہا ہے۔ بھلا بتایئے، شہر کے حالات اگر واقعی سامانیہ ہیں تو شہر میں کرفیو کیوں نافذ ہے؟

باوجود اس کے لوٹ مار، آتش زنی، آبرو ریزی کا کھیل کون کھیل رہا ہے؟ کہئے رام چندر بابو ...... بولئے نا...... آپ کھاموش کیوں ہیں!"

"سنگھ صاحب! یہ وقت بھاؤتاؤں میں بہنے یا مباحثہ کرنے کا نہیں ہے۔ فی الوقت کرفیو میں ڈھیل کا یہ ایک گھنٹہ بڑا اہم ہے۔ اس کا لمحہ لمحہ قیمتی ہے۔ چونکہ آج کے بعد یہ لمحات کب میسر آئیں گے، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ بہتر جانو تو فوراً باہر نکلو اور کھانے پینے کی چیزوں کا بساط بھر ذخیرہ کرلو۔"

رام چندر بابو کا یہ مشورہ سن کر اچھل پڑتا ہوں۔ "ارے واہ، رام چندر بابو...... واہ اچھی کہی آپ نے...... یقین جانئے دو روز سے تو چائے تک کے لالے ہیں۔"

"سنگھ صاحب...... اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں، چلئے جلدی کیجئے...... ورنہ ڈھیل کا وقفہ......!"

"ہاں ہاں! ضرور......" اور جھٹ الماری سے سو سو کی دو نوٹیں اور ایک بڑا سا تھیلا لے کر رام چندر بابو کی اگوائی میں بلڈنگ کی سیڑھیاں اترنے لگتا ہوں۔

ہم دونوں چہار دیواری کی حبس زدہ زندگی سے کھلی فضا میں آجاتے ہیں۔ یوں تو فضا میں اب بھی مہیب سناٹے کا زہر باقی ہوتا ہے۔ جبکہ ادھر ادھر اِکے دُکے لوگ دکھائی پڑتے ہیں، وہ بھی سہمے سہمے سے۔ سو میں بھی سہم جاتا ہوں، شاید اسی سبب بدن میں تھرتھراہٹ اور پیروں میں لغزش اتر آتی ہے۔ رام چندر بابو میری کیفیت تاڑ جاتے ہیں اور مجھے سر تاپا دیکھتے ہوئے پوچھ بیٹھتے ہیں۔

"کیا بات ہے سنگھ صاحب...... آپ کانپ کیوں رہے ہیں؟" میں جھینپ جاتا ہوں......

"نہیں...... نہیں تو۔ دیکھو کانپ کہاں رہا ہوں۔" اپنے دونوں ہاتھوں کو جو واقعی بے طرح کپکپا رہے ہوتے ہیں۔ ان کے آگے پھیلا دیتا ہوں۔ پھر تھرتھراتے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ "وہ کیا ہے نا۔ رام چندر بابو! دو روز سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے نا...... اس لیے: شاید کمزوری۔"

"کمزوری ہی تو ان دنگوں کا سبب ہے سنگھ صاحب۔ حکومت کی کمزوری، رہنماؤں کی کمزوری، مذہبی پیشواؤں کی کمزوری، قومی دھارے کی کمزوری، فکر و شعور کی کمزوری، کردار و اخلاق کی کمزوری! کمزور تو سارا ملک ہو گیا ہے، سنگھ صاحب!...... کیا کیجئے گا...... کیا کھلائیے گا؟ کون سی ٹانک کارگر ہوگی......؟ انسانی لہو؟ ارے لہو تو بلڈ بنکوں کی میراث ہے۔ پر افسوس!

ہمارے یہاں اسے بے دریغ گلی کوچوں، سڑکوں، گٹروں میں بہایا جا رہا ہے۔"

میں خاموش سوچنے لگتا ہوں۔ رام چندر بابو بجا فرما رہے ہیں کہ کمزوری ہی دنگوں کا سبب ہے۔ واقعی اگر حکومت کمزوری برتنے کی بجائے سختی سے پیش آتی تو یقیناً اقتدار کی بساط پر مسجد مندر کو مہروں کی صورت میں استعمال کرنے والے سیاسی بازی گروں کی مات ہو جاتی۔ حیف! ایسا نہ ہو کہ مات مسجد کی ہوئی جو سیکولرازم کی بلند و روشن مینار تھی۔ نہیں، نہیں مات تو مندر کی ہوئی ہے...... نہیں...... شاید دونوں کی۔

چونکہ عمارت تو ایک ہی تھی، بس نام جدا جدا تھے...... مسجد...... مندر! یعنی کہ یہ بات ان سیاسی کھلاڑیوں کی ناتجربہ کاری کی ضامن ہے جو ملک سے سیکولرازم کے سایہ دار درختوں کو کاٹ کر ہندوتو کی کمزور بیلیں لگانے کے خواہاں ہیں۔

"سنگھ صاحب...... کہاں کھو گئے بھائی؟"

"آں...... آں!" رام چندر بابو کی آواز میری سوچیں منقطع کر جاتی ہیں۔ "لگتا ہے میری بے سر پیر کی باتوں کا کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے آپ نے؟"

"نہیں، نہیں ایسی بات نہیں ہے...... دراصل سیکولرازم و ہندوتو کے چکرویو میں الجھا ہوا تھا۔"

"سیکولرازم و ہندوتو...... ہنہ...... بکواس...... سب بکواس ہیں۔ سنگھ صاحب! ایک دم بکواس۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یوں سمجھ لیجئے ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ یوں بھی اپنے یہاں تو سیکولرازم کی فصیل نعروں کے دوش پر قائم ہے۔ سوچئے، بھلا ایسے میں یہ فصیل کتنی دیرپا، کتنی پائیدار ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو انہیں دھار مکتا و جاتیتا کی ست سے ست رو ہوائیں بھی درہم برہم کر دیتی ہیں۔"

باتوں ہی باتوں میں ہم گلی عبور کر کے اسٹیشن کی جانب جانے والی سڑک پہ آ جاتے ہیں۔ اس سڑک پر ابھی چار چھ قدم بھی نہیں بڑھے ہوتے ہیں کہ عقب سے فائرنگ کی آواز گونجتی ہے۔ آواز پر بیک وقت ہم دونوں چونک کر پلٹتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ایک انسپکٹر ریوالور تانے کھڑا ہے۔ اسی اثناء میں قریب کی گلی سے تین بندوق دھاری کانسٹبل نکل کر تقریباً دوڑتے ہوئے ہماری سمت آتے ہیں۔ انسپکٹر چیختا ہے۔ "دوگان نا کھچون آن" (دونوں کو کھینچ کر لے آ)۔ آن کی آن میں کانسٹبل ہم دونوں کو پکڑے انسپکٹر کے پاس لے آتے ہیں۔ انسپکٹر پتلون کی جیب سے برانڈی کی بوتل نکال کر تین چار گھونٹ شراب حلق میں انڈیلتا ہے پھر خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ڈپٹ کر پوچھتا ہے۔ "کیا رے...... کدھر گیا تھا تم

لوگ لفڑا کرنے کو؟"

میں اس کی خشمگیں نگاہوں کی تاب نہ لاکر تھر تھر کانپنے لگتا ہوں، مگر رام چندر بابو پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ قدرے مطمئن لیکن متعجب لہجے میں گویا ہوتے ہیں۔

"لفڑا! کیسا لفڑا......؟" انسپکٹر دوبارہ شراب حلق میں انڈیلنے لگتا ہے۔ اب تو غٹ غٹ غٹ ایک ہی بار میں ساری شراب پی جاتا ہے اور خالی بوتل ایک طرف اچھالتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان سے استفسار کرتا ہے...... "تیرے کو...... لفڑا...... نئی معلوم؟"

"جی نہیں......!"

"سالا چوتیا بناتا ہے...... پولیس کو چوتیا بناتا ہے...... نام بول تیرا۔"

"گلاب سنگھ۔"

"تیرے کو پوچھا کیا؟ سالا تو تو تھو بڑے سے ہی بھیا دکھتا ہے۔" پھر اپنی نشے سے بوجھل آنکھوں سے ایک کانسٹبل کو دیکھتے ہوئے حکم دیتا ہے۔ "بالتورے اچا جھرتی کاڑھون گھے۔" (بالتورے اس کی تلاشی لے) اور وہ کانسٹبل میری جیبوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ سو سو کے دونوں نوٹ نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لیتا ہے۔ اس دوران دوسرا کانسٹبل بندوق کی بٹ سے رام چندر بابو کو ٹہوکا دیتا ہے۔ "کھڑا کھڑا تھوبڑا کیا دیکھتا ہے؟ ساب کو نام بول۔" اس کی اس حرکت سے رام چندر بابو جھنجھلا جاتے ہیں۔

"آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ کیوں نام جاننا چاہتے ہیں؟ کیا واسطہ ہے آپ لوگوں کو میرے نام سے؟ کیا ہم بدمعاش، لچے لفنگے لگتے ہیں...... یا ہم ہی دنگائی ہیں؟ صاحب افسوس ہے مجھے آپ کے اس شرمناک رویے پر...... پولیس تو عوام کی......!" ان کا جملہ مکمل ہو بھی نہیں پایا تھا کہ "تڑاخ" سے انسپکٹر کا ایک زناٹے دار تھپڑ گال پر پڑتا ہے۔

"سالا...... مادر...... پولیس کو گالی دیتا ہے۔" تڑاتڑ تین چار تھپڑ اور رسید کرتا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے کانسٹبل بھی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس قدر مارتے ہیں کہ وہ بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑتے ہیں۔ انسپکٹر انہیں بالوں سے پکڑ کے اٹھاتے ہوئے کہتا ہے۔ "اب بول نام۔" ایک کراہ کے ساتھ ان کی زبان سے بمشکل تمام ادا ہوتا ہے۔ "انسان!......

"انسان، منجھے لانڈیا؟ (انسان یعنی لانڈیا...... لانڈیا مسلمانوں کو حقارت سے کہا جاتا ہے) ہوئے ساجیب۔ مالا پہلاچ کڑلا ہوتا۔" (ہاں صاحب مجھے پہلے ہی ایسا لگا تھا) ایک کانسٹبل حامی بھرتا ہے۔ پھر تینوں ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کنایے ہوتے ہیں۔ پھر سب کے سب ان پر لاتوں گھونسوں اور

بندوق کی بٹوں سے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے اس قدر جنونی ہو جاتے ہیں کہ ہر لات، ہر گھونسے پر ان کی زبان سے نکلتا ہے۔ "بول جے شری رام...... بول جے سیارام۔ بول جے مہاراشٹرا..... "آخر مارتے مارتے لہولہان کر دیتے ہیں۔ انسپکٹر کو اس پر بھی اکتفا نہیں ہوتا۔ وہ ریوالور سے دھائیں دھائیں دو راؤنڈ فائر کر دیتا ہے۔ ایک پیر پر...... دوسرا سینے پر! سینے سے خون ابل پڑتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔

بیوی مجھے خالی ہاتھ، ہانپتے ہوئے پسینے میں شرابور دیکھ کر سراپا سوال بن جاتی ہے۔ "کیا ہوا؟ آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟" کوئی جواب دیئے بغیر خود کو دھم سے صوفے پر گرا دیتا ہوں۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے مجھے کچھ ہوش نہیں۔ ہاں! ہوش جب آتا ہے تو خود کو پلنگ پہ لحاف کے اندر پاتا ہوں۔ نتھنوں میں امرت انجن بام کی بو بسی ہوتی ہے اور کانوں میں ٹی وی پر خبریں نشر ہونے سے پہلے کی موسیقی گونج رہی ہوتی ہے۔ غنودگی کے باوجود اپنی ساری توجہ ٹی وی پر مرکوز کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں۔ خبریں نشر ہوتی ہیں۔ نیوز ریڈر کی زبان سے کیا ادا ہو رہا ہے، کچھ سن پاتا ہوں، کچھ نہیں سن پاتا...... ہاں! اتنا ضرور سنتا ہوں کہ "آج پر بھات کال کرفیو میں دی گئی۔ ڈھیل کے دوران مہانگر میں کوئی آپریہ گھٹنا نہیں گھٹی۔ کیول کالینا ودیا نگری کے سمیپ الپ سنکھیوں کی ٹولی نے ایک دیکتی کی گولی مار کر ہتیا کر دی۔"

"نہیں...... جھوٹ ہے یہ۔" میں بے ساختہ چیخ پڑتا ہوں۔ مگر افسوس! نطق دم توڑ دیتا ہے۔

OO

افشاں ملک

کہانی

بُوا نہیں ملی

"اماں میں لوٹ آیا۔" عبدالمتین نے اپنی والدہ امینہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ رات گھر آئی تھی۔ بجلی غائب ہونے کی وجہ سے شہر بھوتوں کے ڈیرے جیسا لگ رہا تھا۔ بازار اور محلے میں لوگوں نے اپنی طرف سے روشنیوں کا جو بندوبست کر رکھا تھا وہ اندھیرے میں کالی جلد پر برص کے داغوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ متین کا لہجہ اُس سپاہی جیسا تھا جو میدان جنگ سے شکست کھا کر لوٹا ہو۔ چار دن کے سفر نے اسے اتنا نہیں توڑا تھا جتنا ان ہیبت ناک مناظر نے توڑا جنہیں وہ دیکھ کر واپس آیا تھا۔ کپڑے گندے تھے، شیو نے بڑھ کر چہرے کو بری طرح بدہیئت بنا دیا تھا۔ کمرے میں جل رہے پیٹرومیکس کی روشنی کے باوجود گھر کا ماحول ایسا لگ رہا تھا جیسے اس روشنی سے محروم ہو جو چیزوں کو مسرت اور حوصلے سے بھر دیتی ہے۔

پلنگ پر اکڑوں بیٹھی ادھیڑ عمر کی امینہ نے ٹوٹی ہوئی آواز میں متین سے کہا۔ "بیٹے لایا نہیں کلثوم کو؟" متین نے ماں کی اضطراب سے بھری آواز سنی تو اسے لگا جیسے ایک زہر اس کے اندر اترتا جا رہا ہو، جو اس زہر سے بھی زیادہ مہلک ہے جسے وہ اب تک پیتا رہا تھا۔

"نہیں اماں، بوا مجھے ملی نہیں۔" متین کے ہونٹوں سے اضطرار اً جواب میں نکلا۔ وہ چپ ہو گیا جیسے اس سے آگے بتانے کا حوصلہ نہ جٹا پا رہا ہو۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے متین نے سامنے رکھے اسٹول پر اپنے پاؤں پھیلا لیے اور سر کرسی کی پشت سے ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں، جیسے وہ بہت تھک گیا ہو۔

پوچھا۔ "اماں گھر کے باقی لوگ کہاں گئے؟"

"نصیر پور گئے ہیں، وہاں سورت سے بھاگ کر تمہارے ابوّ کے کچھ عزیز کل ہی آئے ہیں۔ ان سے ملنے، کچھ سامان بھی لے گئے ہیں ان کے لیے۔ تم نے بیٹے کلثوم کو سب سامان تو پہنچا دیا ہو گا جو ہم نے ان کے لیے بھیجا تھا۔ ضرورت کی چیزیں اور نقدی بھی۔"

"بوا مجھے ملی کہاں اماں؟ میں نے بہت ڈھونڈا، پھوپھا جی اور بچے بھی نہیں ملے۔"

"تو کیا کلثوم کا گھر نہیں ملا تجھے؟" امینہ نے مایوسی بھری نظریں متین کے چہرے پر

ڈالتے ہوئے پوچھا۔ پیٹرومیکس سے نکلتی ہوئی چھوٹے گیس سلنڈر کی سائیں سائیں پورے کمرے میں ایک وحشت ناک گونج پھیلا رہی تھی اور اس کی روشنی میں کمرہ اپنی اداسی کو چھپانے میں ناکام سا لگ رہا تھا۔ جب آدمی کا دل ٹوٹا ہو ذہن میں اندیشے بھرے ہوں اور احساس کسی انہونی کے ڈر سے لرز رہا ہو تو ہر چیز اداس اداس اور غیر معتدل نظر آنے لگتی ہے۔

امینہ اور اس کے شوہر رحمان نے پچھلے ایک ہفتے میں کتنی ہی بار فون کر کے کلثوم سے رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن یہ ہو نہیں سکا' تب یہ جان کر کہ حالات اب کنٹرول میں ہیں' رحمان نے نقدی اور ضروری سامان لے کر متین کو احمد آباد روانہ کیا اور ہدایت کی کہ وہ کلثوم اور اس کے بچوں کو ساتھ ہی لے کر آئے۔

پیٹرومیکس کی سائیں سائیں میں امینہ نے پلٹ کر اپنے جوان بیٹے متین سے پوچھا۔

"ارے بیٹا متین! وہاں گیا بھی تھا کہ نہیں۔ آس پاس سے ہی لوٹ آیا ہے کیا؟"

"گیا تھا اماں' گیا تھا۔" متین نے دھیمے لیکن مایوسی سے بھری آواز میں اپنی ماں کے سوال کا جواب دیا۔ بولا۔ "تو سننا چاہتی ہو تو پھر پوری بات سنو۔" امینہ نے تھوڑا پہلو بدل کر چہرہ اپنے بیٹے کی طرف گھما لیا اور اس طرح ہمہ تن توجہ ہو کر بیٹھ گئی۔

متین نے آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا۔ اسٹول پر پھیلے ہوئے پاؤں سکوڑے اور کرسی پر سیدھی پوزیشن میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ "جب میں احمد آباد کے اسٹیشن پر اترا تو شام کے قریب پانچ بج چکے تھے۔ گاڑی کئی گھنٹے لیٹ تھی۔ میں نے اسٹیشن سے باہر آکر ایک آٹو رکشہ نرودہ پٹیہ جانے کے لیے کرائے پر کی۔ تم تو جانتی ہو اماں' وہ شہر میرے لیے کوئی اجنبی شہر نہیں۔ میں اس سے پہلے بھی وہاں کئی بار جا چکا ہوں۔ اماں مجھے پورا یقین تھا کہ میں کچھ ہی دیر میں نرودہ پٹیہ پہنچ کر وہ گھر تلاش کرلوں گا جہاں بوا رہتی ہیں۔ آٹو رکشہ لمبی لمبی سڑکوں سے گزرتی ہوئی اور جلی دکانوں کو پیچھے چھوڑتی فراٹے سے آگے بڑھتی رہی۔ کافی آگے پہنچ کر جب ایک موڑ آیا تو رکشہ ڈرائیور نے بریک لگایا۔ رکشہ ڈرائیور جو حلیے سے ایک سکھ نوجوان دکھائی پڑتا تھا کڑک کر بولا۔ "کتھے جانا ہے جی؟ نرودہ پٹیہ یہی ہے۔"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا' وہاں کوئی ایسی نشانی نہیں دکھائی دی جو اس سے پہلے کے سفر میں میں نے دیکھی ہو۔ مجھے یاد آیا کہ ایک راستہ شاید اس سے اگلے موڑ سے بائیں طرف کو مڑتا ہے اور آگے چل کر پھر دائیں طرف کو مڑ کر اسی گلی میں داخل ہو جاتا ہے جہاں کلثوم بوا رہتی ہے۔ پرانی یاد کو تازہ کرتے ہوئے میں نے ڈرائیور سے کہا کہ رکشہ اگلے موڑ تک لے چلو۔

اگلے موڑ پر پہنچ کر میں نے اسے بائیں راستے چلنے کو کہا۔ بائیں کے آخری موڑ پر پہنچ

کر میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ دائیں طرف جانے والے راستے پر موڑ لے۔ سڑک سنسان تھی' شام کی دھندلی کرنوں نے ماحول کو اور بھی ڈراونا بنادیا تھا۔ میرے دونوں طرف جلے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکان اور آگ سے خاکستر ہو گئی دکانیں تھیں۔ سڑک پر اینٹوں' پتھروں کے ڈھیر تھے۔ لگتا تھا کئی دن سے سڑکوں کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ طوفان اپنے پیچھے جو بھیانک منظر چھوڑ گیا تھا' وہ جوں کا توں تھا۔ دائیں طرف کی سڑک پر آگے جا کر میں نے آٹو رکشہ رکوائی' نیچے اترا اور اپنی پشت کی طرف کی جلی ہوئی دکانوں کو ایک ایک کر کے دیکھنے لگا۔

اب تک میرے کہنے سے اِدھر سے اُدھر رکشہ گھماتے رہنے والا ڈرائیور میری اس حرکت سے کافی بیزار ہو چکا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو جی۔ تسی بولو جانا کتھے ہے؟"

میں محسوس کر رہا تھا کہ رکشہ ڈرائیور کے لہجے میں غصہ ہے اور وہ میرے صحیح جگہ نہ پہچاننے کی وجہ سے جھنجھلا رہا ہے۔ میں نے نرم لہجے میں اسے شانت کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں سلطان بھائی' قدوس بھائی کی ایک ٹیلرنگ شاپ ہوا کرتی تھی۔ اب دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ ہم باہر سے کبھی کبھار آنے والے لوگ ایسی ہی نشانیاں اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے ہیں۔ انہیں نشانیوں کو دیکھ کر ہمیں یاد آجاتا ہے کہ کس سڑک پر کس گلی میں اور کس مکان پر ہمیں جانا ہے۔ سلطان بھائی' قدوس بھائی کی دکان کے آگے چوتھی دکان کے پاس سے گلی مڑتی تھی اور اس سے آگے......"

"اوے! کیا سلطان بھائی' قدوس بھائی کرتا ہے۔ ادھر کوئی نشانی نہیں رہی ہے۔ سب جل گیا۔ ترنت بول کتھے چھوڑ دوں۔"

"مجھے کچھ دیر سوچ لینے دو' میں یاد کرتا ہوں کہ مجھے کدھر جانا چاہئے۔" سوچا' نشانیاں مٹ جاتی ہیں تو سڑکیں اور راستے کس طرح اجنبی بن جاتے ہیں۔ آدمی جب اپنی نشانی کھو بیٹھتا ہے تو دکانوں اور مکانوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟ سلطان بھائی' قدوس بھائی کا بورڈ تھا تو مجھے اپنی خاموش زبان میں بتا دیتا تھا کہ آگے چل کر دائیں طرف کی گلی میں مڑ جانا اور وہاں سے سیدھے ہاتھ کو جانے والے نکڑ پر جو تیسرا مکان ہوگا وہی بوا کلثوم کا ہے۔ اب ٹیلرنگ کی دکان کا بورڈ نہیں تو جیسے تمام راستے ہی کھو گئے۔

میں اپنے خیالوں میں گم رکشہ میں بیٹھا تھا کہ ڈرائیور نے سخت لہجے میں ٹوکتے ہوئے کہا۔

"اوے باؤ! رکشہ تو نے خرید تھوڑے ہی لیا ہے۔ چل سیدھے ہاتھ سے پیسے نکال اور رستہ لے۔"

میں نے ڈرائیور کی خشونت بھری آواز سنی اور رکشہ سے نیچے اترا۔ میٹر دیکھنے سے پہلے ہی ڈرائیور نے ایک مشت پیسوں کا بل میرے کانوں میں انڈیل دیا۔ سناٹے سے بھری چوڑی گلی اکیلا میں بھیانک فساد کو جھیل چکی دکانیں اور مکان ایک دہشت تھی جو پورے ماحول میں پسری ہوئی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں ڈرائیور سے کرائے کو لے کر کچھ حجت کرتا۔ عدم تحفظ کا احساس کس طرح آدمی کو سپر انداز ہونے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ لمحہ بھر میں میں نے سوچا اور جتنے پیسے آٹو رکشہ والے نے مانگے تھے چپ چاپ اسے تھما دیے۔ رکشہ مین روڈ کی طرف مڑ گئی۔ اب میں اکیلا تھا اور بجلی کے ایک کھمبے سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے جھکتی آ رہی تھی۔ جلی ہوئی دکانیں اور مکان شام کی میلی روشنی میں کچھ اور بھیانک لگنے لگے۔ میں نے پھر اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ خیال آیا کہ سلطان بھائی 'قدوس بھائی کی ٹیلرنگ شاپ سے آگے چل کر دائیں ہاتھ کو جو ذیلی سڑک مڑتی ہے اس پر کچھ دور جا کر ایک دو منزلہ عمارت تھی جس میں اوپر کی منزل پر موڈرن کوچنگ سینٹر کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس کوچنگ سینٹر سے آگے چل کر ایک اور گلی مڑتی تھی جس میں تیسرا گھر بوا کلثوم کا تھا۔ اس یاد کو اپنے ذہن میں لیے میں دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ قدم زمین پر تھے اور نگاہیں اوپر لگے سائن بورڈوں پر۔ اپنے اندازے کے مطابق میں اس مقام پر پہنچا جہاں موڈرن کوچنگ سینٹر کا بورڈ ہونا چاہئے تھا۔ مگر آگ ساری پہچانوں کو چاٹ چکی تھی۔ نیچے سڑک پر جلا ہوا اور مڑا تڑا بورڈ اوندھے منہ پڑا تھا......

"جلدی بات پوری کر متین۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ جلدی بتا کلثوم ملی یا نہیں؟" متین کی ماں نے گھبراہٹ اور اضطراب کے ملے جلے لہجے میں تقاضہ کیا۔ اسے جلدی تھی اور وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کی نند 'نندوئی اور ان کے بچوں پر کیا گزری؟ کلثوم کا شوہر قادر علی 'بیوی کلثوم اور دو بچوں کے ساتھ لمبے عرصے سے احمد آباد کے محلہ نرودہ پٹیہ میں رہ رہا تھا اور یوسف بھائی احمد بھائی کی سلک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ بوہرا ذات کے اس مسلم خاندان میں قادر کی خاص اہمیت تھی۔ مصروفیت کے باعث وہ پچھلے تین سال سے وطن نہیں لوٹا تھا۔

متین نے ماں کا اضطراب دیکھا تو اذیت بھرے لہجے میں ماں سے کہا۔ "اماں پوری بات سنے بغیر تم صورت حال سے واقف نہیں ہو سکو گی۔ تمہیں لگے گا کہ میں نرودہ پٹیہ کے اس مکان تک گیا ہی نہیں جہاں بوا کلثوم رہتی تھی۔ دور کسی مندر سے جاگرن کے بول ہوا کے جھونکوں کے ساتھ تیرتے ہوئے آتے اور سناٹے میں ایسے لگتے جیسے ماحول میں بے جا مداخلت کر رہے ہوں۔

متین نے دھیان سے ٹکٹکی لگائے اپنی طرف دیکھ رہی ماں سے کہا۔ "تب اماں! میں نے اوندھے منہ پڑے سائن بورڈ کو سیدھا کیا اور شام کی دھندلی روشنی میں اس پر لکھے ہوئے

الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ آگ اس پر لکھے ہوئے الفاظ کو چاٹ گئی تھی۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اس پر جلنے سے پہلے کیا لکھا ہوگا۔ لگا کہ یہ آگ نہیں بلکہ جنون ہے جو ساری نشانیوں کو زندگی کی ساری علامتوں کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ آگ تو ایک وسیلہ ہے' بھسم کرنے والا تو جنون ہی ہے۔"

متین نے ایک لمبی گرم سانس اپنے نتھنوں سے باہر چھوڑی۔ اداس اداس نظروں سے خلاء میں دیکھا پھر بولا۔ "اماں ایک بار پھر میں کشمکش میں پڑ گیا۔ یہ دوسری نشانی بھی مجھے دھوکا دے گئی تھی۔ پھر بھی میں ایک اندازے کے سہارے آگے بڑھا۔ سڑک پتھروں سے پٹی پڑی تھی۔ میرے دائیں بائیں جو مکان تھے اب سناٹے میں کالے بھوت بنے کھڑے تھے۔ تبھی میں نے دیکھا کہ گیارہ بارہ برس کے دو لڑکے ایک مکان کے جلے ہوئے سامان میں کچھ ٹٹولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مکان کا صدر دروازہ آگ نے جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ کواڑ نہ رہنے کے باعث میں اندر تک ہر چیز دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا' گھر کی چھوٹی سی انگنائی میں لوہے کا ایک تار اب بھی دائیں بائیں دو ہکوں کے ساتھ بندھا ہے اور اس پر کسی بچی کی ادھ جلی فراک ٹنگی ہے۔ شاید آگ اسے آدھا ہی جلا پائی تھی۔ بچی کہاں ہے؟ بڑا تیکھا سوال میرے ذہن میں ابھرا۔ اس کا جواب نہ میرے پاس تھا اور نہ لوہے کے اس تار کے پاس۔ لڑکے جلے ہوئے سامان سے اپنے مطلب کی چیزیں نکالنے کی کوشش میں جٹے تھے۔ میں نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"یہاں ایک قادر علی ہوا کرتے تھے بچو! کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہیں؟"

دونوں لڑکوں نے سر اٹھا کر غضبناک نظروں سے مجھے دیکھا اور گجراتی زبان میں کوئی ایسا جواب دیا جسے میں نہیں سمجھ پایا۔ صرف اندازہ کر سکا کہ یہ مجھے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے یہاں سے بھاگ جانے کو کہہ رہے ہیں۔ میں نے سوچا' لڑکے مجھے اپنے کام میں رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔ واپس مڑ کر میں پھر سڑک پر آگیا۔ شام پوری طرح گھر آئی تھی اوپر نظر اٹھائی تو دیکھا کہ دوسری منزلوں پر کچھ روشنیاں جھلملا رہی ہیں۔ خواہش ہوئی کہ ان میں سے کسی ایک گھر میں جا کر پوچھوں کہ قادر بھائی کا کیا ہوا؟ ہمت نہیں ہو پا رہی تھی لیکن ایک گھر کے سامنے آکر سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ دوسری منزل پر پہنچا تو مجھے گھر کے زندہ لوگ پرچھائیوں کی طرح دکھائی دیئے۔ وہ شاید میرے آنے سے پہلے تک آپس میں بات چیت کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے مجھے دیکھا' ان کے چہروں پر دہشت کے سائے منڈلانے لگے۔ سب کے سب میری طرف اس طرح ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے جیسے میں آدمی نہیں چھلاوا ہوں۔

اماں! اخلاقی روایتیں کیسے ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ وہاں کسی نے مجھے بیٹھنے کے لیے

نہیں کہا۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ کون ہو...... ؟ ایک سنگین دہشت نے ساری اخلاقی روایتوں کو توڑ کر چکنا چور کر دیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اس گھر کے مکینوں سے پوچھا۔ "کیا آپ قادر بھائی کو جانتے ہیں؟ میں ان کی خیر خبر لینے آیا ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے ان کے گھر کا پتہ بتا دیں۔"

میرا سوال سن کر ایک بزرگ شخص نے میرے ساتھ قدرے نرمی کا برتاؤ کیا۔ "ہم گھر تو بتا سکتے ہیں پر 'قادر بھائی کو نہیں۔" اور یہ کہہ کر وہ مجھے بالکونی تک لائے اور جلے ہوئے مکانوں کے ہجوم تیز پتھروں سے بھری پڑی گلیوں کے درمیان انگلی سے اشارہ کر کے بتانے لگے۔

"تم جب اس سڑک سے گزر کر بائیں ہاتھ والے راستے پر مڑو گے تو آگے چل کر کوئی سو قدم کے فاصلے پر ایک اور گلی جو دائیں طرف مڑتی ہے اس میں گھس کر چوتھا مکان قادر بھائی ہی کا تھا' لیکن اب وہاں کوئی نہیں ہے۔ تم اس مکان کو پیپتے کے ایک پیڑ سے پہچان سکتے ہو' جو پوری طرح جل گیا ہے' لیکن دھرتی نے ابھی اس کے تنے کو اپنی گود سے الگ نہیں کیا ہے۔"

اس اجنبی شخص کے الفاظ بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندے۔ "یہ دھرتی ہی ہے جو اپنے جلے ہوئے بچوں کو بھی چھاتی سے لگائے رکھتی ہے۔ آدمی تو جلا کر اپنے لوگوں کو کوڑے پر پھینک دیتا ہے۔"

یہاں تک پہنچ کر متین نے اپنی ماں کے مرجھائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ خوف کے جذبے کے ساتھ ملے ہوئے کشمکش کے جذبے نے امینہ کا چہرہ بدہیئت بنا دیا تھا۔ گیس کی پیلی روشنی میں ماں کا پہچانا ہوا گول چہرہ اسے کچھ لمبوترا سا دکھائی دیا۔ ذہنی حالتیں چہروں کو کیسے بدل دیتی ہیں۔ ایک لمحے کے لیے متین کو حیرت ہوئی اور اس نے ایک عجیب سے عدم تحفظ کے احساس کے تحت اٹھ کر گھر کا دروازہ بند کیا۔ کنڈی لگا کر لوٹا تو ماں کلثوم کے بارے میں جاننے کے لیے مضطرب بیٹھی تھی۔

"جلدی بتا متین کلثوم ملی یا نہیں؟"

میں اس شخص کی بتائی ہوئی نشانیوں کو ذہن میں محفوظ کرتا ہوا زینے سے نیچے اترا اور شام کے دھندلکے میں تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا ان راستوں کی طرف بڑھنے لگا جن کی نشاندہی اس اجنبی شخص نے کی تھی۔ میں اس جلے ہوئے پیڑ کی تلاش میں تھا جو مجھے بتاتا کہ یہی کلثوم بوا کا گھر ہے جسے فسادیوں نے آگ کے حوالے کر دیا۔ میرے ایک ہاتھ میں اٹیچی تھی جسے میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دائیں ہاتھ سے بائیں اور بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں تھام رہا تھا۔ ابھی میں اس گلی کے نکڑ پر ہی پہنچا تھا جہاں سے اس دوسری گلی کی طرف مڑنا تھا جس جگہ اجنبی

شخص کا بتایا ہوا اجلا ہوا پیڑ ہونا چاہیے تھا۔ تبھی نیچے سے موٹر سائیکل کی دھڑ دھڑاتی ہوئی آواز‘ اور بار بار ہارن بجانے کا شور میرے کانوں سے ٹکرایا۔ حیرت ہوئی کہ یہ تنگ سڑک جہاں آمدورفت نہیں ہے‘ بھیڑ نہیں ہے‘ مسافر نہیں ہیں‘ محلے کے بچے جہاں اچھل کود نہیں مچا رہے ہیں‘ وہاں آخر موٹر سائیکل سوار کو بار بار ہارن بجانے کی کیوں ضرورت پیش آ رہی ہے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ موٹر سائیکل کو بریک لگے اور وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ دو اسٹار والا ایک داروغہ موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ اس نے موٹر سائیکل ترچھی کر ایک پیر زمین پر ٹیک لیا اور گھمنڈ بھری آواز میں ڈانٹ کر مجھ سے پوچھا۔

”ادھر کہاں سے آیا ہے رے؟“ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دوں‘ میں نے دیکھا کہ داروغہ نے ان دونوں بچوں کو بالکل ایک دوسرے سے سٹا کر اور ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں باندھ کر موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھا رکھا تھا جنہیں میں ایک جلتے ہوئے گھر میں قیمتی سامان کھوجتے ہوئے چھوڑ آیا تھا۔

داروغہ نے گھور کر پہلے میری طرف دیکھا پھر ان بچوں کی پیٹھ پر دھول مارتے ہوئے بولا۔

”کیوں بے حرامیو! کیا چرا کر لائے ہو؟ تمہارے باپ کا مال بھرا پڑا ہے یہاں۔ سالے چوٹٹے کہیں کے۔“

دونوں بچے داروغہ کی ڈانٹ سن کر سہم گئے۔ میں نے دیکھا کہ ڈرے ہوئے بچوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور وہ خوف سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ داروغہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے چھوٹے شکاروں کو چھوڑ بڑے شکار کو دبوچنا بہتر سمجھا۔ دھکا دے کر دونوں کو موٹر سائیکل سے نیچے اُتارا اور خشونت بھری آواز میں بولا۔

”کیا سمیٹ کر لائے ہو سالو؟“ دونوں بچے سہمے ہوئے چپ کھڑے تھے۔ داروغہ نے دونوں کی جیبیں ٹٹولیں‘ ان میں سے جلے ہوئے زیوروں کے کچھ حصے‘ نیز کچھ اور سامان برآمد ہوا۔ داروغہ نے برآمد شدہ سامان جلدی جلدی موٹر سائیکل کی ڈگی میں ٹھونسا اور پھر دونوں کے چوتڑوں پر لات مار کر بولا۔ ”جاؤ بھاگو سالو۔“ بچے داروغہ سے بچ کر بگ ٹٹ بھاگے پھر داروغہ میری طرف مخاطب ہوا“

ادھیڑ عمر کی عورت پتھر کی مورتی کی طرح پلنگ کے ایک کنارے پر زانو کے نیچے تکیہ لگائے بیٹھی پوری توجہ سے متین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماں کی خوف زدہ آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے متین نے اپنی آپ بیتی آگے بڑھائی۔

"بچے بھاگ گئے تو داروغہ میری طرف دیکھ کر غرایا۔ "کیوں بے، کہاں سے آیا ہے؟" میں نے داروغہ کے سوال کا مختصر جواب دیا اور یہاں آنے کا سبب بتایا لیکن وہ چلا کر بولا۔

"جھوٹ بول رہا ہے سالے۔"

گھڑکی کے لہجے میں مجھے حوالات میں بند کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے داروغہ پھر چلایا۔

"اٹیچی میں کیا ہے؟ ہتھیار لایا ہے کیا اپنی ماں کے یاروں کو دینے کے لیے؟" میں اکیلا تھا، گلی سنسان تھی، شام تھی، حوالات میں ٹھونس دینے کی دھمکی کا خوف تھا۔ داروغہ کی شیطانی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ اماں میں نے سپر ڈالنا ہی بہتر سمجھا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی اٹیچی داروغہ کے سامنے رکھ دی۔

داروغہ نے اٹیچی کی ایک ایک چیز نکال کر دیکھی، کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس نے نقدی اور دوسری چیزیں جلدی جلدی اپنی موٹر سائیکل کی ڈگی میں ٹھونسیں اور اٹیچی کا کھوکھا ٹھوکر سے میری طرف سرکایا اور میری پیٹھ پر ایک زور کا دھول جماتے ہوئے بولا۔

"بھاگ سالے، یہاں کہاں قادر خان کو ڈھونڈنے آیا۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ ملا تو الامین غریب نواز اسپتال میں ملے گا، جہاں کتنے ہی لولے لنگڑے پڑے سسک رہے ہیں۔"

اتنا کہہ کر داروغہ موٹر سائیکل پر رفوچکر ہو گیا۔ میرا سارا اثاثہ میرے اس محافظ نے لوٹ لیا تھا جس پر میں اعتماد کر سکتا تھا۔ خالی اٹیچی لیے ہوئے میں پھر جلے ہوئے پیڑ والے مکان کی تلاش میں چل پڑا۔ بتائے ہوئے راستوں، گلیوں سے گزرتا ہوا جب میں اس چھوٹے سے جلے ہوئے مکان کے سامنے پہنچا جہاں مجھے شام کی بجھتی ہوئی روشنی میں پیپتے کا ادھ جلا ٹھنٹھ دکھائی دے رہا تھا تو میرے قدم آپ ہی آپ رک گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک ادھیڑ عمر کی عورت جلے ہوئے سامان کے بیچوں بیچ بیٹھی ہے۔ میں اس کی طرف تیزی سے بڑھا۔ یقین تھا یہی کلثوم بوا ہوگی۔ پر میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچا تو کلثوم بوا کی پرانی پہچان نے پھر مجھے دھوکا دے دیا۔ چہرہ دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی کلثوم بوا ہے جسے میں جانتا ہوں۔ خوف نے اس کا چہرہ اتنا بگاڑ دیا تھا کہ اس میں کوئی نشانی کلثوم بوا جیسی نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے تیزی سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے پکارا۔

"کلثوم بوا، میں آ گیا ہوں...... تمہارا بیٹا متین......"

ادھیڑ عمر کی عورت نے میری طرف دیکھ کر ایک دلدوز چیخ ماری ایک ہاتھ سے ازار بند سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے سامنے پھیلے ہوئے ڈھیر میں سے راکھ اٹھا کر اپنے سر میں ڈالنے لگی۔

یہ میری قوت برداشت سے باہر تھا اماں! میں خالی اٹیچی اٹھا کر واپس آ گیا۔"

○○

ایک خط احمد آباد سے

"خط آیا ہے امّی" نیلوفر آواز دیتی ہے۔

"کس کا ہے، ذرا دیکھ؟" رابعہ رسوئی سے ہی پوچھتی ہے۔

"عائشہ خالہ کا ہے امی۔ احمد آباد سے۔"

رابعہ دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا دیتی ہے...... 'اللہ خیر کرے۔ آپا سلامت ہیں۔ میری فکر مٹی۔" باورچی خانہ سے باہر آتی رابعہ بولتی رہتی ہے مگر جوان بیٹی کو گم صم دیکھ کر چونکتے ہوئے خط پکڑ لیتی ہے۔ خط کے اوپر' الفاظ کے ساتھ دھبے ہی دھبے تھے۔ رابعہ سمجھ جاتی ہے کہ آپا نے یہ خط آنسو بہاتے ہوئے لکھا ہے۔ دل کی سات پرتوں کے نیچے شہتیر چٹختی ہے۔ خط کے الفاظ دھندلے ہو جاتے ہیں۔ خود اپنی آنکھیں بھی گیلی ہو گئی تھیں' اُنہیں پونچھ کر رابعہ پڑھتی ہے......

"پیاری رابعہ' دعاء

کلیجہ جب سخت ہو گیا ہے' تب تمہیں خط لکھنے کی ہمت جٹا پا رہی ہوں۔ تمہاری مجبوری میں سمجھ سکتی ہوں...... اِس جلتے جنگل میں تم لوگ ہمیں تلاش کرنے آتے تو تم لوگ بھی نہیں بچتے...... ہماری طرح کسی سلیمان یا رحمت کیمپ میں پہنچ جاتے۔ حال تو ٹی وی پر دیکھ لیتی ہو گی۔ اِس شہر کا جو حال ہے وہی ہماری حالت کا ہے۔ جانے کیوں' اللہ نے بھی اُن گلیوں سے گزرنا بند کر دیا ہے' جہاں جلتے ہوئے مکان' دکانیں اور جسم چیخ چیخ کر اُسے پکارتے ہیں۔ شاید اللہ چین و امن والی بستیوں میں ہی گشت لگاتا ہو گا۔

جس دن گودھرا میں مسلمانوں کی بھیڑ نے پچاس ساٹھ' ہندو کارسیوکوں' کو ریل کے ڈبے میں بھون دیا تھا۔ ہمیں احساس ہو گیا تھا کہ ظالموں کا بدلا مظلوموں سے لیا جائے گا۔ مگر بدلا اتنا خوف ناک ہو گا' سوچا نہیں تھا۔

دوسری رات ہی ہم شہر چھوڑ کر نکل جانا چاہتے تھے کہ رمیش بھائی شاہ آ گیا......

"کہیں جانا نہیں ہے شمس بھائی۔ زلزلہ کے دنوں میں بھی ہم نے مل کر موت سے مقابلہ کیا تھا۔"

خوش ہو گئی تھی صنوبر...... "دیکھا امی۔ یہ گاندھی کا صوبہ ہے۔ یہاں نفرت پر محبت قابض ہوتی ہے۔" وکیل کی بھی یہی رائے تھی کہ اس کے دوست ہم سب کی حفاظت جی جان سے کریں گے۔ خاموش سے گم صُم تھے تمہارے دُلہا بھائی۔ دونوں بچے جب ہٹ گئے تو مجھ سے بولے تھے۔ "مذہب لڑنا نہیں سکھاتا مگر جب مذہب غنڈوں کے ہاتھ پڑ جاتا ہے تو انسان انسان نہیں رہتا ہے۔ وکیل اُر ملا ماتونڈ کر اور گووندا کا دیوانہ ہے۔ اِس پسند اور ناپسندی میں مذہب بیچ میں کہاں سے آتا ہے۔ ایک پرانی مسجد کو توڑ کر کتنے ہندو غازی بننا چاہتے ہیں؟ مگر وہ مسلمان اور وہ ہندو' جو غنڈہ گردی سے دور رہنا چاہتے ہیں اُن کا وجود غنڈوں کے سامنے کہاں رہ جاتا ہے' اسی لیے تو لڑائی' دنگے' جھگڑے اور آگ زنی اس ملک میں عام بات ہو گئی ہے۔ یہاں سے جو مسلمان پاکستان گئے وہ آج بھی مہاجر ہیں اور جو ہندوستان میں ہیں اُنہیں پاکستانی سمجھا جاتا ہے۔ شک کی انگلی ان پر تنی رہتی ہے۔ یہ گوری قوم جس نے ہندوستان کو بانٹا تھا' اِسی قوم نے افغانستان سے نجیب کی سلطنت مٹانے کے لیے طالبان پیدا کیے تھے۔ اب یہی قوم طالبانوں کے نام پر پوری دنیا کے مسلمانوں کو دہشت گردوں کی شکل میں پیش کرتی ہے۔ ہر مسلمان میں انہیں ایک لادن نظر آتا ہے۔ جو خود دیکھتے ہیں اُسی کو' اوروں کو دکھانا چاہتے ہیں۔ سگے بن کر خیرات کے بہانے اپنا بازار لادنا چاہتے ہیں۔ اُن کا بازار سنبھالو یا غارت ہو جاؤ۔" تبھی بچے آ گئے تھے۔

"جی ابا! انہیں کے سونپے ہتھیار لے کر "افغانی مرسنری" کشمیر میں گھستے تھے۔ اِنہیں کی وجہ سے ہندوؤں کو کشمیر چھوڑنا پڑا اور اب وہاں کے مسلمانوں کی زندگی غارت ہوئی ہے۔" صنوبر نے کہا تھا۔

"مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ پولیس سے مل کر نار کو ٹکس بیچتا ہندو تو دیش بھکت ہے اور امن پسند مسلمان شک کے نشانے پر۔ لیکن گودھرا کے مسلمان کیسے پاگل ہو گئے؟ اس وقت ہمیں بحث چھوڑ کر حفاظت کی بات سوچنا چاہیے۔"

"حفاظت! کیسے ہو گی حفاظت؟ کیا یہ گشت لگاتی پولیس کسی کی حفاظت کرے گی؟ وہ نوجوان جس کی حفاظت کرنے والی طاقت اور انصاف کرنے والی تنظیم بے ایمان ہو جائیں اُس ملک میں اندر ہی اندر دیمک لگ جاتی ہے۔ پولیس اور ڈکیت کی بندوقوں کی گولیوں میں تب انصاف پسند باشندہ فرق نہیں کر پاتا۔ یہاں کوئی بھی گھر کسی بھی وقت گیس چیمبر بن سکتا ہے۔ محفوظ رہتے ہیں غنڈے..... ہندو غنڈے اور مسلمان غنڈے۔" وکیل جو ہمیشہ کرکٹ اور فلم کی باتیں کرتا تھا' آج کچھ سنجیدہ تھا۔

"خدا خیر کرے۔" میرے منہ سے نکلا تھا۔

"کیا ہم رمیش بھائی شاہ پر اعتبار کر سکتے ہیں؟" صنوبر نے پوچھا۔
"اُن پر اعتبار نا کرنے کی وجہ نہیں ہے، مگر جب حملہ آور ہی باہر کے ہوں تو وہ بھی لاچار ہو جاتے ہیں...... اپنی جان بچانا ہی اُن کو مشکل ہو جاتا ہے۔"
"پھر؟" وکیل نے پوچھا تھا۔
تبھی بڑے پوشیدہ طریقے سے دروازے پر سائے ابھرے۔ چھت سے وکیل نے جھانکا اور بتایا...... "الطاف بھائی ہیں۔" وہ اندر آئے۔ "گھبرائیے نہیں...... مسجد میں ہمارے نوجوان اسلحے کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ کل قاسم میاں آئیں گے۔ اُنہیں آپ اور اسلحہ خریدنے کے لیے دس ہزار دے دیجیے گا۔"
الطاف بھائی جیسے آئے تھے نکل گئے۔ کراہ اُٹھے تھے وکیل کے ابو...... "اب ہمیں غنڈوں کی نمائندگی قبول کرنی ہوگی جان بچانے کے لیے۔" کافی دیر تک کمرے میں ہاتھ ملتے ہوئے وہ گھومتے رہے تھے۔ وکیل چھت پر کرسی ڈال 'بیٹھا رہا۔ صنوبر سہیلیوں کو فون ملانے کی کوشش کرتی رہی مگر ہر جگہ جواب تھا گھر میں نہیں ہے۔ رات ایک بجے وکیل ہڑبڑاتا نیچے آیا......
"ہر گھر میں آگ لگائی جا رہی ہے۔ پیچھے کے دروازے سے باہر نکلئے۔"
میں نے زیور کا ڈبہ دوپٹے میں لپیٹا۔ صنوبر اور وکیل نے ڈنڈا اور چھری لی۔ وکیل کے ابا نے نوٹوں کو جیب میں ٹھونسا۔ ایک آہ اُن کے منہ سے نکلی...... "دکان بھی جل گئی ہوگی۔ گیتا' قرآن اور بائبل بھی سب کتابوں کے ساتھ جل رہی ہوں گی۔"
باہر بھیڑ لڑ رہی تھی...... چھرے 'تلوار' پٹرول بم 'ترشول اور طمنچے چل رہے تھے۔ ہم بچھڑ گئے۔ اندھے ہو کر بھاگے۔ کون کدھر گیا پتہ ہی نہیں چلا۔ گر کر میں بے ہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو خود کو ایک گھر میں پایا۔ ڈر گئی کہ کہیں مجھے غارت کرنے کے لیے تو نہیں لایا گیا ہے' مگر کچھ ہی دیر میں ڈر مٹ گیا' جب ایک عورت چائے لے کر آئی۔ میں نے دیکھا میں ایک ہندو کے گھر میں ہوں...... مگر وکیل 'صنوبر اور اس کے ابو...... کمرے میں آئے مرد نے تسلی دی۔ "گھبراؤ نہیں بین۔ جھگڑے جلد ختم ہوں گے۔ سب مل جائیں گے۔"
مگر جلد ہی اُنہیں فون کر پولیس کے ذریعہ مجھے ریلیف کیمپ میں بھیجنا پڑا کیونکہ دنگائی روز رات میں دروازہ بھڑبھڑانے لگے تھے۔ اُنہیں مار ڈالنے کی دھمکی دی جا رہی تھی۔ ریلیف کیمپ میں وکیل کو دیکھ کر میری روح ہری ہو گئی۔ میں نے پوچھا۔ "تیرے ابو اور صنوبر؟"
مگر وکیل بتا رہا تھا۔ "ہمارا گھر جل گیا۔ آس پاس کے آٹھ گھروں کے لوگ باہر نہیں نکل سکے۔ اُن کی جلی لاشیں میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں۔ میں نے خورشید کا جلا منہ دیکھا اور حلیم کو تو

آگ نے گوشت کی طرح بھون ڈالا تھا۔"

میں رو پڑی۔ "میں تیرے ابو اور صنوبر کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔"

"بہت چیخے تھے ابو...... 'میں بے گناہ! میں تھوکتا ہوں گودھرا کے ظالم کمینوں پر...... مگر......"

"مگر کیا؟ بول وکیل۔"

"میں دکان کے تختے کے نیچے نالی میں پڑا اُن کی چیخیں سنتا رہا۔ خاموشی چھا جانے پر باہر نکلا تو وہاں ابو کا لہو تھا' مگر لاش نہیں۔ شاید کسی جلتے مکان یا دُکان میں جلنے کے لیے لاش پھینک دی گئی ہوگی۔"

میں پتھر بن گئی۔ منہ سے اتنا ہی نکلا۔ "اور صنوبر؟"

زہریلی ہو گئی تھی وکیل کی آواز۔ "اِسی کیمپ میں منہ چھپائے پڑی ہے۔" بے ہوش ہوتے ہوتے میرے ذہن سے وکیل کے ابو جو اقبال کی نظم...... 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا' گاتے تھے...... باہر نکل آئی۔ اُن کا یہ کہنا کہ 'کبھی سلطنت کے لیے لڑتے تھے ہندو...... مسلمان۔ اب تو ڈیموکریسی ہے' چناؤ ہیں' سب میرے دماغ سے باہر نکل گئے۔ روح غازی اور غزنی کو پکارنے کے لیے لرزی' مگر تبھی صنوبر آ گئی۔ میرا سر اس کی گود میں تھا۔

ہوش آیا تو صنوبر کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ "دوزخ میں جلیں اُن کے خاندان' جس نے میری بیٹی کو غارت کیا۔"

حیرت میں رہ گئی جب صنوبر کو کہتے سنا۔ "امّی مجھے کسی ہندو نے غارت نہیں کیا۔ جس نے مجھے غارت کیا وہ آدمی نہیں درندہ تھا۔ عورت اس سلسلے کی پرانی کڑی ہے۔ خدا جو نیک لوگوں کو بچاتا ہے' کیوں نہیں آیا مجھے بچانے؟ اور پولیس والے جس پر ملک کا بے انتہا پیسہ خرچ ہوتا ہے' کیا گناہ روکنا اُن کا کام نہیں رہ گیا ہے؟ ہم نے کب اس پولیس کے خلاف بغاوت کی؟ اور یہ لیڈر جو ہمارے لیے پارلیامنٹ سر پر اُٹھائے ہیں' کیا ہمارے مددگار ہیں؟ یہ سب آنے والے چناؤ پر نگاہ رکھتے ہیں۔ ورنہ کیوں نہیں احمد آباد کی گلی گلی میں کھڑے دکھائی دیتے۔ یہ ہیومن رائٹس کے محافظ' جو بیان تو دے رہے ہیں' پھر یہاں گلیوں میں آ کر کیوں نہیں انسانوں کی چیخیں سنتے۔ یہ بھی پولیس والوں جیسے ہی ہیں' جو ہو جانے کے بعد آنکڑوں کو لے کر لاشوں کی بابت بولتے ہیں۔ جانتی ہو کیوں ایک گاندھی کے بعد دوسرا گاندھی اس ملک میں پیدا نہیں ہوا؟ کیونکہ ہر سیاسی پارٹی اور ہر محکمے میں گوڈسے اور گوڈسے ہی ہیں۔"

"اِس سے تو ہم بھی پاکستان میں ہوتے۔" میرے منہ سے نکلا۔

"وہاں ہم مہاجر ہوتے۔ ہمارا پورا مسلمان ہونا بھی شک میں آجاتا۔"
"پھر ہم کہاں جائیں صنوبر؟"
"ہم جہاں ہیں اسی زمین کو انسانوں کے رہنے لائق بنائیں امّی!"
"تم پاگل ہو صنوبر! میں ایم بی اے نہیں کروں گا۔ اسلامی نوجوانوں کی چھاپہ مار ٹولی بناؤں گا۔" وکیل گرجا تھا۔
"جی ہاں! آپ ایک گودھرا بنائیں گے اور ہندوستان کا کوئی ایک شہر احمد آباد بن جائے گا۔"
خاموش سا کیمپ اچانک چیخوں سے بھر گیا تھا...... "اس ننھے کے کماؤ باپ کو مار ڈالا۔ بتاؤ میں کیسے پالوں؟ میرے پانچوں جوان بیٹے اور دلہنیں قتل کر دیے گئے۔ تم تلوار سے میرا سر بھی قلم کر دو۔"
...... چیخیں ہی چیخیں اُبھر رہی تھیں۔ کوئی نیتا سرکاری تام جھام کے ساتھ شہر میں آیا تھا۔ اس عملے میں عورتیں بھی تھیں۔ ایک سرکاری افسر کے آگے تنی تھی صنوبر...... "امن بنانے اور شہر کی ترقی کے لیے آپ کو سرکار نے رکھا تھا۔ کیا کیا آپ نے؟ اس قتل عام کے آپ ذمہ دار ہیں۔"
"ہم معاوضے کی سفارش کر رہے ہیں۔"
"دیجیے میری لٹی عزت کا معاوضہ۔ لے آیئے اپنی بہن بیٹی کو اور لٹوایئے ان کی عزت۔ غیر ذمہ داری آپ کی اور خالی کرنے کے لیے خزانہ سرکاری۔ آپ بکے ہوئے ہیں وطن کے تاجروں کے ہاتھ۔ اُنہیں ہماری زمین اور مکان چاہیے تھے۔ آپ کی جیبیں بھریں۔ ہماری عصمت لٹی اور سینکڑوں قتل ہوئے۔ کیوں نہیں سرکاری افسروں اور پولیس والوں کی زمین جائداد سے اور اُن تاجروں کی تجوری سے معاوضہ دیا جائے؟" صنوبر تنی ہوئی تھی۔ سماج سیوکوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ہنسا تھا فطرتی نیتا۔ "غصے میں ہے لڑکی۔ غصہ واجب ہے۔"
میں جانتی تھی یہ سب گناہوں کے بت ہیں اُن کے سامنے سر پھوڑنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے آواز دی۔
"صنوبر۔"
نیتا آگے بڑھ گیا۔ اب اس کے ساتھ فریادیوں کی بھیڑ تھی۔ جسے سرکاری عملہ مستعدی سے روک رہا تھا۔ صنوبر لوٹ آئی۔ میں نے سمجھایا۔ "کیوں اِن کے منہ لگتی ہے!"
صنوبر تن گئی۔ "میں نے ان کا مغالطہ توڑا ہے امی کہ ہم بھی اصلی گنہگاروں کو پہنچانتے

ہیں۔ میری آواز کل ہزاروں لاکھوں کی آواز بنے گی۔"

وکیل حیرت بھری نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ آج تک کا حال میں نے لکھا۔ آگے موقع ملتے ہی لکھوں گی۔ ابھی احمد آباد کا رخ مت کرنا۔ یہاں ابھی بھی گلیوں اور سڑکوں پر انگارے جلتے ہیں۔

خدا حافظ!

تمہاری آپا

عائشہ

خط پر رابعہ کے آنسو بھی بکھر پڑے تھے اور الفاظ دھندلے ہو چلے تھے۔ ○○

ساہتیہ اکادمی کی قابل مطالعہ کتابیں

نئی کتابیں

روسی کلاسک: یوگینی ٹیکن	پوشکن	ترجمہ: خدیجہ عظیم	150.00
ملیالم ناول: دادا کا ہاتھی	وائکم محمد بشیر	ترجمہ: حیدر جعفری سید	40.00
ہندی کہانیاں: آزادی مبارک	کملیشور	ترجمہ: خورشید عالم	50.00
اندھیرے میں سلگتے حروف	سرجیت پاتر	ترجمہ: بلراج کومل	50.00
بیسویں صدی میں اردو ادب	مرتب: گوپی چند نارنگ		250.00
لمبی بارش (شعری انتخاب)	بلراج کومل		200.00
آزادی کے بعد اردو فکشن (سیمینار)	مرتب: ابوالکلام قاسمی		150.00
عصری ہندوستانی کہانیاں (جلد۔۴)	مرتب: مغنی تبسم، بلراج کومل		200.00
میرا جی (ہندوستانی ادب کے معمار سیریز)	شافع قدوائی		25.00
خلیل الرحمٰن اعظمی (ہندوستانی ادب کے معمار سیریز)	مہتاب حیدر نقوی		25.00

تصانیف مولانا ابوالکلام آزاد

تذکرہ	(چوتھا ایڈیشن)	100.00
ترجمان القرآن	چار جلدوں میں	600.00
خطوط ابوالکلام آزاد	مرتب: مالک رام	100.00
غبارِ خاطر	مرتب: مالک رام	100.00
خطباتِ آزاد	مرتب: مالک رام	80.00

فکشن

اناکارینینا (دو جلدوں میں)	لیو تالستائے	مترجم: خدیجہ عظیم	500.00
پہاڑ پر آگ (انگریزی انعام یافتہ)	انیتا دیسائی	مترجم: م۔م۔ راجندر	80.00
زندگی نامہ (ہندی انعام یافتہ)	کرشنا سوبتی	مترجم: حیدر جعفری سید	225.00
سانپ اور رسی (انگریزی انعام یافتہ)	راجا راؤ	مترجم: بلراج کومل	180.00
اردھ ناریشور (ہندی انعام یافتہ)	وشنو پربھاکر	مترجم: خورشید عالم	200.00
راجندر سنگھ بیدی کے بہترین افسانے (انگریزی)		مرتب: گوپی چند نارنگ	80.00
کرشن چندر کے بہترین افسانے (انگریزی)		مرتب: گوپی چند نارنگ	80.00
بلونت سنگھ کے بہترین افسانے		مرتب: گوپی چند نارنگ	150.00
پاکستانی کہانیاں		مرتب: انتظار حسین، آصف فرخی	150.00
ہندی کہانیاں		مرتب: بھیشم ساہنی	200.00

رابطہ: ساہتیہ اکادمی، سیلز آفس، سواتی مندر مارگ، نئی دہلی۔ 110001 فیکس: 3364207

مظہر امامؔ

غزلیں

آداب وفا سے واقف تھے ہم جرأت بے جا کیوں کرتے
خاموشی لب ہی کافی تھی الفاظ کو رسوا کیوں کرتے

جب تیری تمنا کرکے بھی جینے کی روش ویسی ہی رہی
اے جان تمنّا ! تو ہی بتا پھر اور تمنا کیوں کرتے

لفظوں کو علامت کر بھی گئے اور بات بھی دل کی کہہ ڈالی
جو بات ادھوری ہی اچھی اس بات کو پورا کیوں کرتے

جب ہجر کی راتیں آتی تھیں خوابوں کے کنول جل اٹھتے تھے
شبنم کی سی نرمی ہو جس میں اس آگ کو ٹھنڈا کیوں کرتے

زخموں ہی سے تازہ ہیں اب تک اک دست حنائی کی یادیں
جو ٹیس بھی ہے وہ رنگیں ہے اس رنگ کو پھیکا کیوں کرتے

بس ایک تبسم زیر لبی کیا دیدہ و دل کی قیمت تھی
ہر سانس میں تجھ کو پانا تھا نقصان کا سودا کیوں کرتے

○○

اس کے ہر ظلم کا اک اک سے گلا کرنا ہے
اب کے اس شخص کو کچھ اور خفا کرنا ہے

ہونٹ کانپیں بھی مگر چیخ نہ نکلے منہ سے
اس کو اتنا ہی مجھے خوف زدہ کرنا ہے

سیلِ انبوہ میں غارت ہوئے کتنے چہرے
یاد یہ بھی نہیں کس کس کا پتہ کرنا ہے

دوپہرِ ہجر کی ایسے نہیں ڈھلتی ہے، اسے
برگ کو زرد تو زخموں کو ہرا کرنا ہے

ہم کو اندوہِ دل و جاں سے ملی کچھ تو نجات
عشق کرنا ہے نہ اب عہدِ وفا کرنا ہے

مشغلہ اس کے تعلق کا جو تھا، ختم ہوا،
اب جئے بھی تو ہمیں جی کے بھی کیا کرنا ہے

○○

بس اسی کا سفر شب میں طلبگار ہے کیا
تو ہی اے ماہ مرا ہمدم و غمخوار ہے کیا

تیشہ دردست اُمڈ آئی ہے آبادی تمام
سب یہی کہتے ہیں دیکھیں پسِ دیوار ہے کیا

ہاں اسی لمحے میں ہوتا ہے ستاروں کا نزول
شہرِ خوابیدہ میں کوئی دلِ بیدار ہے کیا

جسم تو جسم ہے، مجروح ہوئی ہے جاں بھی
اپنوں کے ہوتے ہوئے شکوۂ اغیار ہے کیا

تھرتھری پتوں پہ ہے، دردبجاں ہیں کلیاں
تو بھی اے بادِ سحر درپئے آزار ہے کیا

لب ہلانے کی سکت ہے نہ قدم اٹھتے ہیں
سامنے جو بھی ہے دلدل میں گرفتار ہے کیا

○○

ظفر گورکھپوری

تم کو دستِ غیر میں سونپا، دے کے محبت اے جاناں
تم کیا جانو بیت گئی جو دل پہ قیامت اے جاناں

شاید اگلے موسم میں یہ درد بھی ہم سے چھن جائے
اب تک تو محفوظ ہے گھر میں تیری امانت اے جاناں

دل کو تیرے وصل کا ارماں اور نہ تیرے ہجر کا غم
اس موسم میں اور ہی کچھ ہے رنگِ طبیعت اے جاناں

تو دنیا کے ساتھ ہوا، تیری اپنی مجبوری تھی
ہم جو تجھے اپنا نہ سکے، یہ اپنی غفلت اے جاناں

آنکھوں سے دل، دل سے جاں تک جانے کتنے مقتل ہیں
ہم جو تبسم کرتے ہیں، یہ اپنی ہمت اے جاناں

OO

دستک نہ دے کہہ دو یہ نسیم سحری سے
ہوتی نہیں اب کوئی خوشی، خوشخبری سے

مجھ کو نہ سہی، اوروں کو تو لے گئی گھر تک
اک راہ جو نکلی تھی مری دربدری سے

خاشاک کی تہہ میں بھی ہے اک انجمن آرا
دیکھا ہی نہیں تم نے کبھی خوش نظری سے

اپنے سے بھی اک خوف سا اکثر ہوا محسوس
نقصان اٹھایا ہے بہت باخبری سے

اب گھر کو جو لوٹا ہوں تو وہ جانے کہاں ہے
پیپل جو پریشاں تھا مری دربدری سے

آزاد ہوا، پھیلے سمندر، کھلے جنگل
دنیا کہیں کٹتی ہے کسی کم نظری سے

اک بجھتے ہوئے دیپ نے دی ہے مجھے آواز
باز آیا تیرے کوچے کی میں شب بسری سے

گھر آ کے گلے پڑ گیا ویرانے میں اک دن
جی خوش تھا چلو چھوٹ گئے دردسری سے

OO

شمیمؔ فاروقی

شکایت مری غیر سے کس لیے
اگر میں برا ہوں تو مجھ سے کہے

انہیں صرف یادوں کے تنکے ملے
جو دن رات موجوں کے شامل رہے

دعا دے رہی ہے یہ سوکھی ندی
ترے خشک ہونٹوں کو دریا ملے

نشانہ لگایا ہے بچے نے جب
درختوں سے یادوں کے پنچھی اڑے

شمیمؔ اب کرو پیڑ کی جستجو
کہ اب چلتے چلتے قدم تھک گئے

OO

راہ کے سب نقش قدموں کے نشاں لے جائے گا
اس سفر کی ہر نشانی کارواں لے جائے گا

اب کے موسم میں لٹیرے بادلوں کو بھیج کر
ساری ہریالی زمیں کی آسماں لے جائے گا

دیکھ لینا ایک دن طوفاں، بھری برسات میں
کشتیوں سے کھول کر سب بادباں لے جائے گا

آج میرے پاس ان بیتے ہوئے لمحات کی
جو بھی کچھ باقی بچی ہے داستاں لے جائے گا

خود ہی جا پہنچا کہ میں اب پوچھتا بھی کیا شمیمؔ
جانتا تھا میں کہ وہ مجھ کو کہاں لے جائے گا

OO

انوکھے آئینے تکنے لگے ہیں
ہم اپنی ذات سے ڈرنے لگے ہیں

محبت کی حسیں تصویر میں وہ
جفا کی تیرگی بھرنے لگے ہیں

خزاں نے وہ ستم ڈھائے ہیں اب کے
چناروں کے بدن جلنے لگے ہیں

چلی جب بھی ہوائے دل گرفتہ
تمہاری سمت ہم چلنے لگے ہیں

وہ پھر سے ہو رہے ہیں ہم پہ مائل
ہمارے زخم پھر بھرنے لگے ہیں

دیار زندگی میں پھر تبسمؔ
دیئے امید کے جلنے لگے ہیں

○○

دشمن کو ہے غرور جو اپنی سپاہ پر
نازاں ہوں میں بھی حوصلۂ بے پناہ پر

ہر سمت میرے چرچے ہوں سارے جہان میں
کہتے ہو تم بھی ٹھیک مرے بادشاہ، پر

سو سو طرح سے وار کیے جائے وہ میاں
کر نہ سکے گا مجھ کو کبھی بھی تباہ، پر

نادم ہوں زندگی کی سبھی لغزشوں پہ میں
لیکن ہے فخر مجھ کو وفا کے گناہ پر

کرتے رہو جتن، کبھی ہمت نہ ہارنا
آئے گا ایک روز تبسمؔ وہ راہ پر

○○

دیتا تھا جو سایہ وہ شجر کاٹ رہا ہے
خود اپنے تحفظ کی وہ جڑ کاٹ رہا ہے

بے سمت اڑانوں سے پشیمان پرندہ
اب اپنی ہی منقار سے پر کاٹ رہا ہے

محبوس ہوں غاروں میں مگر آذرِ تخئیل
چٹانوں سے اشکالِ ہنر کاٹ رہا ہے

ہے کون کمیں گاہ میں یہ کیسے بتاؤں
ہر تیر مگر میرے ہی پر کاٹ رہا ہے

اک ضرب مسلسل ہے کہ رکتی ہی نہیں ہے
ہر تارِ نفس دردِ جگر کاٹ رہا ہے

امید اجالے کا لئے تیشہ ہر اک دل
ہر رات بہ اندازِ سحر کاٹ رہا ہے

کرتا ہے فزوں وحشت دل دشت کا موسم
بلقیسؔ مگر کیا کروں گھر کاٹ رہا ہے

OO

دلوں میں ربط تھا چاہت تھی تھا اپنا یہ گھر جنت
وہ دن ہائے وہ دن جب زندگی تھی سر بسر جنت

ہے وحشت کو بکو، دہشت بھرے گھر، دم بخود جینا
کہیں کس منہ سے کہلاتا ہے یہ اپنا نگر جنت

عداوت کی چڑیلیں ناچتی پھرتی ہیں کمروں میں
رواداری گئی تو کیسے رہ سکتا تھا گھر جنت

یہ گولا آگ کا بنتی ہوئی دھرتی ہے وہ دھرتی
جسے جنت بنانے آئے آدم چھوڑ کر جنت

نہیں ایسا کہ ہو اخلاص سے خالی ہر اک دل اب
جہنم زا فضا میں کوئی رکھے تو کدھر جنت

خطائیں قابلِ تعزیر اور ارمان بخشش کا!
بہت نادم ہوئے ہم آج رب سے مانگ کر جنت

قناعت ہے طبیعت میں وہاں بھی خوش رہیں گے ہم
گزارے بھر کو بھی بلقیس مل جائے اگر جنت

OO

قلم کی مار تو ایسی نہیں کہ سہہ جائے
حصار ذات میں وہ چیختا نہ رہ جائے

لرز رہا ہوں کہ تہذیب کا یہ سرمایہ
نئے اجالوں کے سیلاب میں نہ بہہ جائے

کہیں یہ ساتھ نہ بن جائے حیرتوں کا سبب
تمام شہر ہمیں دیکھتا نہ رہ جائے

اسی کا نام اب اظہار کی ہے آزادی
کہ جس کے منھ میں جو آئے کسی کو کہہ جائے

یہ آدمی بھی لطیفے سنا سنا کے یہاں
کہیں خود ایک لطیفہ نہ بن کے رہ جائے

جو ہم سے چند حقیقت نگر نہ ہوں اظہرؔ
تو سارا شہر اک افواہ بن کے رہ جائے

○○

انا کی آڑ میں کوئی بہانا چاہتا ہوں
میں بے لبابیاں اپنی چھپانا چاہتا ہوں

جو دھوپ میں ذرا گنجائشیں نکل آئیں
میں اپنے سائے کو نزدیک لانا چاہتا ہوں

اتھاہ گھرے اندھیرے کے اس سمندر سے
میں چاند کوئی نیا ڈھونڈ لانا چاہتا ہوں

یہ ڈوبتی ہوئی پرچھائیاں، یہ غم کے حصار
انہیں کے سائے میں اپنا ٹھکانا چاہتا ہوں

سروں پہ شام جو منڈلا رہی ہے اس سے کہو
کسی کی یاد کی محفل سجانا چاہتا ہوں

پگھلتی شام کے دکھ کا ملال اوڑھے ہوئے
میں ہجر لمحوں کی لذت بڑھانا چاہتا ہوں

جو خشک ریت پہ اڑتے ہیں رندؔ مرغولے
میں ان کو زیست کا مقصد بنانا چاہتا ہوں

○○

نورؔ منیری

جب کسی سازش کے پہلو، گانو والوں پر کھلے
چھوڑ کر آخر گئے وہ، اپنے سارے گھر کھلے

دھوپ کی ایسی تمازت ہے کہ، جھلسائے بدن
پھر بھی دیوانے چلے ہیں، پا برہنہ سر کھلے

کوئی دستک بھی اگر دے جائے تو کانپے ہے دل
شہر میں ایسی فضا ہے، اب نہ کوئی در کھلے

رات کا پچھلا پہر ہے، اور اک ٹوٹی سی آس
آنکھ کہتی ہے کہ، اب تو خواب کا منظر کھلے

ایک جھوٹی سی تسلی بھی نہیں ملتی یہاں
یوں تو سارے شہر میں فریاد کے دفتر کھلے

زندگی ہے دوڑ میں آگے نکل جانے کا نام
ہم پہ یارو اس حقیقت کے کہاں جوہر کھلے

مرحلہ در مرحلہ، پردے نیاز و ناز کے
آخری منزل پہ جا کے آگہی کے در کھلے

کون روتا ہے، کسی کے واسطے سب جھوٹ ہے
نورؔ ہم پر یہ دکھاوے جا بجا اکثر کھلے

○○

بے سبب کوئی گرفتار بھی ہو سکتا ہے
یہ تماشا سرِ بازار بھی ہو سکتا ہے

پوچھنا جرم نہیں، اس لیے پوچھا کیجے
سامنے والا سمجھدار بھی ہو سکتا ہے

آندھیاں خوب چلیں، زور کا طوفاں آیا
شہر کا شہر گنہگار بھی ہو سکتا ہے

ہو چکے سارے گواہوں کے بیانات غلط
کوئی قاتل کا طرفدار بھی ہو سکتا ہے

ساتھیو اور بھی رفتارِ سفر تیز کرو
مرحلہ آخری، دشوار بھی ہو سکتا ہے

اپنے دشمن سے کبھی ترکِ تعلق نہ کرو
کل تمہیں اس سے سروکار بھی ہو سکتا ہے

راز کی بات ہے، آہستہ کہو آہستہ
کوئی سایہ پسِ دیوار بھی ہو سکتا ہے

○○

رات کے تاریک سائے رہ گزر پر آگئے
بھولے بھٹکے کچھ مسافر میرے در پر آگئے

دانۂ گندم سے نکلے فتنے سر پر آگئے
سارے الزامات بے چارے بشر پر آگئے

تیرگی کی آخری منزل گزر جانے تو دو
روشنی بتلائے گی ہم کس ڈگر پر آگئے

گھر کے گم ہونے پہ ان کو سخت مایوسی ہوئی
صبح کے بھولے ہوئے پھر رہ گزر پر آگئے

زیست کو ہر پل ہمارا امتحاں مقصود تھا
دشت سے نکلے تو راہِ پُر خطر پر آگئے

○○

ہم تم نہ بچیں گے کبھی آندھی جو چلے گی
دنیا نئی ہو جائے گی دنیا جو مٹے گی

پاس آ کے بڑے پیار سے شانوں کو ملے گی
جب دور کھڑی ہوگی بہت زور ہنسے گی

دنیا کا سمجھنا ترے بس کا نہیں اے دل
یہ ہاتھ میں لے گی کبھی قدموں میں رکھے گی

دفتر میں کبھی بھولے سے آئے گی نہ دنیا
ہاں جاگتی راتوں میں پریشان کرے گی

پھر کوئی پیمبر ہی بدل دے رُخِ ہستی
شاعر کی مساعی سے یہ دنیا نہ بچے گی

○○

جو گر کے مرے ہاتھ سے ٹوٹا بھی نہیں تھا
ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ شیشہ بھی نہیں تھا

جب میری حفاظت کے یہ سامان نہیں تھے
تب اتنا مری جان کو خطرہ بھی نہیں تھا

کیا جانئے کیوں بھر سی گئی میری طبیعت
جی بھر کے ترے شہر کو دیکھا بھی نہیں تھا

جس کے لیے یہ جان ہتھیلی پہ رہی ہے
ہوگا مرا قاتل کبھی سوچا بھی نہیں تھا

معلوم نہیں کیسے نکل آئے بھنور سے
گرچہ کسی تنکے کا سہارا بھی نہیں تھا

سر رکھا ہے سجدے میں بہت سوچ سمجھ کر
بندے کے لیے اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا

حالانکہ ضرورت مری کچھ کم بھی نہ تھی شانؔ
احسان امیروں کا گوارہ بھی نہیں تھا

○○

آندھیوں کی زد پہ بام و در تمام
ہنستے گاتے شہر کے منظر تمام

میرے اندر کون یہ روتا رہا
آنسوؤں سے نم ہوا بستر تمام

قصر شاہی میں بغاوت کا دھواں
سرحدوں پہ ہم نوا لشکر تمام

ڈائری میں کیوں کروں محفوظ یہ
پھول، خوشبو اور صبا از بر تمام

میری ہی دہلیز تک محدود کیوں
قہقہہ بردوش یہ منظر تمام

پُر سکوں ہے کائناتِ زندگی
مائل پرواز ہیں پیکر تمام

○○

مقدر ہے قبیلے کی اسے ہی آبرو ہونا
سکھایا جس نے خنجر کو سدا زیب گلو ہونا

میں بے نام و نشاں تھا آئینہ بننے سے کچھ پہلے
مجھے بھی راس آتا ہے اب اپنے روبرو ہونا

یہ بستی کس ہنر سے آزماتی ہے ستم اپنے
مسلسل دیکھتا ہوں اپنے خوابوں کا لہو ہونا

عروج فرد ہے دل میں دھڑکنا ہم جماعت کے
حقیقت جس کی ہوتی ہے چراغِ آرزو ہونا

سفر آغاز کرتا ہوں یہاں سے جان کر راشدؔ
نصیبوں سے ہی بنتا ہے شہیدِ جستجو ہونا

○○

صحرا صحرا مجھ کو پینے آتا ہے
میرا سمندر صحرا ہوتا جاتا ہے

اندر مٹی سونا ہوتی جاتی ہے
باہر سونا مٹی ہوتا جاتا ہے

رات کی چھت پر اندھی ماں رستہ دیکھے
چاند کو لے کر بالک کب گھر آتا ہے

دل کے زخم پہ مرہم کام نہیں کرتے
دل کے زخم پہ بوسا رکھا جاتا ہے

منزل میرے آگے آگے جاتی ہے
رستہ میرے پیچھے پیچھے آتا ہے

روز شام کو چھپ جانے سے پہلے اشکؔ
سورج میرے دیپ جلا کر جاتا ہے

○○

نظمیں

وہ جلادیئے گئے

وہ جلادیے گئے
جنہوں نے کبھی سوچا تھا کہ
مریں گے تو اس ملک میں
کم سے کم قبر کی دو گز زمین تو نصیب ہوگی
جس میں کروٹ لے لیا کریں گے
کبھی بدن کھجالیا کریں گے
کبھی کمر کے دکھنے پر
لیٹ لیا کریں گے پیٹھ کے بل
کبھی گالی دیا کریں گے اپنوں کو
کہ وقت سے پہلے انہوں نے دفن کیوں کردیا

وہ جلادیے گئے
جنہیں کل بھتیجی کی شادی میں
اندور جانا تھا
جنہیں کل درزی سے سلے کپڑے لینے
دوکان جانا تھا
جنہیں کل برسوں بعد دوست کے گھر
دعوت میں جانا تھا
جنہیں کل اپنے پرانے ملنے والوں سے
بات کرنی تھی نوکری کے سلسلے میں
جنہوں نے کل اپنی لڑکی کے لیے
لڑکے کو بلا رکھا تھا

وہ جلادیے گئے اور انہیں جلانے والے
جلے ہوؤں کے نئے کپڑے پہن کر خوش ہیں
جلے ہوؤں کے گھر کے بچے ہوئے آٹے سے
روٹیاں بنا کر خوش ہیں
جلے ہوؤں کے نہ ہونے سے
جو سیٹیں سنیما گھروں میں خالی رہنے لگی ہیں
ان پر بیٹھ کر
مفت میں فلمیں دیکھ کر خوش ہیں
وہ ان مناظر کو دیکھ کر خوش ہیں
جنہیں دیکھ کر 'سن' رہ جانا ہوتا ہے
وہ ان مناظر کو دیکھ کر جھنجھنا رہے ہیں
جنہیں دیکھ کر ہنسے بغیر رہا نہیں جاتا

وہ قہقہے کر رہے ہیں
اور اسے
اپنی ماں کے ہاتھ کی کھیر سمجھ کر
لپالپ کھا رہے ہیں

○○

مشکل وقت

مشکل وقت ہے
ابھی ابھی بیتے دنوں کی کوئی یاد دلا دے
تو روکتے روکتے بھی آنسو آجاتے ہیں
تھوڑی دیر کوئی کندھے پر ہاتھ رکھ دے
من شانت ہونے لگتا ہے
ذرا سا کوئی مسکرا دے
لگتا ہے
شاید زیادہ مشکل وقت تو گزر چکا ہے

مشکل وقت ہے
اس میں اتنا زیادہ ہوش رہتا ہے
کہ رات کے بہت پہلے
رات کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے
سورج نکلنے کے بہت بعد تک
بنا رہتا ہے اندھیرا
مشکل وقت ہے
جس قدر سوچتا ہوں
یہ گزر جائے گا
اتنا ہی یہ پھیلتا جاتا ہے
جس قدر سوچتا ہوں میں اکیلا نہیں
اتنا ہی میں اور اکیلا ہوتا جاتا ہوں

مشکل وقت ہے
اس میں ہر فیصلہ اتنا مشکل ہے
کہ میرے فیصلے کوئی اور لے لیتا ہے
اور میں انہیں اس طرح قبول کرتا ہوں
جیسے وہ میرے ہیں
بعض اوقات ان کے خلاف بولنے والوں سے
جھگڑ پڑتا ہوں

(ہندی سے ترجمہ: نعمان شوق)

○○

ساجدہ زیدی

نسل کشی

ہمارے دل میں افغانستان کی جوالا دہکتی ہے
یتیموں، بے کسوں
مظلوم وناداروں کی آہیں
درد کا طوفاں اٹھاتی ہیں
در و دیوار سے مجروح و خوں بستہ
صدائیں گونجتی ہیں
خانماں برباد چہرے
عکس بن کر لوح دل پر نقش ہوتے ہیں
رگ جاں سے ابلتے خون کا دریا سا بہتا ہے
ہمارے ذہن میں گجرات کی بھٹی دہکتی ہے

دہکتی آگ کی قبروں میں
جو مدفون ہیں،
خود اپنے ہی جسموں کے ایندھن میں سلگتے ہیں
ہمیں ان سوگواروں کی صدا
راتوں کے سناٹے میں ہر ذرّہ سے آتی ہے
ہماری روح کو مجروح کرتی ہے
ہمارے خوں میں زہر غم کی تلخی گھول دیتی ہے
ہمارے دل میں دردِ لادوا کی ٹیس اٹھتی ہے

یہ کس عیار دہشت گرد قوت کی خدائی ہے
کہ کمزوروں پہ مجبوروں پہ دنیا تنگ ہے
دریائے خوں میں ڈوبتی ہیں
ان کی تقدیریں،
لہو انسان کا ارزاں ہے بازار سیاست میں
فقط بارود کی قوت کا سکہ چل رہا ہے،
ظلم و جبر و قتل و خوں کے شور و غوغا میں
نوائے شعر و نغمہ ڈوب جاتی ہے
رموز اعتبار زندگی دم توڑ دیتے ہیں
حوالے زیست کے معدوم ہو جاتے ہیں
اک اندھی سیاست کے
اندھیرے پھیل جاتے ہیں
حیات آثار سوچیں گھٹ کے رہ جاتی ہیں
مایوسی کے غاروں میں

OO

ڈاکٹر قمر رئیس

میّا ! اب مت لوری گاؤ

میّا ! اب مت لوری گاؤ
سو سو کر ہلکان ہوئے ہم
بے حس اور بے جان ہوئے ہم
علم و ہنر، تدبیر و تعقل
ہر شے سے انجان ہوئے ہم
کس نے ڈسا ہے؟ کیسا نشہ ہے
منتر اس کاٹے کا لاؤ
میّا ! اب مت لوری گاؤ
عرب ہو یا افغانستان
اصحابِ کہف سب سوتے ہیں
ہم بھی سگانِ خواب زدہ
نیند میں اکثر روتے ہیں
کیسا ہم پر وقت پڑا ہے
کوئی جھنجھوڑو کوئی جگاؤ
میّا ! اب مت لوری گاؤ
خوابوں پر لرزہ طاری ہے
سوچنا بھی خود آزاری ہے
اندر ہو یا باہر، کب سے
بھوتوں کا تانڈو جاری ہے

ہر سو وحشت ناک اندھیرا
کوئی تو اک دیا جلاؤ
میّا ! اب مت لوری گاؤ
تن کی شریانوں میں جیسے
بھاگتے گیدڑ ہانپ رہے ہیں
دو پیروں پر دوڑنے والے
چوپایے بن، کانپ رہے ہیں
بازو شل، ہمت درماندہ
طوفانوں میں گھری ہے ناؤ
میّا ! اب مت لوری گاؤ
بجلی دوڑا دے جو بدن میں
فکر و عمل کو جو شہپر دے
آنکھوں میں سپنوں کو سجائے
باہوں میں جو سیسہ بھر دے
صدیوں تک جو نیند اڑا دے
ایسی ایک جھک جھوری گاؤ
میّا ! اب مت لوری گاؤ

○○

رفعت سروشؔ

کبھی انساں نہیں مرتا

شہیدانِ وطن!
قبروں سے اٹھ کر دو گھڑی کے واسطے آؤ،
تمہیں سابرمتی کے آشرم کی آتما
آواز دیتی ہے
تمہیں باپو کی دھرتی خون میں ڈوبے ہوئے
منظر دکھاتی ہے

یہ چرواہے، محافظ اپنے گلے کے
خود اپنی بکریوں، بھیڑوں کو، بچھڑوں کو،
درندوں کی طرح جبڑوں سے اپنے
پھاڑتے ہیں،
پھر تلک کرتے ہیں خوں سے
اور لہو معصوم جانوں کا غٹاغٹ پی کے
تانڈو ناچ کرتے ہیں
شہیدانِ وطن!
کل سامراجی بھیڑیوں کا دور تھا، لیکن،
یہاں اب تو پشاچوں کی حکومت ہے
وہ زندہ بستیاں جن میں تھے کل تک
قہقہے بچوں کے،
دوشیزاؤں کی اٹکھیلیاں، نغمے محبت کے

ملیں اور کارخانے
مدرسے، اسکول اور بازار بارونق
اذانیں تھیں، نمازیں تھیں
دعائیں، منتیں، سجدے
ہوئے سب رائیگاں یکسر
پشاچوں اور درندوں نے
بہایا خون معصوموں کا
لوٹیں عصمتیں
گھر گھر لگائی آگ، بھڑکے موت کے شعلے
مساجد اور مقابر کو کیا مسمار
بے حرمت کیے قرآن
جلایا زندہ انسانوں کو
قتل عام کر ڈالا
لگا کر دھرم کا نعرہ
جو کل تک بستیاں تھیں
اب ہیں قبرستان سے بدتر
کبھی تم نے نہ دیکھے ہوں گے
ایسے روح فرسا، بدنما منظر
شہیدانِ وطن اب لوٹ جاؤ اپنی قبروں میں
وہاں آرام سے ہو تم
درندے، کیا خبر تم پر بھی جھپٹیں پا کے
مانس گند،
تم سے چھین لیں قبروں کی

دو دو گز زمینیں بھی
شہیدانِ وطن!
باپو سے جا کر کچھ نہ کہنا، ان کو دکھ ہوگا
انہیں محسوس ہوگا
گوڈسے نے تو فقط دو گولیاں کمزور سینے
میں اتاری تھیں
مگر میرے وطن کے سورماؤں نے
ہزاروں گولیوں سے کر دیا چھلنی میرا سینہ
میرے سپنے تو زندہ تھے
انہیں بھی بھسم کر ڈالا
شہیدانِ وطن!
باپو سے جا کر کچھ نہ کہنا، ان کو دکھ ہوگا

ہمارا خوں بہا ہے اپنی دھرتی پر
اسی دھرتی پہ اپنے خون سے
تعمیر کرنی ہے نئی دنیا
عقیدہ ہے ہمارا
شیطانیت کرتی ہے اک دن خود کشی
اپنے ہی خنجر سے
اگر ایمان ہو پختہ
کبھی انساں نہیں مرتا
کبھی انساں نہیں مرتا

○○

زبیر رضوی

بے نواؤں کے نام

پھر وہی سب ہوا
ننھے بچوں کو نیزوں پہ تولا گیا
نام کی تختیاں دیکھ کر
گھر جلائے گئے
ایک انبوہ شہر ستم
قتل گاہوں کے نقشے بناتا رہا
بے نواؤں کی آبادیوں،
بستیوں کو جلاتا رہا

پھر وہی سب ہوا
بے ردا عورتوں اور
جواں لڑکیوں کے بدن
وحشی ہاتھوں سے نوچے گئے
عصمتوں کے شگوفوں کو مسلا گیا
ظلم ایسا ہوا
صبح سے شام تک
رات سے رات تک
آگ اور خون میں
زندگی چیختی، بلبلاتی ہوئی
بے صدا ہو گئی
بے اماں ہو گئی

حاکم وقت نے
دستِ قاتل کو بوسہ دیا
رات سے رات تک
اور تازہ لہو
خنجروں نے پیا
مقتلوں میں بہا
دستِ قاتل بتا
اور کتنا لہو
تیری سفاک تیغوں کو درکار ہے
تیرے چاروں طرف
بے نواؤں کی لاشوں کا انبار ہے

OO

دیوی پرساد مشر

جَن گَن مَن بے گانہ

(۱)

ایک شخص کو اس لیے جلایا گیا
کہ اس کا ایک نام تھا
اور ایک انسان کا چہرہ
اتنا انسان کی طرح تھا
کہ اس کی پتلون اتاری گئی
پہچان کے لیے

اور گولی بھی وہیں ماری گئی
جہاں چوٹ تھی شناخت کی

یہ طاقت کا سرور تھا

(۲)

ایک وزیر داخلہ تھا
جو نفرت کی مساوی تقسیم کی رتھ یاترا تھا

ایک وزیر اعظم تھا
جس کی شکل پر آخر کار
فخر سے کچھ کہنے کا پس و پیش بھی نہیں بچا تھا

ایک صدر تھا
جس کے پاس ملک کے سب سے بڑے محل میں
رہنے کے سوا کوئی حق نہیں تھا
جبکہ حقوق سے لت پت کیبنٹ
رائے عامہ کے لیے
جمہوریت میں سب کو عوام نہ ماننے کا
بیہودہ پن تھا
لیکن خاص بات یہ تھی کہ ایک وزیر اعلیٰ تھا
جس کے چہرے پر ہٹلر ہونے کی طمانیت کا
پسینہ چھلچھلاتا تھا

(۳)

یہ اخبار کے پہلے صفحے پر ایک شخص کو
ہاتھ جوڑ کر بخش دیئے جانے کی منت کو
دیکھنے کی بے چینی تھی

یہ
اکثریت ہونے کی مایوسی تھی
شرمندہ ہونے کا اجاڑ تھا
تشدد کا یہ ہالی ووڈ تھا

جے شری رام کی گونج کے درمیان
ہے رام کی پستی کا بیابان تھا

(۴)

اشتراکی ماضی اور اقتداری حال والے
وزیر دفاع نے گویا تحفظ کا بھروسہ نہ دلانے
کے لیے کہا
کہ ایسا پہلی بار تو ہوا نہیں
کہ حاملہ عورت کے پیٹ پر
پہلی بار وار کیا گیا ہو
یا کہ پہلی بار زنا
یا کہ پہلی بار اس طرح کی حیوانیت پر
اس طرح کی آہ و زاری
یعنی اگر یہ ہوا تو اس طرح ہوتا ہی رہا تھا

بربریت کی تاریخ بربریت کی توسیع کی
وجہ کیوں نہ بنے
اقتدار میں ہونے کا مطلب ہی یہ ہے
کہ شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی
اور فسطائی ہم کیسے ہوئے
کیونکہ صرف استاد ہی تو جلایا گیا
بچے ہی تو امتحان میں نہیں بیٹھے
مارے خوف کے
اور وفاداری کے امتحان میں
ان کی کامیابی مشکوک تھی
تو ہم فسطائی کیسے ہوئے
کیونکہ استاد ہی تو جلایا گیا کتب خانے نہیں
اور ہم نے بربریت باقاعدہ جدید ہندوستانی
زبانوں میں کی

(۵)

صدر مملکت نے کہا
دیکھو میں چپ رہا
جبکہ میرے پاس ضمیر تھا
کہ ضمیر رہتے ہوئے
چپ رہنے میں کتنی مشکل پیش آتی ہے
میں چپ رہا جبکہ میرے پاس
کہنے کے لیے یہ تھا کہ
ریاست قتل و خون کی سار بانی نہیں کرتی

اور برخواست کرنے کے لیے درندگی
اور بچانے کے لیے روح تھی

تو صدر مملکت آئین کے مطابق خاموش تھا
قتل کی گنجائش آئین میں نہیں تھی
جہاں اہتمام یہ تھا کہ
قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں
جبکہ زیادہ تر حصوں میں
لوگ تھے قانون نہیں تھا
عوامی نمائندے تھے
عوام کہاں تھی معلوم نہیں
اور بالآخر سب کچھ کرنا تھا وزیر اعظم کو
اور اس کیے ہوئے کو سہنے کے لیے تھی عوام
جلنا بھی اسے ہی تھا

یہ سب دیکھ کر
صدر مملکت نے وزیر اعظم سے کہا ہو شاید
کہ بالآخر مجھے اپنا ضمیر بچانا ہے
آپ کو اور عوام کو دکھ

(۶)

بے انصاف جوتوں کے نیچے
کمزوروں کو دانہ دیکھا
جے ہند، جے ہند

تھانے بھر میں قاتلوں کا گاناد یکھا
وزیر تھانے میں بیٹھا ہے
ستیہ میو افسانہ دیکھا
عملے بہت تھے انصاف نہیں تھا
غیر منصفانہ من مانا دیکھا
کھدّر اور خاکی سے ہو کر
جمہوریت کا جانا دیکھا
روتی عورت اور روپڑی
جن گن من بے گانہ دیکھا

(۷)

اقتدار کے لیے کئی بار
جنگ کی ضرورت ہوتی ہے
جب کہ لوگ راستے، روٹیاں، موسیقی،
کتابیں، کھڑکیاں اور تدارک کی ترکیبیں
چاہتے ہیں
لوگوں میں جب ایک باپ شامل ہوتا ہے
تو وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیٹی
ایک پھٹی شلوار پہنے
اور کھاٹ بھر اور رات بھر کی نیند تو بھئی!
ہر کسی کو چاہئے

لیکن ایک پارٹی کو اقتدار چاہئے
تو جنگ بھی چاہئے

جبکہ ایک بھوکا آدمی پیٹ بھر کھا کر
اپنا احترام واپس چاہتا ہے
اور اپنے ہونے کا ابتدائی اقتدار
ملک کے ہر شہری کو دو وقت کا کھانا
اور پھر...... ایک جیسا کھانا ملے
یہ مانگ تو سیاسی ڈھانچے میں تبدیلی کی
مانگ کرے گی
لیکن اس طرح کی باتیں
کہ ہر ایک کو روٹی ملے
اور جو گھر سے گیا ہے
وہ رات تک گھر لوٹ آئے
ایسی باتیں صرف دعاؤں میں ہی بچی ہیں
اور ان کا ذمہ عرصے سے ایشور پر ہے
اور ایشور کسی کی نہیں سنتا
اور پارٹی ہے کہ ایشور کو ساتھ لیے بنا چلتی نہیں

پارٹی کو اقتدار چاہئے
اس لیے ایشور چاہئے
پارٹی کو جنگ اور ایشور چاہئے
فساد جنگ کا عارضی نعم البدل ہو سکتا ہے
اس لیے پارٹی کو جنگ یا فساد اور ایشور چاہئے

پارٹی کو سیاسی اقتدار چاہیے
اس لیے اسے ایک سیاسی جنگ
ایک سیاسی دنگا اور ایک سیاسی ایشو چاہیے

پارٹی کو ویسا ہی ایک سیاسی سماج چاہیے
جبکہ بچوں کو اسکول چاہیے
اور وہاں تک پہنچنے والے محفوظ راستے

(۸)

اقتدار کے لیے
درندوں میں رسہ کشی تھی
جہاں مرکزی فہم یہ تھی کہ
ناانصافیوں اور عدم مساوات کے باوجود
اقتدار میں ہم لوٹتے رہیں گے

اقتدار کے بنجرپن کے پاس
نفرت کے مرکزی منصوبے تھے
جن کی تقسیم
ایک غیر فنی مشکوک لفظ مخالف بنیاد پرست
بے سُری اور منتشر سماج بناتی تھی

پھر سماج میں اور سوانح میں
اندھیرا پھیلتا تھا
پاؤں لڑکھڑائے تھے

جسم گیندے کے پودے کی طرح
لرزنے لگتا تھا
عشق کے لیے نکلا ہوا لڑکا لاپتہ ہو جاتا تھا
اور تلاش معاش کے لیے گھر سے نکلی
لڑکی کی چیخ سنائی دیتی تھی

اس طرح پھیلتی تھی مایوسی
جو تدارک کی ترکیب میں بھی بدلنے لگتی تھی
جو اس طرح کی سطریں بھی لکھوا لیتی تھی
خود ترحمی میں بیت گیا ہے
بنا عمل کے رویا جیسے یا کہ
خود نوشت میں کیا کہنا تھا
کیا کہہ بیٹھا اپنے میں سے
یا کہ حق لینے آیا تالا ہے نالوٹو نگا خالی ویسے
یا کہ سا۔رے۔گا بس گلا رندھ گیا
آتما میں اٹکا ہے ما۔پا
یا کہ بہت اندھیرا چھا جاتا ہے
جن گن من گایا جاتا ہے
یا کہ ہے اندھیرا بہت دھوپ
فائدے نقصان والے چپ
یا کہ کھو گیا ہے چین اسے حاصل کروں کیوں
یا کہ گریٹر کیلاش ترقی یافتہ امریکہ
کھچڑی پور ہے اندھیرا افریقہ

یا کہ اس دفعہ بسنت میں دکھ ہرا ہوا
پت جھڑ میں اس دفعہ خوب گرا خون
یا کہ کویتا کے بدلے ملتی ہے موت
مکتی بودھ مکتی بودھ مکتی بودھ
یا کہ جنگ جس سیاست میں
اس کا چہرہ دیکھا
ایٹم بم نسب کر کے تہہ خانے میں لیٹا
حق پانے میں مشکل تو ہے صیہونی ہے ٹھیکہ
انتخاب کے پہلے کھینچی لوٹ مار کی ریکھا
سرحد کے اس پار اگر ہے
اس دکھ کا کیا لیکھا
بہت دور تو کبھی نہیں تھا اس کوٹہ سے کوئٹہ
یا کہ جب زیادتی ہے زیادہ
میں کہاں ہوں ہے سوال
یا کہ جیسا کہ یوریپیڈز کے ناٹک میں
السسٹس نے کہا
یاد رکھنا میں نے تم سے پیار کیا
سورج کو گنوانہ دینا یا کہ

(۹)

حکمراں کے کچھ بھی کہنے سے میرا
بھروسہ کم ہو جاتا تھا
اینٹ پر سر رکھ لینے سے تناؤ

اپنے دکھتے بازو پر سر رکھ کر
میں نے ایک معمولی سی جھپکی میں
کم دکھوں والا سپنا دیکھا جو
نیند ٹوٹنے پر
زیادہ دکھوں کا تدارک تو ضرور تھا

میرے ہندو ہونے کے امکان نے مجھے
اتنے سارے ایشور دے دیئے کہ میں نے
اُوب کر کہا کہ اتنے ساروں کا کیا کروں
کسی بھی ایشور سے بہتر تھا میرا دوست
راجیش ورما جو میری ہی طرح
موت پر یقین رکھتا تھا
اور جس کی طرح میں داڑھی رکھ سکتا تھا
انسان کو انسان کی ضرورت تھی
لیکن شک کے دائرے میں آنے والے بھی
انسان ہی تھے
جو ایشور کی ایجاد سائیکل کی طرح نہیں
نیوٹران بم کی طرح کرتے تھے
اور اگر ایشور بے گھر تھا تو یہ ذمہ
آواس وکاس پریشدوں اور HDFC
وغیرہ کا تھا
کہ اسے گھر ملے
لیکن گھر ملے یہ تو کروڑوں کی مانگ تھی

مانگ تو یہ بھی تھی کہ ہر ایک کو انسان ملے
اور قمیض
ماں نے جنم، خواہشوں نے کویتائیں
بھاشا نے نام اور ریاست نے دکھ دیے
شہریت بھی ریاست کو ہی دینی تھی جبکہ
انسانیت کے سوتے کہیں اور تھے

(۱۰)

تو انسانوں کے قتل کی خبریں
سنتا دیکھتا ہوا میں
ایک انسان تھا
لیکن قتل کی خبروں کے علاوہ
یہ خبریں بھی تھیں
کہ کرکٹ میں سچن تیندولکر نے
کیا کرنے کے لیے بلا گھمایا
اور کیا نہیں کر سکا
اور کہ امیتابھ بچن نے
ایک اور بری فلم میں
کام کرنے کے لیے
اپنے ضمیر پر پتھر نہیں رکھا
اور کہ پیپسی پینے سے بہت کچھ ہو سکتا ہے
اور نہ پینے سے بھی
مسلمانوں کے بھوک سے مرنے کی
خبر کے لیے
ٹی۔وی سماچار میں جگہ نہیں تھی
لیکن ایک ہی کنبے کے پانچ افراد کے
جلا دیے جانے کی خبر کا کوئی ثبوت
نہ ہونے کے باوجود
ان کے بچنے کا جھوٹ نہیں رچا جا سکا

میں بالکنی کی طرف نکلا
اور تاروں کو دیکھنے کے لیے
میں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا
تو آنکھوں سے پانی گرا جو ہونٹوں تک آیا
پتہ چلا کہ اس میں رتی بھر نمک بھی موجود تھا
اس میں ماشہ بھر اپنے انسان ہونے کی
یاد دہانی بھی شامل تھی

(ہندی سے ترجمہ: نعمان شوق)

OO

مہاراج کرشن سنتوشی

کفر

مجھے لگتا ہے
جب کہیں کوئی مندر بن جاتا ہے
دھرتی پر
ایک نیا اسکول کھل جانے کے امکانات

مر جاتے ہیں
مجھے لگتا ہے
جب کہیں کوئی مسجد گھیرنے لگتی ہے
بہت ساری جگہ
کئی ضرورت مند لوگوں کے گھر
بننے سے رہ جاتے ہیں

خدایا!
کہیں ایسا نہ ہو
تمہاری ہی دھرتی پر
تمہارے ہی سب
بوڑھوں کے سیر کی جگہ کم ہو جائے
تنگ پڑ جائیں کھیل کے میدان
چاہنے والے
کہیں بات کرنا چاہیں
تو پنڈت ملّا کے خوف سے
عشق کرنا ہی بھول جائیں
بتا ایشور! بتا خدا!
تجھے اپنے لیے
اور کتنی جگہ چاہیے؟

(ہندی سے ترجمہ: نعمان شوق)

OO

مخمور سعیدی

محمد علوی اور وارث علوی کے لیے

ایک نظم

تم اپنے گھر سے دور......
احباب کی محفل میں بیٹھے تھے
زبانوں پر
نئی تہذیب انسانی کے چرچے تھے
جو مذہب اور ملت کی پرانی تنگ راہوں سے
گزر کر، اک نئی دنیا کی جانب بڑھنے والی ہے
(محبت کے کھلے روشن، حسیں خوابوں کی اک دنیا)

تم اپنے گھر سے دور......
احباب کی محفل میں بیٹھے تھے
جبینوں پر
خلوص باہمی کی تابنا کی تھی
تبھی تاریک آوازوں کی لہروں پر
اچانک یہ خبر آئی
تمہارا شہر آگ اور خون کے طوفاں میں
جا ڈوبا

بٹی انسانیت وحشی قبیلوں میں
بپا غارت گری کا جشن ہے کالی فصیلوں میں

جلائے جا رہے ہیں لوگ
اپنے ہی مکانوں میں
لگائی جا رہی ہے آگ
گلیوں میں، دکانوں میں
بلکتی عورتیں، بچے، جواں، بوڑھے
کبھی نفرت کے خوں آشام
عفریتوں کا لقمہ ہیں
محبت کے وہ خواب
آنکھیں تمہاری جن سے روشن تھیں
یہ آندھی کی زد پر ہیں
بکھر کر، نوحہ خواں امید کی سونی لحد پر ہیں

تم اپنے گھر سے دور
احباب کی محفل میں بیٹھے تھے
لبوں پر زخم خوردہ سا تبسم تھا
مگر میں نے تمہیں روتا ہوا پایا
تمہارے شہر کی جلتی، دھواں ہوتی
فضاؤں میں
تمہاری سسکیاں میں نے سنیں
قاتل ہواؤں میں
انہی خوابوں کی لاشوں پر
کہ جو شاید تمہارے
زندہ آدرشوں کے سائے تھے
سفر میں بھی جنہیں تم
ساتھ اپنے لے کے آئے تھے

اب آنسو پونچھ لو دیکھو
سلگتی شام کی دہلیز پر کچھ آہٹیں سی ہیں
فرشتے..........
تعزیت کو خوں شدہ خوابوں کی آئے ہیں
تمہارے واسطے شاید کوئی پیغام لائے ہیں
سنو! شاید کوئی سرگوشیوں
میں تم سے کہتا ہے
اجڑتی بستیوں کو حوصلہ دینا ضروری ہے
پرانے خواب مر جائیں تو ایسے میں
نئے خوابوں کی اک دنیا بسا لینا ضروری ہے

OO

نعمان شوق

رات اور چیخ

اک جنگلی سور کے ڈر سے
اپنے اپنے گھر میں
دبکے رہنے والے سورماؤں کی طرف
کیوں دیکھتے ہو

ان کے گھر میں عیش کوشی کی

ہزاروں جنتیں آباد ہیں
انہوں نے اس زمیں کی
سب سے اچھی درس گاہوں سے
مناسب قیمتوں پر لے رکھی ہے
ہر سند تہذیب کی
انصاف کی
اور امن کی

تمہاری چیخ میں بکھری ہوئی
چنگاریوں کا بے محابہ رقص
اُن کی خواب گاہوں میں
اندھیرا ہی اندھیرا ابھر گیا تو.........

OO

بھیک

کس مندر کی گھنٹی سے
ڈرا سہما ہوا بھگوان
اک ٹوٹے ہوئے ویران گھر میں
جا چھپے گا

اور پجاری
خون میں ڈوبے ہوئے ترشول لے کر
دیویوں اور دیوتاؤں کو پکاریں گے

صلیبیں بھی کلیساؤں میں اب خالی ملیں گی
کیوں کہ سب معصوم طینت لوگ
گلی کے موڑ پر سولی سے لٹکے
دعائے مغفرت میں
ہر گھڑی مصروف ہوں گے
قاتلوں کے واسطے

اذانوں میں
خدائے لم یزل کی کبریائی کے عوض
شاید کسی قہار یا جبار کی
حمد و ثنا ہوگی

ہم اپنی عافیت کی بھیک مانگیں گے
خدا کے نیک بندوں سے

OO

نصرت محی الدین

موت رقصاں ھے گلی کوچوں میں

یہ فلک بوس عمارات
یہ پُر کیف مکانات
ہم نے خود اپنے ہی
ہاتھوں سے تو بنائے ہیں
جن میں دن بھر کے تھکے ماندوں کو

راحت و سکوں ملتا ہے
یہ لہلہاتے کھیت یہ کھلیان
یہ سرسبز باغات
ان میں بھی ہمارے خون و پسینے کی
مہک شامل ہے
دیش کی آزادی میں
برابر کا حصہ ہمارا بھی تو ہے
ہماری وفاؤں کی خوشبو رچی بسی ہے
ہم تو صدیوں سے بہت خوش تھے
وطن میں اپنے
پھر یہ زعفرانی کیڑوں کی
فصل کس نے اگائی ہے
جو لہلہاتے کھیتوں اور کھلیانوں میں
گھس آئے ہیں ان کی جڑیں کاٹ رہے ہیں
اور انہیں تہس نہس کر رہے ہیں
یہ کیسی سازش ہے
یا پھر منصوبہ بند نسل کشی
سیکولر ذہن منجمد سے ہیں
انسانیت دم بہ خود ہے
موت رقصاں ہے
گلی کوچوں میں

○○

حفیظ آتش

گجرات

اے تناور درخت
تیری ہی چھاؤں میں
ہم ہوئے ہیں جواں
اور ہمارے سبھی
یعنی اسلاف سے
تیری ہی چھاؤں میں
زندگی کی سبھی
جیتی رنگینیاں
سر چڑھائیں یہاں
اب کہاں جائیں ہم
تیری اس چھاؤں کو چھوڑ کر
حالانکہ
سبز پتے سبھی جل چکے
ڈالیاں ٹوٹ کر گر پڑیں
ہاں مگر
اے تناور درخت
کوئی موسم ہمیشہ تو رہتا نہیں
نفرتوں کی سلگتی ہوئی آندھیاں
چل کے کچھ دیر تھک جائیں گی
سبز پتے نکل آئیں گے
ڈالیاں بھی جواں ہو کے لہرائیں گی

○○

نسیمؔ مخموری

ایک نظم

مرے وطن پر قیامتوں کے
وہ رنگ اترے ہیں کیا بتاؤں
جلادیے ہیں مکان کتنے
وہ ہاتھ باندھے کسی نے اس کے
گلے میں اس کے وہ ایک ٹائر
پڑا ہوا ہے
وہ جل رہا ہے، وہ جل رہا ہے
قصور اس کا کوئی نہیں ہے
ہزار بچے جلادیئے ہیں سڑک پہ لاکر
اتار ڈالی ہے ان کی عزت
قصور ان کا نہیں تھا کوئی
جلے ہوئے جسم ان کی ماں کے
جلے ہوئے جسم کے وہ بچے
یہی قیامت یہی قیامت
یہ رنگ ابھرا ہے جو نہیں تھا
میرے وطن پر قیامتوں کا
وہ رنگ اترا ہے کیا بتاؤں

○○

لکشمی شنکر واجپئی

پہچان

لت پت پڑی ہوئی ہے
کوئی لاش خون میں
مارا ہے جس کو بھیڑ نے
اندھے جنون میں
اور رو کے اس کی لاش پر
ماں کا بُرا ہے حال
ایسے میں میرے ذہن میں
اٹھتا ہے یہ سوال
ہے کون سا مذہب
کوئی پہچان بتائے
یہ اشک ہیں ہندو کہ مسلمان بتائے

○○

فکر

میں بہت فکر مند ہوں
اپنی بیٹی کے مستقبل کی خاطر
میرا بیٹا تو ہمیشہ کھیلتا ہے
پستول، اسٹین گن اور مشین گن سے

چھیڑتا ہے جنگ، کرتا ہے بمباری
لیکن
کیا کروں اپنی بیٹی کا
وہ آج بھی گڑیوں سے کھیلتی ہے!
(ہندی سے ترجمہ: نعمان شوق)

○○

راشد جمال فاروقی

خبروں کے نرغے میں

باخبر۔ باعلم رہنے کا جنوں
کن حدوں تک جاچکا ہے
ہر گھڑی ہر آن بس
خبروں کے حملے بڑھ رہے ہیں
واقعہ یا حادثہ یا سانحہ، جو کچھ بھی ہے
بس آپ کے پردے پہ آویزاں ہے
اپنی پوری ہیبت ناک صورت میں
ابھی تو آپ
پچھلے حادثے پر ہی، یقیں کرنے کی
تیاری میں تھے یہ کیا!
تحیر کا نیا سیلاب در آیا
تجسس کے نئے ریلے امڈ آئے
اگر اقدار کے کچے گھروندے
بہہ بھی جائیں تو تعجب کیا
یقیں کی سب فصیلیں
کانپ کر گر جائیں
ایسے زلزلے میں، تو بھی کم ہے
پھٹی آنکھوں سے یہ دلدوز منظر دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں میں
متاع اعتبار آدمیت لٹ رہی ہے
جو اک مانوس دنیا تھی وہ پیچھے چھوٹ رہی ہے

○○

مظہر الزماں خان

اندر کا بالک

(اٹل بہاری جی کے لیے)
اٹل جی آپ ایک مورکھ ہیں
اور دھوپ بھرے
پریکشا ہال میں بیٹھے ہیں
آپ کے سامنے پرچہ ہے
جس میں جلتے سوال ہی سوال ہیں
اور آپ ایک ہاتھ سے ماتھا پکڑے
سوچ رہے ہیں
کوی کا ہردے کستوری ہوتا ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی پون

اندر اس کے چلتی ہے
لیکن میرے چاروں اور
گرم پون کے جھونکے ہیں
اور میں دھوپ بھرے
پریکشا ہال میں بیٹھا ہوں
اور سامنے رکھے پرچہ میں
سوال سب جل رہے ہیں
لیکن، ان سوالوں سے الگ
میرے بھیتر کے کورے کاغذ پر
کوئی سوال لکھا نہیں ہے
اور ایک ننھا بالک
ہاتھ پسارے کھڑکی میں بیٹھا
چھپ چھپ
مجھے بلا رہا ہے

○○

عبدالصمد تپش

دو نظمیں

(۱)

مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے
کہ اگلوں کے آدرش کی موٹی موٹی کتابیں
(اہنسا کے سارے اصول و ضوابط)
جو برسوں سے طاقوں پہ رکھی ہوئی
گرد آلود حالت پہ نوحہ کناں ہیں
وہ سب کرم بغض و عداوت کی چاٹی ہوئی ہیں
زمیں خونِ ناحق کی پیاسی زمیں
ہر طرف اپنے لب چپچپانے لگی ہے!!

(۲)

(احسان جعفری کے نام)

میں جنم جنم سے تمہارے ساتھ رہا ہوں
لیکن تمہیں پہچان نہ پایا
اس لیے کہ میں سادہ دِلی کی اس منزل میں ہوں
جہاں سے حماقت کے سرے ملتے ہیں
اور تم
دشمن ہوتے ہوئے بھی
دوست بنے رہنے کا
ہنر جانتے ہو!!

○○

ترنم ریاض

رہنما

رہنے دو،
بہت ہے آبادی
سہنے دو انہیں سردی، گرمی

قسمت ان کی!
تڑپیں یہ بد قسمت بچے
ماں باپ نہیں ملتے جن کے
مدرسے چھوٹ گئے
گھر ٹوٹ گئے تو کیا

امداد کہیں غائب ہو جائے
یا کتے چبائیں لاشوں کو
سڑتے ہی رہیں قصبے، گاؤں
تم سے مطلب........؟

طیاروں سے تم دیکھو جھلک
دلدوز کرو تقریریں پھر
کچھ عہد کرو، پھر توڑ دا نہیں؟
ہونی کا کسی کو نہیں پتہ
(گجرات، زلزلے کے بعد)

○○

یہ میرا ملک

اس کی انا،
گھر کے دکھڑے،
بیماری، کم تنخواہ
ترقی کی دُھن

حاسد کے طعنے
سیلاب کہ سوکھا
سب جیون سے وابستہ ہے

لیکن یہ انسان کا خود انسان کی جان کے
درپے ہونا
یہ کس زمرے میں آتا ہے
کیسے ہوتے ہیں یہ؟
بے دل، اندھے، بہرے، ہوش سے عاری
حیوان بھی شرمندہ ہوں جن سے
(گجرات.......۲۰۰۲ء)

○○

بھگوان داس اعجاز

کتنے ناتھو رام

یہ ناٹک بھی دیکھیے، دیش کے نیتا لوگ
آپ لڑاتے قوم کو، آپ مناتے سوگ

ہمسائے کا گھر جلا، خوش تھے میرے لال
لپٹ لگی، اپنا جلا کیوں نا ہوئے نہال

لگا سبھی کچھ داؤ پر، دین، دھرم، قانون
سڑکوں پر بہنے لگا، انسانوں کا خون

کون کون تھا لوٹ میں، کیوں بولوں گا جھوٹ
نام تو گنوادوں کبھی، میں جاؤں گا ٹوٹ

بازو دونوں کاٹ کے ملا نہ سکھ آرام
سات چھپاسی ایک پہ دوجی پہ ست نام

مرنے والا کون تھا تو اتنا تو جان
وہ مکان کس کا جلا، کس کی جلی دوکان

دکھ پرائی پیر کا، کون کسے سمجھائے
جب کوئی اپنا مرے، تب منہ نکلے ہائے

ہر دنگائی پوچھتا، باپو گاندھی دھام
پہنچ گئے گجرات میں کتنے ناتھو رام

OO

انیس امروہوی

PARANOID

میں ہر رات
سونے سے پہلے
خبریں سنتا، دیکھتا ہوں
تقریباً سارے ہی چینلوں کی
اور رہتا ہوں اس انتظار میں
کہ کبھی تو کوئی
اچھی خبر بھی آہی جائے شاید

قتل و غارت گری
ہڑتال شہر بندی
گھوٹالے، کمیشن
زہر آلودہ بیان

کیچڑ اچھالتے نیتا،
اک دوسرے پر
عدلیہ سے منحرف خاندان

فسادزدہ گجرات
آگ، عصمت دری
ترشول کی نوک پر
معصوم بچوں کی لاشیں

خوف سے ہانپتے کانپتے
نیند میں بھی یہ سارے مناظر
روح کو سنگسار کرتے ہیں
خواب کی شکل میں
صبح کو اخبار والے کی
دستک!
فنا ہو جاتی ہے روح
پھر وہی سب
کیا یہ کوئی سزا ہے
جنم لینے کی اس ملک میں؟

OO

مرغوب علی

پاکستان نامہ

سفر کہانی۔ ۲

یہ تحریر سفر نامہ کے ذیل میں نہیں آتی، اسے رپوتاژ کے کھاتے میں بھی نہیں ڈالا جاسکتا۔ طفیل اختر مدیر ماہنامہ **مسکراہٹ** لاہور اور انیس امروہوی مدیر سہ ماہی **قصے** دہلی کی شدید خواہش کے تحت رقم ہونے والے یہ لمحات محض ان سے شیئر کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں کہیں، کہیں یاد نگاری کا ہلکا سا عنصر ضرور شامل ہو گیا ہے مگر کلی طور پر یاد نگاری کے فن سے بھی اس تحریر کو کوئی علاقہ نہیں۔ میں نے اس روداد کا عنوان **سفر کہانی** اسی لئے رکھا ہے تاکہ آپ اسے ایک مسافر کی کہانی سمجھ کر ہی پڑھیں۔ اگر اس میں کہیں کوئی لطف یا کام کی بات مل جائے تو اس کی داد ان مدیران محترم کا حصہ ہے۔ ہاں، اس تحریر کے سارے عیوب کا سزاوار میں ہوں۔

——— مرغوب علی

۳۱ر جولائی کا دن ہمارا .C.I.D کے دفتر میں آمد کا اندراج اور متعلقہ تھانے ہنجروال میں لکھوانے میں نکل گیا۔ ہمارے یہاں جو کام راشن کارڈ سے ہوتا ہے۔ وہاں وہی کام شناختی کارڈ یا اس کی زیراکس کاپی سے ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ایک اور کاپی بھی کام آجاتی ہے جسے عرف عام میں کرنسی نوٹ کہتے ہیں، ایسا وہاں بھی ہو گا لیکن اس پہاڑ کے نیچے سے اونٹ چونکہ نہیں گزرا اس لیے اس پر روشنی ڈالنے سے معذور ہے، ہاں دوسری جگہ یہ کاپی بہت استعمال ہوتے دیکھی، ممکن ہے فوجی حکومت کا خوف اور ڈسی پلن اس سب میں مانع ہو۔ شام پڑے عزیزوں کی آرجار شروع ہو گئی، جو رات دو بجے کے آس پاس بند ہوئی اور ہم سو گئے۔ اکرام تبسم اس درمیان کراچی سے کئی کئی بار فون کر کے میری خیریت لیتے رہے۔ وہ کسی ضروری کام سے ۲۹ر جولائی کو کراچی کے لیے نکلے تھے اور ان کی واپسی پانچ اگست کو متوقع تھی۔ ان پانچ دنوں میں مجھے اپنے سارے عزیزوں سے مل لینا چاہئے تاکہ پھر مصروفیت بڑھ جانے پر کسی عزیز کی شکایت کا شکار نہ ہونا پڑے۔ میں نے یہ سوچ کر یکم اگست سے مختلف رشتہ داروں

کے یہاں جانا شروع کر دیا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب میں اپنے عزیزوں کے یہاں لاہور اترنے کے دوسرے دن ہی ملنے گیا، ورنہ ہمیشہ کئی کئی روز بعد ان کا نمبر آتا تھا۔ یہ سب مجھ سے مل کر بے حد مسحور ہوتے رہے۔ شدت کی گرمی اور لاہور کا ٹریفک کسی کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ میں غلط موسم میں آگیا ہوں۔ جب تک اکرام نہیں آگئے تب تک میرے بھانجے فضل اکرام نے اپنی کار میں مجھے خوب خوب سیریں کرائیں اور اکرام تبسم کی کمی بالکل محسوس نہ ہونے دی۔ اگلی صبح بانس پیپر لا کر ہم سب نے **قصے** کے پیکٹ بنائے اور مختلف شہروں کو روانہ کر دیئے۔ اکرام کے گھر کا پتا یہ سوچ کر فون نمبر کے ساتھ لکھ دیا کہ ممکن ہے کوئی پیکٹ لوٹ آئے اور یہ بھی کہ کسی کو اگر **قصے** دیکھ کر اپنی کوئی تخلیق بھجوانی ہو تو وہ بھی بھجوا دیں تاکہ وہ میرے ساتھ بھارت جا سکے۔ اگلی صبح میں نے طفیل اختر مدیر **مسکراہٹ** کو فون کیا۔ طفیل اختر کافی پہلے دہلی آئے تھے، تب انیس امروہوی مدیر **قصے** فلمی پرچے **مووی اسٹار** کے ایڈیٹر تھے۔ اور **مسکراہٹ** کے مدیر اور انیس امروہوی محض ایک گھنٹہ ساتھ رہے تھے، لیکن قلب و جگر کے تار کہیں اتنی دور تک مل گئے کہ طفیل اختر نے اس چھوٹی سی ملاقات کو تب سے لے کر میرے فون کرنے تک بہت سنجو کر رکھا ہوا تھا۔ وہ اس سمئے کے بندھن سے خود کو بہت سال نکل جانے کے بعد بھی نکال نہیں پائے تھے۔ میرا تعارف سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور جلد از جلد ملنے کا اظہار کیا۔ میں ان سے خود فوراً ملنا چاہتا تھا مگر اکرام کراچی سے ابھی نہیں لوٹے تھے۔ میں نے ان سے قتیل شفائی مرحوم کے گھر کا فون نمبر طلب کیا جو انہوں نے فوراً مجھے دے دیا۔ پھر احمد ندیم قاسمی کا فون نمبر مانگنے پر انہوں نے مجھے اعزاز احمد آذر کا نمبر دیا اور کہا کہ یہ آپ کو قاسمی صاحب کا نمبر دے سکتے ہیں۔ اعزاز احمد آذر نے بہت شائستگی اور اطمینان سے میری بات سنی اور قاسمی صاحب کا نمبر مجھے دیا اور اپنی طرف سے انہوں نے یہ اضافہ بھی کیا کہ اگر لاہور میں وہ میرے کسی کام آسکیں تو انہیں خوشی ہوگی۔ قتیل شفائی کے گھر فون کرنے پر بیگم نوید قتیل فون پر مجھے ملیں۔ انہوں نے کہا کہ نوید بازار تک گئے ہیں۔ آدھ گھنٹہ بعد فون کرنے پر ان سے بات ہو سکتی ہے۔ آدھ گھنٹہ بعد نوید قتیل فون پر تھے۔ میرے بہت سی باتیں بتانے پر بھی انہیں مجھے پہچاننے میں دشواری ہو رہی تھی۔ گفتگو کے درمیان انہوں نے مجھ سے کہا کہ ۱۲ر اگست کو ابا کا چالیسواں ہے، اس میں ضرور شرکت کیجئے گا۔ وہاں کی نئی تہذیب اور معاشرے کی بدی کا تذکرہ اگلی قسط، جس میں قتیل شفائی کے چالیسویں کا ذکر ہے، تفصیل سے آئے گا (انشاءاللہ)

اگلی شام اکرام تبسم کراچی سے لاہور آگئے۔ رات میں فون کرنے پر طفیل اختر نے اگلی

صبح ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور صبح گیارہ بجے کا وقت طے ہوا۔ ہم دس بجے ان کے گھر کے لیے نکلے۔ ماڈل ٹاؤن، مصطفیٰ ٹاؤن سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے مگر طفیل اختر کا گھر ڈھونڈھنے میں ہمیں بہت وقت لگا۔ ہم کافی دیر سے ان کے گھر کے چاروں طرف گھوم رہے تھے۔ طفیل اختر نے پٹرول پمپ ماڈل ٹاؤن کے سامنے کہا تھا۔ پٹرول پمپ کے سامنے اتفاق سے تین گلیاں تھیں۔ ہم جس سے بھی پوچھتے وہ ہمیں کسی اور گلی میں روانہ کر دیتا۔ کچھ ہمارا پوچھنے کا انداز، کچھ بتانے والوں کا طریقہ، گھر نہ ملنا تھا نہ ملتا تھا۔ تھک ہار کر ہم نے اظہار ٹینٹ کے آگے گاڑی روک دی۔ میں جیسے ہی گاڑی سے باہر نکل کر اظہار ٹینٹ کی طرف جانے لگا کہ پیچھے سے کسی نے میرے نام سے مجھے پکارا۔ یہ طفیل اختر تھے جو بہت دیر سے ہماری گاڑی کو ادھر ادھر ہوتے دیکھ رہے تھے۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر واقع ان کے ڈرائنگ روم تک پہنچے۔ معانقے اور دعا سلام کے بعد ہم ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ بہت ٹھنڈے ڈرائنگ روم اور ٹھنڈے پانی اور پیپسی کے بعد جب ذرا دم میں دم آیا تب ان سے باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہوا۔ پہلے تو انہوں نے انیس امروہوی سے اپنی اکلوتی ملاقات کا احوال ہمیں سنایا اور یہ بتایا کہ انیس سے ان کی ملاقات اس سے بھی کم وقت میں ہوئی تھی جتنا وقت ہمیں ان کے پاس آئے ہوئے ہوا ہے۔ اس کے بعد ہم دنیا جہان کی باتوں میں مشغول ہو گئے، جن میں قتیل شفائی کی بیماری سے لے کر ان کے انتقال تک کا سارا مرحلہ، انہوں نے گوش گزار کیا پھر مشہور شاعر، اسکرپٹ رائٹر اور فلم میکر گلزار کی بات نکل آئی۔ طفیل اختر گلزار سے اپنے تعلقات کی مٹھاس ہم سے شیئر کرتے رہے۔ ان کے گیتوں کے مکھڑے، ان کی فلموں کے سین اور ان کی مہمان نوازیاں۔ میں ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں شیلف میں کتابیں اور ریک پر انہیں ملی ٹرافیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر میں یہ ٹرافی لیتے ہوئے بہت حد تک جنرل مشرف سے مشابہ ہیں۔ جب میں نے اس مماثلت کا ذکر کیا تو پھر بات آگرہ مذاکرات تک گئی۔ ہم سب ہی اس بات پر دکھی تھے کہ یہ ملاقات ناکام رہی اور اس کی ناکامی سے پہلے اور بعد میں جو انسانی خون ضائع ہوا اور ہو گا اس کے بچ جانے سے دنیا میں کچھ تو اچھا ہو سکتا تھا۔ موجودہ عہد کا یہ کیسا المیہ ہے کہ انسانی جانیں ضائع ہونے پر اب ہم بہت دیر تک ملول نہیں رہتے۔ جیسے ہم عادی ہو گئے ہیں یا بے حس، ورنہ نظریات کیا انسانی جانوں سے اتنے اہم ہو گئے کہ ہم ان کی بلی نہ دے سکیں۔

ہم بہت اطمینان سے بیٹھے گفتگو میں مشغول تھے اور طفیل اختر چولہے پر چائے کا پانی رکھ کر آچکے تھے، جب ان کی بیٹی شکیلہ اپنے اسکول سے لوٹی۔ پھر اس بچی نے ہمارے لیے چائے

بنائی اور دوسرے کئی لوازمات کے ساتھ ہمیں چائے پیش کی۔ ہمیں کچھ بھی کھانے کی خواہش نہ تھی مگر بیٹی نے مجبور کر کے پھر بھی ہمیں کیک کھلا دیا۔ بیٹیاں اپنے باپ اور پورے گھر سے، اپنے باپ کے ملنے والوں سے جو ایک والہانہ محبت رکھتی ہیں اور مہمانوں کا جو رتبہ سمجھتی ہیں وہ شاید لڑکے نہیں سمجھتے یا اسے نبھانے میں ان کو کہیں کوئی دشواری آتی ہے۔
دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ طفیل اختر کو بھی کہیں جانا تھا اور مجھے بھی ایک جگہ کھانے پر جانا تھا، اس لیے ہم پھر ملنے کے وعدے کے ساتھ رخصت ہوئے۔ میں طفیل اختر کے گھر سے آکر بیٹھا ہی تھا کہ راولپنڈی سے بھائی رشید امجد کا فون آگیا۔ انہیں میری کتاب **آدھی رات کی شبنم** موصول ہو گئی تھی۔ رشید امجد بہت پہلے راولپنڈی سے **دستاویز** نام کا سہ ماہی نکالتے تھے، جو بعد میں انہوں نے اپنے دوست اشرف سلیم کو دے دیا اور بہت دن تک اشرف لاہور سے **دستاویز** پابندی کے ساتھ شائع کرتے رہے۔
جن دنوں رشید امجد **دستاویز** نکالتے تھے ان ہی دنوں ماہنامہ **شاعر** ممبئی میں **دستاویز** کے ایک شمارے پر تبصرہ نکلا تھا، میں نے ایک خط سیدھے رشید امجد کو ہی لکھ دیا جس میں لکھا کہ لاہور کے اس پتے پر شمارہ فلاں کو V.P.P سے بھجوا دیجیے۔ کچھ دنوں بعد بہن لاہور سے آرہی تھیں۔ وہ یہ شمارہ لے آئیں اور انہوں نے مجھے بتایا کہ شمارہ رجسٹرڈ ڈاک سے انہیں ملا تھا۔ اس کے لیے انہیں کوئی پیسے ادا نہیں کرنے پڑے تھے۔ میں نے پھر رشید امجد کو شکریہ کا خط لکھا۔ وہ دن اور آج کا دن، وہ میرے بھائی رشید امجد ہیں اور میں ان کا برادرم مرغوب علی۔ انہوں نے فون پر میرے اور میرے گھر والوں کی خیریت دریافت کی۔ مجھے چھ کو پنڈی آنے کا دعوت نامہ بھی دیا مگر میرے پاس تو ویزا صرف لاہور کا ہی تھا۔ اس لیے میں پنڈی نہ جا سکا، مجھے کچھ مواد کی ضرورت تھی، جس کا تذکرہ ہونے پر رشید امجد نے سارا مواد جمع کر کے بھجوانے کا وعدہ کر لیا۔ پھر ان پر خصوصی گوشے کی بات چھڑی تو انہوں نے یہ سارا میٹر بھیجنے کا بھی وعدہ کیا، اور اپنی سانس کی بیماری کا تذکرہ کرتے رہے۔ دو تین روز بعد انہوں نے خصوصی مطالعہ سے متعلق مواد مجھے رجسٹرڈ ڈاک سے بھجوا دیا۔ جس دن ڈاک مجھے موصول ہوئی، میں نے سوچا رات کو فون سے حصولیابی دے دوں گا، مگر مجھ سے پہلے رشید امجد کا فون آگیا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے اپنا وہ خاکہ اس مواد میں نہیں بھجوایا جو ممتاز مفتی نے آپ پر لکھا تھا۔ دو ایک روز بعد انہوں نے وہ خاکہ بھی مجھے بھجوا دیا۔ جب میں میراجی کی نظمیں مرتب کر رہا تھا، تب بھائی رشید امجد اور ڈاکٹر سلیم اختر نے میری بہت مدد کی تھی۔ نہ جانے کہاں کہاں سے میراجی کی نظمیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی زیراکس کاپیاں بھجوائی

تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نظمیں کلیاتِ میرا جی، مرتب جمیل جالبی کے آجانے کے بعد میرے کام نہ آسکیں، کیوں کہ میرا کام کلیات آجانے کے بعد سمٹ کر ۱۲۸ صفحات پر رہ گیا تھا۔ رشید امجد اردو افسانہ کے کیسے طرح دار قلم کار ہیں اور انہوں نے اردو افسانہ کو کیا کچھ دیا ہے، وہ تو آنے والا وقت بتائے گا، فی الحال تو میں اپنے اس بھائی کی شخصیت پر ہی بات کر رہا ہوں۔ میں جتنے وقت لاہور میں رہا۔ رشید امجد نے مجھے ہر دوسرے دن فون کرنا خود پر فرض کر لیا، نہ انہیں مجھ سے اب کچھ کام رہ گیا تھا، نہ میں پنڈی جا سکتا تھا مگر وہ اپنی خرابیٔ صحت کے باوجود مجھے اپنی موجودگی کا احساس کراتے رہے۔

رشید امجد کے فون کے بعد ہم اقبال سحر انبالوی، جو اچھرہ (لاہور) میں کہیں رہتے ہیں اور جن کے گھر پہنچنے کے لیے ہمیں شاہراہ سے ایسی چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزرنا پڑا اور اتنی گلیوں سے کہ مجھے جامع مسجد دہلی کی وہ پیچ دار خم دار اور کسی حد تک تنگ گلیاں یاد آگئیں جن میں کڑاکے کی سردیوں میں بھی گرمی کا احساس جاگتا ہے، کے گھر ان کے بیٹے کی رہنمائی میں پہنچے۔ شام بہت تیزی سے ڈھل رہی تھی۔ ان کے گھر کے اطراف میں بہت زیادہ چہل پہل تھی۔ پرانے محلے کسی بھی شہر کے ہوں (خاص طور پر برصغیر میں) اپنی چہل پہل سے ہی اپنی شناخت کراتے ہیں۔ انبالوی ریٹائر آدمی ہے۔ ایک ماہنامہ **رشحات** نکالتے ہیں اور ایک سہ ماہی **مشاعرہ** نکالنے کی تیاری میں ہیں۔ بہت خلوص سے ملے، اکرام تبسم کے کافی قریبی تعلقات ہونے کی وجہ سے انہوں نے مجھے ایک عزیز کی طرح لیا، ان کی میزبانی میں بھی یہ انداز بار بار آنکھ مارتا رہا۔ ان کی بیٹھک میں ایک اور صاحب جو ریلوے پاکستان کے کوئی افسر تھے، ان سے ملنے آئے اور آنے والے جمعہ کو ظفر علی راجا کے دولت خانہ پر ایک اعزازی نشست طے کر گئے۔ ان سے اکرام نے سارا پروگرام طے کر کے یہ بھی کہہ دیا کہ آپ ایک روز پہلے فون سے کنفرم کر لیں۔ نہ ان کا فون آیا نہ ہم نشست میں گئے۔ انبالوی ان لوگوں میں سے ہیں جو تعلق کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ انہوں نے اکرام سے کسی دن کھانے پر آنے کے لیے بھی کہا مگر اس وقت تک میرا لاہور کا پروگرام بہت مختصر تھا۔ اس لیے ہم نے معذرت کر لی۔ انبالوی نے اپنا پرچہ **رشحات** مجھے دیا جو ابھی بہت نحیف و نزار سا ہے لیکن اگر انبالوی محنت کرتے رہے تو کبھی نہ کبھی یہ ایک مستند دستاویز بن جائے گا۔ انبالوی کے گھر بیٹھے بیٹھے مجھے نجیب آباد کی بری طرح یاد آتی رہی۔ ایک تو ان کی گلی کا ماحول، پھر اوپر سے بجلی کی آنکھ مچولی، انبالوی بار بار ہاتھ کا پنکھا لینے کے لیے اٹھتے تھے۔ جیسے ہی اٹھتے بجلی آجاتی۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ کہہ دوں حضرت آپ اس بار تو پنکھا اٹھا ہی لائیے، مگر خاموش رہا اور یہ سوچ

کر خود میں ہی جلتا۔ بھنتا رہا کہ کیا یہ ضرور ہے کہ سب جگہ ایک سا جواب ہی پاؤں یا پھر وہ کہاوت کہ جہاں گیا بھوکا وہاں پڑا سوکھا، کچھ مجھ ایسے کے لیے ہی بنی تھی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بجلی پھر چلی گئی مگر اس کے بعد واپس پلٹی تو ہمارے رہنے تک پھر پلک نہ جھپکی۔ ہر بار بجلی گل ہونے پر انبالوی کا شرمندہ ہونا اور مختلف جواز دینا عجیب سی کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ ہنسنا چاہئے پھر سچویشن کہتی تھی چپ رہو۔ چپ رہو! ہم اس سب سے بچ کر ان سے رخصت لیکر جلد نکل آئے مگر ہم پھر ان کے گھر گئے۔ اکرام تبسم اپنا چشمہ بھول آئے تھے، جو کافی تگ و دو کے بعد آخر کار اکرام تبسم کی قمیض کی جیب سے برآمد ہوا۔ ابھی اکرام گاڑی پورچ میں کھڑی کر ہی رہے تھے اور میں پیر دھونے کے لیے غسل خانے کی طرف جا رہا تھا کہ سرمد اکرام نے مجھے خبر دی، ماموں جی کراچی سے کسی لیڈی کا فون ہے۔ میں فون سننے کے لیے مڑا تو میری بھانجی ثمینہ اکرام نے کہا کہ کوئی زاہدہ حنا آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ زاہدہ حنا آپا کو **قصے** بھجوایا تھا اور انیس امروہوی نے ان سے بھی خصوصی مطالعہ کی درخواست کی تھی۔ زاہدہ آپا کو میں نے پہلی بار نصرت پبلی کیشنز لکھنؤ سے چھپنے والی ان کی کتاب **قیدی سانس لیتا ہے** میں پڑھا تھا۔ ان کی ذہانت پہلے ہی افسانے سے مجھ پر طاری ہوتی چلی گئی تھی میری بری یا اچھی عادت ہے کہ جس افسانہ پر کتاب کا نام ہو میں پہلے اسے ہی پڑھتا ہوں۔ زاہدہ آپا کو میں جون ایلیا کے تعلق سے بھابی سمجھتا ہوں اور مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان کے ذکر میں (اس فون سے پہلے) کبھی میں نے انہیں زاہدہ حنا کہہ کر یاد کیا ہو۔ پچھلے سال **توسیل** سہ ماہی بمبئی نے زاہدہ آپا پر جب ایک خصوصی شمارہ شائع کیا، تب سے ہی میں میری خواہش تھی کہ زاہدہ آپا پر ایک جامع اور بہت کار آمد مطالعہ کی بھارت میں اشد ضرورت ہے۔ اتفاق سے انیس امروہوی بھی یہی سوچ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے زاہدہ آپا کو ایک آدھ بار لکھا بھی تھا۔ مگر وہ خط اور جو کتابیں اس خط کے ساتھ دستی روانہ کی گئیں، وہ زاہدہ آپا تک نہ پہنچ سکیں۔ میں یہ سب سوچتا ہوا زاہدہ آپا کو سننے لگا۔ شروع میں ایک دو بار میں نے انہیں بھابی کہہ کر ہی مخاطب کیا لیکن جب انہوں نے دوران گفتگو دو ایک بار مجھے بھیا کہہ کر مخاطب کیا تو میں آپا کی طرف لوٹ آیا اور پھر وہ میری آپا اور میں ان کا بھیا بن گیا۔ زاہدہ آپا نے خصوصی مطالعہ کے لیے کوریئر سے مجھے اتنا مواد بھجوا دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان پر ایک پوری کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے انیس امروہوی کے لیے شیر شاہ سید کی کچھ کتابیں بھی بھجوائیں۔ زاہدہ آپا بھی تیسرے چوتھے دن فون کر کے خیریت لیتی رہیں۔ سارے سفر میں انہوں نے جس طرح فون کے ذریعے مجھے اپنی شفقت کے سایہ میں رکھا،

میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا۔ مجھے ہمیشہ اس طرح کی محبت سے خوف آتا ہے۔ اس خوف میں میری اپنی کمزوریاں اور کوتاہیاں پوشیدہ ہیں۔ میرے ساتھ ایسا کئی بار ہوا کہ میں نجیب آباد میں ہوں اور لاہور کے دوستوں میں سے کوئی دہلی آیا اور مجھے اطلاع کی تو کب، جب ان کے جانے اور میرے پہنچنے میں کچھ گھنٹوں کا فاصلہ باقی رہتا ہے۔ دوست چلے جاتے ہیں اور مجھے کئی دن تک کے لیے خود سے شرمندہ ہونے کے لیے تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔

زاہدہ آپا کا آخری فون مجھے ۲۶ ر اگست کی رات میں ملا، میں نے انہیں ۲۷ ر اگست کی صبح جانے کا کہا تھا۔ انہوں نے رخصتی سلام ودعا کے لیے فون کیا۔ کہنے لگیں، میں نے سوچا بھیا تم پر تو سفر سوار ہوگا، تم مجھے فون نہیں کر سکو گے، اس لیے خدا حافظ کرنے کے لیے میں ہی فون کروں۔ جب میں نے ان سے کسی کے فون نمبر کو کہا تو کہنے لگیں، پرسوں میرا ایک چھوٹا سا آپریشن ہوا ہے میں اٹھ کر ڈائری نہیں لا سکتی۔ تمہیں فون بھی ہینڈ فون سے کر رہی ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوا اور ان کی اس محبت کو سوچ کر میری آنکھوں میں نمی آگئی۔

اکرام جب کراچی سے نہیں آئے تھے تب ہی میں نے ڈاکٹر سلیم اختر اور مظفر وارثی سے ایک ہی شام کا وقت دو گھنٹے کا فاصلہ رکھ کر لے لیا تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر اور مظفر وارثی دونوں علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتے ہیں اور دونوں کے گھروں کے درمیان بہت فاصلہ بھی نہیں ہے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اکرام تبسم نے ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے ایک بار اور کنفرم کر لیا۔ وہ ہم لوگوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں، میں ڈاکٹر سلیم اختر سے اس وقت ملا تھا جب خالد شریف اور اکرام تبسم نے شیران ہوٹل میں میرے لیے ایک شام کا اہتمام کیا تھا۔ یہ شام میری زندگی کی سب سے خوبصورت شاموں میں اس لیے ہے کہ اس شام میری ملاقات ان لوگوں سے ہوئی تھی جن کو پڑھ پڑھ کر میں لکھنا سیکھ رہا تھا۔ یہی نہیں جن کے بارے میں، بہت بہت سوچتا بھی تھا۔ شہزاد احمد، حسن رضوی، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، محسن نقوی، نیاز احمد (سنگ میل پبلی کیشنز) وسیم گوہر، پروین ملک اور دوسرے بہت سے۔ اس شام کے صدر قتیل شفائی تھے اور مہمان خصوصی (غالباً) منیر شیخ۔

اس شام کے بعد اگلے دن اکرام تبسم مجھے ڈاکٹر صاحب کے گھر لے گئے تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر بہت محتاط رہتے ہیں۔ گفتگو میں ہر چند کہ محبت کی ایک چاشنی ٹپکتی رہتی ہے مگر ہر کسی سے بے تکلف ہونا ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے گفتگو کو اتنا گھمایا پھرایا تھا کہ ایک وقت مجھے اپنی مدافعت کرنا مشکل محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر انہوں نے چلتے ہوئے مجھے اپنی بہت ساری کتابیں بھی دیں تھی۔ سلیم اختر صاحب جب خط

لکھتے ہیں تو ان کی تحریر پڑھنے میں ایک، ایک لفظ سمجھنے میں مجھے کئی دن لگ جاتے ہیں۔ ہم جب ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچے تب شام ڈھل رہی تھی۔ گرمی اس دن بھی بہت شدید تھی۔ ڈاکٹر صاحب شاید سو کر اٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر ہلکی ہلکی غنودگی کے آثار ابھی تک موجود تھے۔ وہ ہمیں دروازہ کے ساتھ والی سیڑھیوں سے اوپر لے گئے۔ یہ کمرہ ڈاکٹر صاحب کی مطالعہ گاہ ہے۔ اس میں ایک میز کے پیچھے بیٹھے، بیٹھتے ہی انہوں نے مجھے خصوصی مطالعہ کا سارا مواد جمع کر کے دے دیا تھا۔ میں نے اپنی کتاب **آدھی رات کی شبنم** پیش کرنے کے بعد عرض کیا کہ کتاب پڑھ کر اگر کچھ اچھا لگے تو مجھے تاثرات سے نوازیے گا۔ کہنے لگے ضرور، ضرور مگر اس کے لیے آپ کو بہت انتظار کرنا پڑے گا۔ آج کل میں نے جو کام ہاتھ میں لے رکھا ہے اس کو نمٹائے بغیر اب میں کچھ بھی پڑھنے اور لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ پھر انہوں نے اپنے دہلی کے سفر کا حال سنانا شروع کیا۔ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت ان پر بولتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو ہم سن رہے تھے اور لگ رہا تھا کہ ایک خاص زاویہ سے کسی روشن دان سے ایک نور ہمارے ذہنوں کو منور کرتا چلا جا رہا ہے۔ اسی درمیان چائے آگئی اور ڈاکٹر صاحب کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ وہ بتانے لگے کہ دہلی وغیرہ میں جب بھی لوگ ملتے ہیں تو ان کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے وہ سارے وقت میری ہی تحریریں پڑھتے رہے ہوں، لیکن کتاب کا نام پوچھنے پر وہی لوگ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ ایک اور مزیدار واقعہ سنئے۔ بھارت سے مجھے ایک خط ملا جس میں بہت سی غزلیں تھیں۔ خط میں لکھا تھا کہ آپ کا پرچہ **الجودت** (الجودت ڈاکٹر صاحب کے گھر کا نام ہے) دیکھا، کیا خوبصورت اور معیاری پرچہ ہے۔ کچھ غزلیں ارسال ہیں کسی قریبی اشاعت میں جگہ دیجئے گا۔

یہ لطیفہ نما خط جب ڈاکٹر صاحب سنا چکے تو ہم بہت دیر تک ہنستے رہے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کی کوئی تازہ کتاب نہیں آئی ہے، اس لیے وہ معذرت کرتے رہے اور پھر ہنس کر کہنے لگے، آپ کے پرچے **قصے** کے لیے جو مواد دیا ہے فی الحال اس سے ہی کام چلایئے۔ ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہو کر ہم مظفر وارثی کے یہاں پہنچے۔ مظفر وارثی سے میں کب ملا، کیسے ملا، یہ سب اب مجھے یاد نہیں، یاد ہے تو بس اتنا کہ مظفر بھائی ایسے شخص ہیں جن کو لاہور پہنچنے کے بعد سب سے پہلے ملتا ہوں۔ یہ پہلا اتفاق ہے کہ ان سے کئی روز بعد ملاقات طے ہوئی تھی۔ لاہور پہنچ کر طفیل اختر کے بعد میں نے ان کو ہی فون کیا تھا، جب میں مظفر بھائی سے ملا تب یہ غزل کے بہت بڑے اور صاحبِ اسلوب شاعر مانے جاتے تھے۔ نعت گوئی کی صنف آہستہ آہستہ ان میں پروان چڑھ رہی تھی۔ ایک بار خاص محرم کے دن ان کے گھر سے ہی ہم

احسان دانش سے ملنے گئے تھے۔ اس وقت مظفر بھائی بینک کی ملازمت میں تھے۔ میری غزل کا ایک مصرعہ "سرد تنہایاں برسات کی رم جھم، رم جھم" اس صورت میں تھا۔ شیزان ہوٹل کی شام سے واپسی پر انہوں نے اس میں ترمیم کر کے اس کی اصلاح یوں کی تھی۔

سرد تنہائی یہ برسات کی رم جھم رم جھم

اس ایک مصرعے کی اصلاح سے مجھے آگے چل کر کتنا فائدہ پہنچا اور میں نے محض اس ایک لفظ سے کیا کچھ سیکھا یہ میں ہی جانتا ہوں۔ ادھر کئی سال سے مظفر بھائی سے جو خطوط کا ایک سلسلہ تھا وہ بھی مفقود ہو چکا تھا۔ اکرام کے ذریعے ہی ان کی خیریت ملتی رہتی تھی، ہم نے دروازے پر دستک دی تو مظفر بھائی خود ہمیں لینے دروازے تک آئے۔ خیر خیریت کے بعد اکرام مجھے بتانے لگے کہ مظفر بھائی کی کتاب **گئے دنوں کا سراغ** ادھر کافی مشہور ہوئی ہے۔ مظفر وارثی، قتیل شفائی اور احمد ندیم قاسمی اس مثلث میں کیا، کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔ وہ بھارت میں بیٹھے بیٹھے بھی کچھ نہ کچھ پتا چل جاتا ہے۔ کبھی رسائل کے ذریعے، کبھی کسی رسالدار کے ذریعے۔ مگر اب قتیل شفائی تو رہے نہیں۔ قاسمی صاحب بھی بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔ مظفر بھائی خود ایسی منزل میں آگئے ہیں جب دشمنیاں دوستی میں بدل جاتی ہیں۔ **گئے دنوں کا سراغ** کا ذکر چھیڑ کر اکرام نے تو گفتگو کے لیے فضا ہموار کرنے کی کوشش کی تھی، مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔

پھر ہم تھے اور مظفر وارثی کے لہجے کا اتار چڑھاؤ اور شکایت زمانہ۔ ان کو سب سے زیادہ ذہنی تکالیف قاسمی گروپ سے ملیں۔ انہوں نے جو کچھ **گئے دنوں کا سراغ** میں تحریر کیا ہے۔ وہی اب ہمارے سامنے بیان کر رہے تھے۔ بظاہر مظفر وارثی میں اس طرح کی کوئی بات مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی جس سے لاہور کے ادباء میں ان کے لیے محبت کا جذبہ مفقود ہو جائے۔ انہوں نے جوش ملیح آبادی سے لے کر امجد اسلام امجد تک ایسے ایسے معرکے سنائے کہ مجھے افسوس ہونے لگا۔ کیا کسی شخص کی شہرت کچھ اشخاص کے لیے اتنی مضر ہوتی ہے کہ اس شخص کے دن رات کے سکون میں مسلسل نقب زنی کرتے رہیں۔ میں بات کا دوسرا پہلو بھی سوچ رہا تھا۔ میں کتنے دن کے لیے لاہور آتا ہوں؟ اور کتنا وقت ان حضرات کے ساتھ گزارتا ہوں؟ کوئی بھی فیصلہ لینے سے پہلے دو طرف کے معاملات کا سمجھنا بھی تو ضروری ہے۔ اسی درمیان کراچی میں ہوئے کسی فنکشن کا تذکرہ اکرام تبسم نے چھیڑ دیا۔ اس پروگرام میں کراچی کے شاعروں کے علاوہ دہلی کے شاعر واجد سحری بھی شریک ہوئے تھے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ آپ کے سامنے بچھے جاتے ہوں، وہ جب اسٹیج پر ہوں تب

ان کی انا اور ان کا تشخص کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔ مظفر بھائی کے تعلق سے کراچی کے اس اسٹیج پر کیا کچھ ہوا، یہ تو وہاں موجود لوگ جانیں مگر مظفر بھائی واجد سحری سے بھی نالاں محسوس ہوئے۔ انہوں نے غصہ بھرے لہجے میں وہ کچھ بھی کہہ ڈالا جو ان جیسے معتبر اور بڑے آدمی صرف اس وقت ہی کہہ سکتے ہیں جب ان کے دل اور دماغ پر بہت کاری ضرب لگائی جائے۔ (یہ مرض اپنی پوری طاقت اور خباثت کے ساتھ ہمارے یہاں بھی موجود ہے۔) میں نے کئی بار موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ان کی صحت کے بارے میں ایک آدھ بار سوال اچھالے۔ ان سے **گنے دنوں کا سراغ** لینے کے لیے استدعا کرتا رہا، مگر مظفر بھائی بہت زیادہ دُکھی تھے۔ پھر میں نے سوچا اگر وہ یہ سارے معاملات سنا کر ہلکا ہونا چاہتے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ ہم اس وقت انہیں سنتے رہیں۔ قتیل شفائی کی بیماری میں مزاج پرسی کے لیے ان کا جانا اور اس کے بعد کارِ دعمل پھر قتیل شفائی کا انتقال اور ایسی ہی دوسری باتیں وہ بہت دیر تک کرتے رہے۔

اخبار میں انہیں نعت گو کے بجائے نعت خواں لکھا جانا کیا ان کی خودداری کو زک پہنچانا نہیں ہے؟ انہوں نے ایک دو بار مجھ سے کہا بھی، یار میں ہی بولتا رہوں گا؟ تم کچھ بھی نہیں کہو گے؟ اس وقت ان کے ڈرائنگ روم میں جو فضا بن چکی تھی اس میں کسی ایسی بات کو چھیڑنا جو مزید غصہ اور ٹینشن کا باعث بنے، مجھے اچھا نہیں لگا۔ ہم چائے اور بہت لذیذ اور عمدہ بسکٹ مظفر بھائی کی باتوں کے درمیان پیتے، کھاتے رہے۔ کچھ وقفہ بعد ہم نے ان سے رخصت لی۔ وہ ہمیں دروازے تک ننگے پاؤں چھوڑنے آئے اور جب تک ہماری گاڑی بڑی سڑک پر نہیں آگئی، وہ دروازے میں کھڑے رہے۔ اقبال ٹاؤن اور مصطفیٰ ٹاؤن کا فاصلہ چھ کلو میٹر کا تو ہو گا ہی۔ سارے راستے اکرام تبسم اور میں ان کی گفتگو پر گفتگو کرتے رہے۔ اکرام تبسم نے ان کی کچھ خاص عادات کا ذکر کیا۔ وہ مشاعرے بہت کم پڑھتے ہیں۔ وہ ضیاء الحق کے قریبی ملنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی بیٹی یا بیٹے کی شادی میں نواز شریف شریک ہوئے تھے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ الگ ایک اہمیت رکھتی ہیں مگر مجھے لاہور کے سارے سفر میں ایک اس بات نے پریشان رکھا کہ آخر یہ سب ان کے ساتھ کیوں؟

واپس آنے سے پہلے میں رخصت کے لیے ان کے گھر گیا۔ وہ اسی تپاک سے ملے۔ کئی بیماریوں نے ان پر حملہ بول رکھا ہے۔ بقول ان کے، وہ پانچ بار ہارٹ اٹیک کو جھیل چکے ہیں۔ انسولین سے ان کی دوستی پرانی ہو چکی ہے۔ ان کے ایک پاؤں کا تلوا (سن) بے حس رہتا ہے۔ وہ السر کے پرانے مریض ہیں، لیکن اس سب کے باوجود تخلیقی طور پر وہ حد درجہ فعال ہیں۔ آج کل کسی روزنامہ میں ان کا ایک قطعہ روز چھپتا ہے۔ ادھر وہ اپنا سارا کلام یکجا کر رہے

ہیں۔ ان سے گفتگو کے دوران اور ان کی گفتگو میں خدا ہر پل موجود رہتا ہے، مگر بقول ان کے، لاہور میں ان کے بدخواہ بہت ہیں۔

میں جب ان سے رخصت لے کر چلنے لگا تو مجھے یاد آیا کہ اگلی ملاقات میں انہوں نے **گنے دنوں کا سراغ** دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا تو افسردہ ہو گئے۔ وہ یہ کتاب میرے لیے منگایا لا نہیں سکے تھے۔ ہم خوشی، خوشی وداع ہوئے۔ اب وہ کتاب اکرام تبسم ان سے لے کر مجھے بھجوائیں گے۔ تب مجھ پر وہ سارا معاملہ آشکار ہو گا جس نے مظفر بھائی کو بے چین کر رکھا ہے۔ (۔۔۔ جاری ہے)

○○

قابل مطالعہ کتابیں

نام کتاب : **معاصر اسلامی تحریکات اور فکر اقبال**

مصنف : ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی

مبصر : انور کمال حسینی

بقول مصنف کتاب: "۱۹۸۸ء میں اقبالؔ اور ان کی معاصر اسلامی تحریکات" کے عنوان سے تیرہ تحریکوں پر مشتمل ایک مقالہ ایم۔ فل کی ڈگری کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی میں پیش کیا گیا تھا، جواب اضافہ کے ساتھ "معاصر اسلامی تحریکات اور فکر اقبالؔ" کے عنوان سے بائیس تحریکوں کا ایک جائزہ اور ان پر اقبالؔ کے ردعمل کو کتابی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔" اقبالؔ صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ فلسفی بھی تھے۔ اور سیاستِ وقت پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ اسلامی تعلیمات کے تعلق سے ان کا مطالعہ وسیع تھا اور عالم اسلام کے استحکام اور بہتری کے لیے وہ ہمیشہ کام کرتے رہے۔ ان کی شاعری میں بھی موضوعات کے حوالوں سے ان کے پر خلوص جذبے کی بہ آسانی شناخت ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ اقبالؔ کی شخصیت مشرق اور مغرب کی تہذیب اور علوم کا سنگم تھی۔ اپنے وسیع مطالعہ، گہرے تجربات اور کھلے مشاہدات کی اساس پر انہوں نے اپنی شاعری اور نثری تحریروں کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اسلام کی تشریح اور توضیح اس انداز سے کی کہ اس کا حرکی اور انقلابی پہلو آشکارا ہو گیا۔ اقبالؔ کو بیسویں صدی میں ملت اسلامیہ کے ذہن کا اولین معمار کہا جاتا ہے، کیونکہ اسلامی فکر کی تشکیل جدید اور وقت کے فکری اور جذباتی رجحان کو تبدیل کرنے میں ان کا سب سے نمایاں حصہ ہے۔

اس کتاب میں تحریکوں کو مذہبی اور سیاسی و تنظیمی تحریکوں کے تحت شناخت کیا گیا ہے، مذہبی تحریکوں میں تحریک نیچریت، علی گڑھ تحریک کا مذہبی پہلو، اقبالؔ اور قادیانیت، بہائی تحریک، وہابی تحریک، علمائے ہند کی مسلکی تحریکیں، تحریک ردِ عیسائیت، تحریک ردِ آریہ سماج اور شدھی سنگھٹن ہیں تو سیاسی و تنظیمی تحریکوں میں تحریک اتحاد اسلامی، سنوسی تحریک، مہدی سوڈانی کی تحریک مہدویت، تحریک ندوۃ العلماء، تحریک خلافت، تحریک نظم جماعت وامامت، تحریک ہجرت، تحریک

جمیعۃ العلماء ہند، خدائی خدمتگار تحریک، تحریک مجلس احرار، تحریک مسجد شہید گنج، تحریک خاکسار اور تحریک اخوان المسلمون ہیں۔ اقبال ایک حساس مفکر اور نابغۂ وقت تھے۔ وہ ان سب ردیوں اور تحریکوں پر نظر رکھتے تھے۔ جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح اسلام سے ہوتا تھا۔ اپنے اس مقالے میں شجاع الدین فاروقی نے تقریباً ان سب ہی تحریکوں کا اقبال کی فکر اور آراء کی روشنی میں تفصیلی جائزہ لیا ہے جو اسلام اور اس کی تعلیمات سے کسی نہ کسی طرح متعلق تھیں۔ اس کتاب میں سرسید کے مذہبی افکار کا حوالہ بھی آیا ہے اور سید جمال الدین افغانی کا بھی، جن سے اقبال بہت متاثر تھے۔ یہ کتاب اقبال کے حوالے سے ایک بے حد اہم موضوع پر ایک قابل قدر شعوری پیشکش ہے جو اسلام کے بارے میں اقبال کے نظریات کو سمجھنے میں مدد دے گی۔ ڈمائی آکٹو سائز کے ۲۸۶ صفحات پر پھیلی یہ کتاب لیزر کمپوزنگ میں بہت اچھی شائع ہوئی ہے۔ سرورق پر تصویر اقبال پینٹنگ کے رنگوں میں بہت جاذب نظر ہے۔ OO

کتاب : **ازبیکستان، انقلاب سے انقلاب تک**

مصنف : ڈاکٹر قمر رئیس

مبصرہ : نگار عظیم

زیر نظر کتاب **ازبیکستان، انقلاب سے انقلاب تک** پروفیسر قمر رئیس کا ایک سفر نامہ ہے، جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز حد تک معلوماتی بھی ہے۔ ۱۹۹۱ء کے انقلاب کے بعد ازبیکستان میں ادبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی طور پر کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اور عوام پر ان کا کیا ردعمل ہوا، ان تمام پہلوؤں کو بھی اس کتاب میں اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ سفر نامہ بڑے سلیقے سے چھوٹے چھوٹے مضامین کے طور پر تقریباً ساٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ گیارہ اہم شخصیات کے خاکے مصنف کی فنی مہارت کی بہترین مثالیں ہیں۔ تمام مضامین کے معنی خیز عنوانات مصنف کے فکری تنوع کا پتہ دیتے ہیں، جیسے "نکلے میکدے سے"، "بلبل ہزار داستاں"، "آفندی کی سرگوشی"، "وہ گلیاں یاد آتی ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام مضامین ازبیکستان کی ثقافتی اور سماجی زندگی کے نہ صرف آئینہ دار ہیں بلکہ ایک ایسی صداقت کا منظر نامہ ہیں جو دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔

اس سفر نامے کی سب سے بڑی خوبی اس کی حقیقت نگاری ہے۔ عام سفر ناموں کی طرح یہ مبالغہ آرائی سے مبرا ہے۔ نیز زبان و بیان کے نکھرے پن کی وجہ سے ایک گونہ شگفتگی محسوس ہوتی ہے۔ واقعات کی منظر کشی اتنی حقیقی ہے کہ پڑھتے پڑھتے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ تمام واقعات و مناظر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور مصنف کے تجربے اور مشاہدے میں پل پل شریک ہیں۔ فلک پیمائی ہو یا آفندی کی سرگوشی۔ دیار بابر ہو یا اندیجان کا سفر، بی بی فاطمہ کا کنبہ ہو یا فیروز جان

کی مہمانی، وادیٔ سمرقند ہو یا شاہ زندہ، دوسرا مکہ بخارا ہو یا قرآن پاک کا عثمانی نسخہ، گل اندام حسیناؤں کا ذکر ہو یا کوہ قاف کے پری زاد، ازبکستانی پلاؤ ہو یا وہاں کے پھل و مشروب، غرضیکہ ہر وقت ہر پل ہر جگہ اور ہر منظر میں قاری خود کو مصنف کے ساتھ پاتا ہے۔

ازبکستان کی نرم اور نشیلی ہواؤں کے لمس کو قاری محسوس کرنے لگتا ہے، وہاں کی پری زاد اور گل اندام حسیناؤں کے طلسماتی حسن سے قاری سحر زدہ ہو جاتا ہے۔ مصنف نے جس حسن و خوبی سے وہاں کی روزمرہ کی عوامی زندگی پر روشنی ڈالی ہے، وہ انتہائی باریک بینی اور گہرے مشاہدات کا پتہ دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے الف لیلوی انداز میں کہانی در کہانی ماضی و حال ساتھ ساتھ کبھی ملاّ نصیر الدین کے توسط سے تو کبھی یادِ ماضی کے جھروکوں سے کوئی فلم پردۂ سیمیں پر دیکھ رہے ہیں اور اگر ایک پل کے لیے بھی نظر ہٹائیں تو نہ جانے کون سا اہم منظر دیکھنے سے محروم رہ جائیں۔ جن اہم نوشتوں سے مصنف نے روشناس کرایا ہے، وہ ان کے پر خلوص کردار کی سچائی کا حوالہ بنتا ہے۔ وہ اس جگہ نظریں بچا سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے دل کی دھڑکنوں میں قاری کو جھانکنے کا پورا پورا موقع فراہم کیا ہے۔ گالیا، دلآرام، عادیلیہ اور سینی ٹوریم کی نرسوں کے علاوہ کئی ایسی پرکشش حسینائیں ہیں جن کے حسن و اخلاق اور معصومیت کی مقناطیسی کشش نے مصنف سے بے نام روحانی رشتے قائم کیے ہیں۔ انہوں نے اس حقیقت سے فرار حاصل نہیں کیا جو ان کی دیانتداری کی دلیل ہے۔

یوں تو اس سفرنامے کا ہر کردار اپنی جگہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے لیکن کچھ ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں کے جو خاکے پیش کیے گئے ہیں وہ میری نظر میں اس کتاب کا اہم حصہ ہیں۔ نبی جان محمودف کے کردار نے بہت متاثر کیا۔ علم و فضل سے مالا مال ایک ذہین پرکشش اور قد آور شخصیت کسی گہری نفسیاتی کمزوری کی وجہ سے آہستہ آہستہ موت سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ زندگی کے ایسے بڑے المیے پر ہمدردی، محبت اور بے چارگی کے ملے جلے تاثرات سے قاری کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ قدرت کے اصول سے کون منحرف ہو سکتا ہے۔ شادی اور ماتم دنیا میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایک طرف موت ہے تو دوسری طرف زندگی، ایک طرف نبی جان کا کمہلاتا ہوا چہرہ، لاغر جسم اور شراب میں ڈوبی حسن کی پیاسی آنکھیں تصور کی حصار بندی کرتی ہیں تو دوسری طرف گالیا کے بوسوں سے لبریز رخسار زندگی کی حرارت پیدا کرتے ہیں۔

کتاب کے کچھ حصے اس قدر دلچسپ، دلکش اور استعجابی ہیں کہ بار بار پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اونٹ کی کھال پر لکھے ہوئے قرآن کے عثمانی نسخے کی زیارت پروفیسر قمر رئیس نے جس انداز سے کرائی ہے اس سے روح کو بڑی تازگی اور فرحت محسوس ہوتی ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ مصنف کی اب تک کی تمام کتابوں میں علمی، ادبی اور سیاسی موضوعات تو بہت دیکھنے کو ملے ہیں لیکن عہد رومان کی خوبصورت بازیافت، حسن و عشق کی دلفریب سازشیں اور شرارتیں کچھ

اس طرح سامنے آئی ہیں کہ ہر بات دل میں اتر جاتی ہے۔
دو سو چالیس صفحات کی یہ خوبصورت کتاب اپنے اندر بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے۔ سرورق بے حد جاذب نظر ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں شامل تصاویر ماضی کی حسین یادگاریں ہیں۔ البتہ کوہ قاف کے پری زاد اور مناظر کی تصویروں سے محرومی کھٹکتی ہے۔ یہ کتاب اپنے کلمہ جواز پر نہ صرف پوری اترتی ہے بلکہ ان توقعات سے کہیں اعلیٰ وارفع ہے جس کو ذہن میں رکھ کر قاری اسے پڑھتا ہے۔ اردو داں طبقے کے لیے اس قسم کی کتابیں انتہائی ضروری ہیں جو ان کی ثقافتی بصیرت کو وسیع تر کرسکیں۔ ○○

کتاب : **کوکن اور ممبئی کے اردو لوک گیت**

مصنفہ : ڈاکٹر میمونہ دلوی

مبصر : سید اقبال امروہوی

مہاراشٹر کے سلسلہ کوہ سہادری اور سمندر کے درمیان جو خطہ ہے اس کو کوکن کہتے ہیں۔ حالانکہ کوکن مہاراشٹر کا ایک حصہ ہے لیکن اپنی جغرافیائی اور طبعی ساخت کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اپنی تہذیبی خصوصیات کی وجہ سے بھی ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ خاص طور پر اردو کے تعلق سے اس کا ذکر کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مہاراشٹر میں یہی وہ علاقہ ہے جو ابتدا سے ہی اردو کا گہوارہ رہا ہے۔ حالانکہ یہاں کے لوگوں پر مہاراشٹر کی علاقائی مراٹھی تہذیب کی گہری چھاپ ہے لیکن وہاں کے اردو نواز طبقہ نے اس چھاپ کو باقی رکھتے ہوئے اردو کو بھی اپنے سینہ سے لگائے رکھا ہے اور آج بھی اردو کا پرچم سنبھالے میدان میں ہیں۔ وہاں آج بھی ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعہ شروع کی جاتی ہے، اردو ان کی زندگی میں رچی بسی رہتی ہے اور بڑے ہو کر بھی اردو کا ساتھ نہیں چھوٹتا۔
اسی اردو خیز خطے سے تعلق رکھتی ہیں محترمہ ڈاکٹر میمونہ دلوی، جنہوں نے ایک اردو نواز گھرانے میں آنکھ کھولی اور اردو کے ساتھ ادبی ماحول میں پرورش پائی اور اردو کو ہی ذریعہ معاش بنایا۔ سونے پے سہاگہ، وہ بیاہ کر بھی گئیں تو دبستان اردو میں (ڈاکٹر میمونہ دلوی مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی رفیقہ حیات ہیں) اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی فطرت میں ہی اردو سے خلوص و محبت ہے اور اردو کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی اور اس کا نتیجہ ان کی نئی کتاب **کوکن اور ممبئی کے اردو لوک گیت** ہے۔
یہ ایک بہت ہی مشکل موضوع ہے جس پر تحقیق کرنے کے لیے برسہا برس کی محنت اور لگن کی ضرورت ہے کیونکہ کسی علاقہ کے لوک گیت وہ بھی کسی ایک زبان میں جمع کرنا آسان کام نہیں، خاص طور پر ممبئی جیسے سنگلاخ علاقے کے جہاں ملک کے مختلف حصوں سے لوگ آ آکر بس

گئے ہیں اور سب اپنی اپنی روایات اور رسم و رواج کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ان سب کے آپس کے میل جول سے ایک نئی مشترکہ تہذیب ابھر آئی ہے جسے آپ بمبیا تہذیب کہہ سکتے ہیں اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مختلف کلچرل خصوصیات کی حامل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس علاقے کے لوک گیتوں میں بھی مختلف تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں موضوع سے متعلق سیر حاصل بحث ہے، مثلاً لوک گیتوں کی تاریخ، کوکن اور ممبئی کا منظر نامہ جغرافیائی اور طبعی ساخت کے ساتھ، بمبئی اور کوکن کے باشندگان کے بارے میں معلومات، کوکن کے مسلمان، ممبیا زبان، کوکن اور ممبئی میں تعلیمی، علمی، ادبی، سماجی اور فلاحی سرگرمیوں پر ایک نظر پھر اس علاقے کی مختلف رسومات اور ان موقعوں پر گائے جانے والے لوک گیت، ان کی تخلیق اور لسانی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ یہ حصہ سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں مختلف رسومات کے موقع پر گائے جانے والے گیتوں کی ایک طویل فہرست ہے۔

لوک گیتوں کا عوام کے ساتھ ایک اہم رشتہ ہوتا ہے کیونکہ لوک گیت اور لوک کہانیاں ہماری ثقافت اور تہذیب کی نشانیاں ہوتے ہیں اور یہ ہماری جڑوں سے مربوط ہوتے ہیں اور ان میں اپنے وقت کی رسومات اور عقائد کی ایک واضح تصویر نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں جو لوک گیت شامل ہیں ان کو پڑھ کر قاری کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس خطے میں جو رسومات تھیں وہ کس طرح منائی جاتی تھیں، عوام کے رجحانات کیا تھے اور وہ کون سی ہستیاں تھیں جن کو گیتوں میں گایا جاتا تھا اور اس علاقے کے گیتوں پر ہندوستان کے دوسرے حصوں کے کتنے اثرات ہیں۔

ادب میں دوسری اصناف کی طرح لوک گیتوں کی بھی اہمیت ہے اور اردو ادب کے خزانے میں ڈاکٹر میمونہ دلوی کی یہ کتاب ایک گراں مایہ جوہر کا اضافہ ہے جو برسہا برس کی محنت اور جستجو کے بعد مکمل ہوتی ہے۔ یہ ایک تحقیقی کارنامہ ہے جس کے لیے مصنفہ کو مبارکباد دینا چاہیے۔ ان کی اس کاوش کو اردو داں حضرات سے کافی پذیرائی مل رہی ہے جس کی وہ حقدار ہیں۔ ○○

کتاب : **پیاس کا صحرا**

مصنف : مبینہ امام

مبصر : ڈاکٹر کرامت علی کرامت

مبینہ امام کی افسانہ نگاری کا ذکر سنا تھا۔ ایک آدھ افسانہ کسی رسالے میں پڑھا بھی تھا۔ لیکن یہ انہوں نے اچھا کیا کہ تمام افسانوں کو یکجا کر کے قارئین کے سامنے پیش کر دیا تاکہ ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں ذہن قارئین میں ایک واضح تصور ابھر سکے۔ سب سے پہلے عرض کر دوں کہ میری نظر میں ہر تخلیقی فن کار اپنی جگہ اہم ہوتا ہے اور اس عظیم ادبی ثقافت کا ایک حصہ ہوتا ہے جس کی

آبیاری میں وہ اپنا خون جگر صرف کرتا ہے۔ یہ بات بذات خود اہم ہے کہ اس مجموعہ سے مبینہ امام نے اردو کے نسائی ادب (FEMINISTIC LITERATURE) میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان نہایت صاف ستھری اور مطہر ہے۔ نہ پلاٹ میں ژولیدگی ہے نہ انداز بیان میں۔ روزمرہ کے عام واقعات کو انہوں نے اپنے فن کی گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں سماجی مسائل ہیں تو کہیں خالص نفسیاتی مسائل۔ ان افسانوں میں "کہانی پن" ہے۔ تجریدیت کا نام و نشان تک نہیں، حالانکہ تجریدیت آج کل فیشن میں داخل ہو چکی ہے۔

افسانہ "بڑے شہر کی لمبی کہانی" میں اپنے عہد کی سچائی تو ہے ہی لیکن اس کی تہہ میں جو طنز کی زیریں لہر کار فرما ہے، اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ "پیاس کا صحرا" میں صرف ایک کردار ہے یعنی "میں" جو نسوانی نفسیات کو اجاگر کرتا ہے۔ افسانہ "تذبذب" کی فاطمہ متوسط طبقے کے خاندان میں قدم قدم پر ملے گی جو اپنی گنی چنی ساڑیوں کے باوجود خورشید کی پسند والی ساڑی کے انتخاب میں مصروف ہے۔ "تشنگی" بھی ایک اچھا نفسیاتی افسانہ ہے۔ افسانہ "بدکردار" میں مبینہ امام نے ایک مظلوم لڑکی کا کردار بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے آخری اس جملے میں افسانہ اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ "اور میں راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ باجی سچ مچ، ضمی کو بھول چکی ہیں؟ بھول جائیں گی؟" اس سے بہتر انداز میں افسانے کا اختتام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

مبینہ امام کے "منی افسانے" بہت اچھے لگے۔ انہیں میں اردو کے " نسانوں کے سرمایہ میں اضافہ کا درجہ دیتا ہوں۔ افسانہ "بولتی خاموشی" میں جب وہ کہتی ہیں۔ "مَیں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔" یا افسانہ "اصول" میں وہ کہتی ہیں۔ "شاید تم نہیں جانتے، اصول وہی بناتا ہے جو اسے توڑتا ہے۔" تو نہ جانے اس میں کتنے گنجینۂ معنی کا طلسم پوشیدہ رہتا ہے۔ **پیاس کا صحرا** کی پیشکش کے لیے مبینہ امام مبارک باد کی مستحق ہیں۔

OO

کتاب : **آواز کے سائے** (شاعری)

شاعر : عبید الرحمٰن

مبصر : مشرف عالم ذوقی

عبید الرحمٰن کی شاعری کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی عبید الرحمٰن ایسے گنے چنے لوگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے انتہائی مختصر مدت میں شاعری میں نہ صرف اپنا مقام محفوظ کر لیا ہے بلکہ اپنے منفرد لب و لہجہ کی بنیاد پر، اپنے آپ کو منوانے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔ عبید کی شاعری پر گھنے مطالعہ، کا سایہ ہے...... ان کے یہاں تصوف کے پہلو بھی ہیں، جدیدیت بھی اور ترقی پسند شاعری کے اثرات بھی۔ دراصل عبید اپنے زمانے میں سانس لیتے ہیں۔ وہ کسی ایک اصول یا

ضابطہ میں خود کو قید کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ کسی بھی ازم یا تحریک کے قائل نہیں ہیں۔ شاید، ممکن ہے، اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ پیشہ سے سائنسدان ہیں۔ جہاں کسی بھی چیز کو نظر انداز کرنے یا غلط ٹھہرانے کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے...... اس لیے عبید کے اندر بیٹھا فنکار کسی بھی چیز کو رد کرنے سے پہلے غور و فکر کے پل صراط سے گزرتا ہے۔ اپنا محاسبہ کرتا ہے اور پھر 'چن چن کر تو اُڑ چڑیا' کی طرح خیالات کے تنکے مجتمع کر کے انہیں شاعری کا لبادہ پہنا دیتا ہے۔

گہر شناس ہوں، گہرائیوں میں جیتا ہوں
میں اپنی ذات کی تنہائیوں میں جیتا ہوں

عبید کا قلم ابھی رواں ہے۔ ان کی شاعری ابھی نئے تخلیقی تجربوں سے گزر رہی ہے۔ ہاں، اگر مجھے اعتراض ہے تو صرف ان کے موقف پر۔

"شاعری کسی منصوبہ بندی کا نام ہے نہ ہی کسی ارادے کا۔ یہ محض اپنے گرد و پیش کے حالات سے غیر ارادی طور پر متاثر ہو جانے کی کیفیت اور واردات قلبی کو جامہ ُشعر بنانے کی کوششوں کا دوسرا نام ہے، جس سے کسی حد تک میں بھی گزرا ہوں۔"

شاعر کا آسماں، شاہین کے آسمان کی طرح ہے اور بے شک اس پر منصوبہ بندی (میں اقبال کے کلام کو اسی آئینہ میں دیکھتا ہوں) بھی ہے اور ارادے کا دخل بھی۔ لحہ لحہ اڑان بھرتی شاعری کو ایک محدود کینوس پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس میں اتنے SHADES ہیں، اتنے رنگ ہیں کہ محض گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہونا اور واردات قلبی کو جامہ ُشعر بنانے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا...... جس پرواز کی گونج عبید الرحمٰن کی شاعری میں جا بجا ملتی ہے۔ شاید انہی موقف کے اظہار کے لیے وہ الفاظ کے موتی (شب لفظ) نہیں بن سکے ہیں...... یقیناً بہت آگے بڑھنے کے عمل میں وہ اپنے جملوں پر ایک بار پھر غور کریں گے۔

یہ باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ **آواز کے سائے** کا شاعر اپنی آواز کا 'سایہ' رکھتا ہے اور اسے ابھی بہت دور تک کا سفر طے کرنا ہے۔ OO

کتاب	:	**ایک غیر مشروط معافی نامہ**
مصنف	:	خورشید اکرم
مبصر	:	علی امام نقوی

خورشید اکرم کا افسانوی مجموعہ جب مجھے مُوصول ہوا تو عادت کے مطابق سب سے پہلے بیک کور پہ نگاہ پڑی۔ دل و ذہن میں مسرت کے سوتے پھوٹے۔ مصنف نے اپنی تحریروں کی تفہیم کے مسئلہ پر کیا تحریر کیا ہے؟ اسے پڑھے بنا کتاب کھولی، پانچویں صفحہ کی مطبوعہ چار سطروں نے

سب سے پہلے مجھے کچھ نہیں، بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ خورشید اکرم نے اپنی کتاب رسول حمزہ توف کی ماں کے نام اس لیے منسوب کی ہے کہ اسے "اپنے بیٹے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

ایک غیر مشروط معافی نامہ کا مصنف اپنی کتاب کو ایک شاعر کی والدہ کے نام معنون کرتے ہوئے پہلے ہی قدم پر اپنے قاری سے احتیاط کا تقاضہ کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ ورق پلٹ کر اگلے یا اس سے اگلے صفحہ کی مطبوعہ تحریر پہ نگاہ ڈالنے کا ارادہ کرتا خود خورشید اکرم کی ایک تحریر یاد آگئی۔

"......ان کہانیوں پر ایمان داری سے کوئی رائے لکھتے ہوئے اپنی فہم پر شبہ ہونے لگتا ہے...... یہ کہانیاں اپنے مخصوص انداز میں اتنے وثوق و اعتماد سے لکھی ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی غیر مثبت رائے قائم کرنے سے پہلے جی چاہتا ہے ایک بار پھر سوچ لیا جائے۔" (آج کل ۹۲ء)

درج بالا سطور کے محرر کا دل و ذہن کس قدر بڑا ہے اس پہ اظہار خیال ہی الفاظ کی زیاں ٹھہرے گا، البتہ راقم الحروف پورے یقین کے ساتھ یہ ضرور کہہ سکتا ہے کہ اس تحریر کو یکی روشنائی میں چھپوانے والی ہستی کی تحویل میں شئے لطیف کی نعمت وافر مقدار میں موجود ہے جو خود اسے بھی کچھ تحریروں کے مسئلے پر اظہار رائے سے قبل شبہ کی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے، اور یہی نعمت جب اس کے اپنے آموختہ کو یکجا کرتی ہے تو اسے خود بھی محسوس ہوتا ہے۔

"ہر کہانی، ہر واقعہ میں نے کسی زندگی کے بیچ سے اٹھایا ہے، اور اس بیچ کو یاد کرتے ہوئے میرا باطن آنسوؤں میں نہایا ہے۔" "اب میں جان گیا ہوں کہ ادیب جو لکھتا ہے وہ اس دکھ کے عشر عشیر کا بھی اظہار نہیں کر پاتا جو وہ عمر بھر اٹھاتا ہے۔ لکھنا ایک لمحہ وفور کا عمل ہے لیکن زندگی کو سوچنا اور سوچ سوچ کر سارے دکھوں کو اپنے کاندھے پر اٹھائے رہنا ایک ایسا بار گراں ہے جسے صرف تخلیق کار اٹھاتا ہے۔"

ایک سو بارہ صفحات پر پھیلی انسانی زندگی کے دس ہلکے پھلکے گہرے اور کہیں ایسے گہرے رنگوں کے شیڈس ہم سے بھرپور توجہ کا تقاضہ کرتے ہیں۔ کتاب میں موجود تمام افسانوں کے مطالعے کے دوران اگر پڑھنے والا واقعتاً مرکزی خیال کے ساتھ افسانہ نگار کی پیش کردہ جزیات، ان کے استعمال کی تراکیب اور ان کی اہمیت سے بھی واقف ہے تو اظہار خیال سے پہلے اسے تھم کر سوچنا ہوگا۔ اس مجموعہ کے کئی افسانے حالانکہ پہلے ہی پڑھ چکا تھا مگر کتاب کے دو صفحے کئی روز تک مجھے انہیں پڑھنے سے روکتے رہے۔ چند روز بعد ایک ہی نشست میں تمام افسانے پڑھنے کے بعد بس دو تین سطروں کی رسید مصنف کو لکھ بھیجی۔ زود حس فنکار اس کا جو بھی مثبت منفی اثر ہو سکتا ہے، سے کس قدر مایوس یا مضطرب ہو سکتا ہے، اس کا مجھے تھوڑا سا اندازہ تھا۔ مجھے تو رہ رہ کر فکر تونسوی کا معروف کالم یاد آتا رہا۔ برسوں وہ پیاز کے چھلکے اتارتے رہے، قارئین مسکراتے، منہ بناتے رہے، ہنسے،

روئے، ٹھٹھے بھی لگائے ہوں گے۔ بھتوں نے انہیں برا بھلا بھی کہا ہوگا۔ لیکن انہوں نے آخری دم تک نہ بتایا کہ پیاز ہوتی کہاں ہے اور کیا ہوتی ہے؟ پریم چند، عزیز احمد، محمد علی ردولوی، سید رفیق حسین، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور غلام عباس کی تحریریں صفحوں سے نکل نکل کر آج بھی بول رہی ہیں۔ اگر ان کی گویائی پر ہی قناعت کی جاتی تو در تفہیم کب کے بند ہو جاتے۔ اگر واقعی یہ ستم ہوتا تو کیا ہوتا؟ قصے کے قارئین برجستہ جواب دیں گے خوشبو کبھی قید نہیں ہوتی۔

خورشید اکرم نے اپنی تحریروں سے متعلق خود بیان کیا ہے کہ ہر کہانی ہر واقعہ میں نے کسی نہ کسی زندگی کے "سچ" سے اٹھایا ہے اور اس سچ کو یاد کرتے ہوئے میرا 'باطن' آنسوؤں میں نہایا ہے۔ انسانی زندگی کے صرف دس روپ انہوں نے پیش کیے۔ انہیں کن کن زاویوں سے دیکھا، پڑھا اور سمجھا جاسکتا ہے؟ اس پر غور کرنے کی دعوت وہ اپنے پڑھنے والے کو دیتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں وہ کہیں نہیں بتاتے کہ سچ کی کتنی صورتیں ہیں؟ زندگی میں یہ کتنے رنگ بدلتا ہے؟ بدلتا بھی ہے یا بدلتا ہوا سا لگتا ہے؟ یہ سوال بار بار ان کی تحریروں کے مطالعے کے دوران ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ کہیں جواب مل جاتا ہے، یعنی معکوس شکل میں جانا پہچانا ایک لفظ سامنے آجاتا ہے پر فوراً ہی ذہن سوچتا ہے، اس کی کتنی صورتیں ہیں یا ہو سکتی ہیں؟ اس سے آگے ذہن سوچتا ہے تو چھٹا صفحہ سامنے آجاتا ہے۔ جس پر خورشید نے رسول حمزہ توف کی نظم کا آزاد ترجمہ چھاپا ہے۔ پڑھیے، شاید آپ بھی مجھ بیدل کی طرح سوچنے لگیں۔

جب یہ چھوٹا سا بچہ تھا
غوں غاں کرتا تھا
اس کی باتیں
کوئی نہیں سمجھتا تھا
صرف میں سمجھتی تھی

اب یہ شاعر ہو گیا ہے
جانے کیا کیا کہتا رہتا ہے
میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا
دنیا جس پر سر دھنتی ہے۔

OO

نام کتاب : **دفینے**

مصنف : طفیل اختر

مبصر : مرغوب علی

طفیل اختر فلمی صحافت میں ۲۰ / ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں، اس لیے خود کو فلمی صحافی مانتے، کہتے اور لکھتے ہیں، اپنے ایک تازہ خط میں انہوں نے مجھے لکھا۔

"اکرام تبسم اس بار کراچی اور میر پور سے میرے لیے روشنائی، شاعری، پہچان وغیرہ لائے تھے۔ ان کا یہ عمل سراہنے لائق ہے۔ مجھے فلم سے علم میں کھینچ لائے ہیں۔"

صحافت سچ اور گھاٹے کا سودا ہوتی ہے۔ وہ چاہے فلمی ہو یا علمی کہ آپ سچ نہ لکھیں تو ضمیر کے مجرم اور اگر سچ کہیں تو اس دنیا میں بسنے والے کچھ اشخاص کے مجرم۔ طفیل اختر نہ دنیا کے مجرم نہ ضمیر کے، مگر ہم دوستوں کے مجرم ان معنی میں ہیں کہ اپنی بہت اچھی تحریروں کو بھی فلمی بتانے سے باز نہیں آتے۔

ان کی تازہ کتاب (اشاعت مئی ۲۰۰۱ء) **دفینے** پاکستان کے ان مرحوم فنکاروں پر لکھے مضامین کا مجموعہ ہے جو پاکستانی فلم انڈسٹری یا ٹی وی کے فنکار تھے، جن میں، شباب کیرانوی، نور جہاں، قتیل شفائی، سلیم رضا، طاہرہ نقوی، علاء الدین، سلطان راہی اور ایسے ہی دوسرے فنکاروں کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب سے کچھ نثری ٹکڑے دیکھئے پھر آگے بات کریں گے!

یہ کتاب ایسے ہی چاند سورجوں کو تلاش کرنے، ان کے ناموں اور یادوں پر سے گرد دوراں جھاڑنے، ان کی مورت، صورت، اور نقوش نکالنے کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ (ص:۱۳)

انسان کے بس دو ہی مقام ہیں، زمین کے اوپر اور پھر زمین کے نیچے۔ (ص:۱۷)

ظریف کی موت کی خبر تیزی سے پھیلی تھی لیکن اس خبر کے پھیلاؤ کو ہم شہر کی آگ کا نام تو دے سکتے ہیں جنگل کی آگ نہیں کہہ سکتے۔ جنگل کی آگ کی طرح تو منور ظریف کے انتقال کی خبر پھیلی۔ (ص:۲۵)

آسمان پر ایک ستارہ چمکا، ٹوٹا اور ایک مختصر سی لکیر بناتا ہوا کہیں غائب ہو گیا۔

شاخ پر ایک پھول کھلا، ٹوٹا اور گر کر بکھر گیا، یہی زندگی ہے، یہی زندگی ہے جب تک دل دھڑکتا ہے طاہرہ میرے آس پاس رہے گی۔ (ص:۴۱)

فقیر سے زندگی میں ملنا سعادت اور بعد از مرگ ملنا عبادت ہوا کرتا ہے اور میں رحیم گل کے لیے ان سطور کے ذریعہ عابد بنا جاتا ہوں۔ (ص:۸۴)

لیکن خود اس کی ذات، اپنی زندگی اس طرح ازل سے پیاسی ندی کی مانند ہے جس میں بہہ کر آنے والا سکون کا سنہرا پانی چاروں طرف سے مختلف باندھوں کے ذریعے رکا ہوا ہے۔ (ص:۱۳۹)

اوپر دیئے گئے نثر کے ٹکڑے ان کے فلمی ادیب ہونے کا ثبوت نہیں بلکہ علمی ہونے کی شہادت ہیں۔

یہ کتاب **دفینے** جو ۱۴۸ ر صفحات پر مبنی ہے، ایک ایسی بستی ہے جہاں گزرنے والوں کی مسکراہٹ کا سونا، ان کی شخصیت کی مہک اور ان کے قہقہوں کی کھنک ہی نہیں بلکہ ان کے دکھ، محرومیاں، تنہائیاں اور رسوائیاں لفظوں کے اندرون میں بسے ہوئے ہیں۔ طفیل اختر نے شوبز میں رہتے ہوئے بھی اپنے اندر کے فنکار پر کسی طرح کا ملمع چڑھنے نہیں دیا۔ اس کتاب میں ان کا آخری مضمون قتیل شفائی پر ہے، جن کا انتقال ۱۱ر جولائی ۲۰۰۱ء کو لاہور میں ہوا۔ ظاہر ہے یہ مضمون ان کے انتقال کے کچھ دن بعد لکھا گیا ہوگا۔ لیکن اس مضمون میں بھی ان کی جذباتیت کہیں نہیں ہے بلکہ انہوں نے اس ذاتی صدمے کو بھی انتہائی ایمانداری اور بردباری سے کاغذ کے حوالے کیا ہے۔ عام طور پر جن لفظوں کو بہت سے لکھنے والے ہمیشہ ٹاٹ باہر رکھتے ہیں، طفیل اختر ان ہی لفظوں سے ایسے ایسے عجیب اور خوبصورت لمحوں کو ترتیب دیتے ہیں، جنہیں دیکھ کر، پڑھ کر ان کی دسترس اور ہنرمندی پر مجھے بہت پیار آتا ہے! ان کی یہ کتاب **دفینے** ان کی پچھلی کتابوں **چہرہ۔ چہرہ آئینہ** اور **نور جہاں کی زندگی** سے زیادہ کامیاب ہوگی، کیوں کہ اس میں انہوں نے گزرتے ہوئے وقت کو قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی نہیں سلیم رضا اور دوسرے گانے والوں کے وہ مشہور گیت جو آج بھی فضاؤں کو، ہواؤں کو مغموم کردیتے ہیں ان کے مکھڑے درج کردیے ہیں، اس سے جہاں یہ یادگار مکھڑے محفوظ ہوگئے وہیں ریکارڈ پر رہنے سے پڑھنے والوں اور ان پر کام کرنے والوں کو بہت آسانی ہو جائے گی۔ طفیل اختر کی تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں پڑھ کر کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی تحریر کا چلبلاپن، اس کی گہرائی، لفظوں کی نشست و برخاست اور بھرپوریت ان سے ہی مخصوص ہے۔ اس کتاب کے بارے میں اتنا کچھ کہہ دینے کے بعد بھی جی چاہتا ہے کہ اور کچھ کہا جائے مگر تبصرہ نگار کی مجبوریاں بھی تو کچھ ہوتی ہیں۔ پھر ہم اس جھوٹے دوست کو بہت داد بھی کیوں دیں؟ OO

نام کتاب : **مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں** (جلد اول)

مصنف : مجتبیٰ حسین

مبصر : عقیل دانش (امریکہ)

محترم حسن چشتی اردو کے معروف ادیب، ناقد، شاعر اور صحافی ہیں اور سماجی خدمت کے سلسلے میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ادبی اور سماجی خدمات کا دائرہ حیدر آباد فرخندہ بنیاد (دکن) سے لے کر دیار مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ حیدر آباد ہو سعودی عرب، لاس اینجلس ہو کہ شکاگو، کتنی ہی ادبی انجمنیں، ادارے اور فلاحی تنظیمیں چشتی صاحب کی کاوشوں کے نور سے روشن ہیں۔ ان کی ادبی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں انہیں "نمائندہ دکن۔" "آرکی ٹیکٹ آف اردو ایوارڈ"

اور "لائف ٹائم اچیومنٹ کے ایوارڈ" سے نوازا گیا ہے اور وہ صحیح معنی میں ان اعزازات کے مستحق ہیں۔ اپنے متعدد ادبی کاموں کی پذیرائی کے بعد حسن صاحب نے اردو کے مزاح نگار اور طنز نگار مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا انتخاب کر کے اردو قارئین کو ایک خوبصورت تحفہ عطا کیا ہے۔ مجتبیٰ حسین اردو طنز و مزاح کا ایک ایسا وقیع اور معتبر نام ہے کہ نقادان کے فن کا مستقل اعتراف کرتے ہیں۔ مجتبیٰ اپنے قاری کو گدگدا کر بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور نہیں کرتے بلکہ اپنے جملوں، الفاظ کے نت نئے در و بست اور معانی سے زیر لب تبسم پر اکساتے ہیں اور کہتے کہتے اور لکھتے لکھتے طنز اور درد کی ایسی انی استعمال کرتے ہیں کہ قاری کی آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں اور جگر کا یہ شعر سامنے آجاتا ہے۔

مسرت زندگی کا دوسرا نام
مسرت کی تمنا مستقل غم

عام انسان کے اطراف میں پھیلے ہوئے مسائل کو مجتبیٰ اپنے انشائیہ کا موضوع بناتے ہیں اور پڑھنے والا بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مجتبیٰ صاحب نے زندگی کے کسی زاویے کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے اور حسن چشتی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بڑی کاوش سے مجتبیٰ کے فن کا ہر زاویہ اس انتخاب میں شامل کر لیا ہے۔ 'بے مکانی' ہو یا 'داڑھ کا درد' 'اردو کے آخری قاری کی تلاش' ہو یا 'علامہ نارساکی وفات مسرت آیات' 'ٹرین ہو یا کتے۔ مشاعرے ہوں یا مجرے، مجتبیٰ کا قلم کسی دربند نہیں ہوتا اور حسن چشتی صاحب نے ان کے مضامین سفرناموں اور انشائیوں سے وہ سب کچھ کشید کر لیا ہے، قاری جس کا متمنی ہے۔ مجتبیٰ تقریباً نصف صدی سے اپنے فکر و فن کا جادو جگا رہے ہیں۔ اپنے بڑے بھائیوں محبوب حسین جگر مرحوم اور ابراہیم جلیس مرحوم کی طرح مجتبیٰ حسین بھی "فنافی الادب" ہیں۔ مجتبیٰ کا فن پتھر کو تراش کر اور اجال کر ہیرا بنانے کا فن ہے۔ اس کے لیے انہیں کتنی جگر کاوی کرنی پڑتی ہوگی یہ تو وہی جانتے ہیں، ان کا قاری تو خود ان کی تحریر کا ایک حصہ بن کر ان کے ساتھ مختلف جہانوں کی سیر کرتا ہے۔ سماجی محرومیاں مجتبیٰ حسین کے یہاں مضمون میں اس طرح گندھ جاتی ہیں کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوپاتا کہ وہ کسی جھنجھلاہٹ یا اکتاہٹ کا اظہار کر رہے ہیں۔ ایک مضمون میں جب ایک منتری جی مسافروں کی ایک قطار توڑ کر آگے بڑھنے لگے تو کچھ مسافروں نے جنھیں ان کے منتری ہونے کا علم نہیں تھا انہیں روکتے ہوئے کہا کہ "آپ قطار توڑ کر کیوں آگے بڑھ رہے ہیں......؟" منتری جی نے فرمایا "جب سارا دیش آگے بڑھ رہا ہے تو مجھے بھی آگے بڑھنے کا حق ہے اور زندگی تو آگے بڑھنے کا ہی نام ہے۔" مسافروں نے انہیں دھکیلتے ہوئے کہا "مہاشے جی زندگی میں ضرور آگے بڑھیے لیکن یہ تو ایک کیو ہے، یہاں آدمی ایک گھنٹے میں ایک انچ کا فاصلہ طے کرتا ہے۔"

عام زندگی میں عام آدمی کے لیے "قطار" کی قباحت کا یہ خوبصورت اور طنزیہ اظہار مجتبیٰ

کے فن کا ایک زاویہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف سماج کو بلکہ اپنی ذات کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے اور جگہ جگہ پر خود بھی قہقہے لگائے ہیں۔ مجتبیٰ صاحب کے یہاں بشاشت بھی ہے اور جدت بھی۔ لیکن ان کی جدت روایت کے سلسلے میں گندھی ہوئی ہے۔ "بے مہار" نہیں ہے۔ مجتبیٰ صاحب نے کبھی بھی اور کہیں بھی قاری پر اپنی علمیت، صلابت فکر اور تجربے کا رعب نہیں ڈالا ہے بلکہ خود قاری کی سطح پر آ کر دل کی باتیں کی ہیں۔ قاری کی سطح تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ حالی کے بقول: مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ۔ مجتبیٰ حسین نے یہ محنت کی ہے اور خوب کی ہے اور قارئین کی "محبت" حاصل کی ہے اور بلا مبالغہ اب روزانہ اخبار ہو، ہفت روزہ رسالہ ہو کہ مجلّہ قاری کی نظریں بے اختیار ایک ہی نام تلاش کرتی ہیں اور وہ نام ہے مجتبیٰ حسین کا۔ آج جب دنیا میں بے یقینی، مایوسی، عدم اعتماد، ناامیدی، بے کیفی اور بے حسی انسان کے ذہن پر کابوس کی طرح سوار ہو گئی ہے، ایسی "ناشاد" فضا میں مجتبیٰ حسین کا قلم تبسم کی روشنی بن کر پھوٹتا ہے۔ حسن چشتی صاحب ہم سب کے شکریے اور داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس روشنی کو مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریروں کی قندیل میں مجتمع کر کے اردو دنیا تک پہنچایا ہے۔ ان کی یہ کاوش یقیناً قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ قارئین نے ابھی سے جلد دوم کا انتظار شروع کر دیا ہے۔

۳۵۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتاب کی قیمت ۲۵۰ روپے ہے۔

OO

نام کتاب : **آدھی رات کی شبنم** (شعری مجموعہ)

شاعر : مرغوب علی

مبصر : راشد جمال فاروقی

شبنم جیسے خنک، نرم، شگفتہ، شفاف اور تازہ کار لب و لہجہ کے سائے سائے شعری سفر طے کرنے والے مرغوب علی نے کچھ برس قبل میراجی کے کلام کا ایک انتخاب مرتب کیا تھا۔ پھر وہ معتبر ادبی رسائل میں اپنی موجودگی درج کراتے رہے اور اب ان کا اولین شعری مجموعہ **آدھی رات کی شبنم** منظر عام پر آیا ہے۔ شاعر کی اختراع پسند طبیعت اس مجموعے کے قاری کو سرورق کھولتے ہی چونکاتی ہے۔ مقدمے کی جگہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ اقتباس کہ "کتاب تو خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہوتی ہے، لکھنے کے بعد تو اسے اپنے مصنف کا سہارا بھی درکار نہیں ہوتا۔" مقدمے کی عدم موجودگی کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اس کے بعد دعا:

مرے قلم کی نوک پر اپنا چاند اگا
میرے اک اک حرف کو سو تنویریں دے

اور پھر غزلیں، پابند اور آزاد نظمیں، قطعات، سانیٹ، اور گیت۔ معاصر غزل جس غنائیت سے عاری ہوتی جا رہی ہے اس کی بازیافت مرغوب علی کی غزل میں ملتی ہے۔ ان کی غزلیں ناصر کاظمی کے ڈکشن اور اسلوب کی مہک لیے ہوئے ہیں، بالکل وہی سادہ بیانی کے پردے میں کوئی گہری بات کہنے کا فن۔

پھر تخیل میں تیرے لب آئے
یاد پھر موسم طرب آئے
زرد موسم کے کرشمے دیکھنا
ننگی شاخوں کو ترستے دیکھنا
درد کی رت میں بکھر جائیں گے سب
ریت کی مانند رشتے دیکھنا
چاروں سمت سے صحرا امڈ آتا ہے
ڈالی پر اک پھول کھلا رت بدل گئی
دل صحرا میں آہو بن کر آتے ہیں
بیتے لمحے آنسو بن کر آتے ہیں
ہر ایک شاخ برہنہ یہ ہم سے کہتی ہے
کبھی رکا جو رکے گا زوال لمحوں کا
جوانیوں کے گھروندے اجاڑ دیتا ہے
کبھی بزرگوں کی بے جا مداخلت کرنا
لیے پھرتا ہے سارے غم کسی سے کچھ نہیں کہتا
بہت ہوتی ہیں آنکھیں نم کسی سے کچھ نہیں کہتا
سر پھری ہواؤں کے سبز سبز ہونٹوں پر
گیت سرسرائے ہیں بارشوں کے موسم میں
تکووں میں سینے کی دھڑکن ہونٹوں پر مدت کی پیاس
جب ہم "جان نگر" جائیں تو سب کچھ یونہی لگتا ہے

اس مجموعے میں کچھ نظمیں بے پناہ کامیاب ہیں۔ مثلاً سلسلہ۔ جست، سچ کا نوحہ، کون، لاوا اور ۳۱ را کتوبر ۱۹۹۰ء وغیرہ۔ عصری حسیت، معاشرتی مسائل اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے خوبصورت مرقعے ان نظموں کی شناخت ہیں۔ چند نظمیں عشقیہ بھی ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ مرغوب علی کو اس قبیل کی نظمیں کہنے سے گریز کرنا چاہیے۔ دو گیت بھی اس کتاب کی زینت ہیں اور یہ میرا دعویٰ ہے

کہ اس قدر رس بھرے مدھر مدھر گیت لکھنے والے لوگ اب اردو میں تو خال خال ہی ہیں۔ اس صنف میں مرغوب کے لیے بہت سے امکانات موجود ہیں۔

تخلیق کار پبلشرز نے اپنی دیرینہ روایت کے مطابق اس مجموعے کو انتہائی حسین گیٹ اپ دیا ہے۔ معیاری، بے ریا اور سچی شاعری پسند کرنے والوں کو اس مجموعے کی پذیرائی کرنی چاہیے۔

○○

نام کتاب : **ابابیلیں لوٹ آئیں گی**

مصنفہ : ترنم ریاض

مبصر : مرغوب علی

کہانی اور عورت کا رشتہ انسان اور زندگی جتنا ہی پرانا ہے، موجودہ دور کی خواتین افسانہ نگاروں سے پہلے بھی اردو ادب میں افسانہ نگار اور ناول نگار خواتین اپنی تخلیقی صلاحیتیں ثبت کرا چکی ہیں لیکن آج کی خواتین افسانہ نگاروں کا کینوس اگلی خواتین افسانہ نگاروں سے ان معنی میں بڑا ہے کہ یہ ان سے زیادہ، آزاد، اور خود میں زیادہ تجربہ کار ہیں۔ ان کے سامنے ٹی وی چینلز اور انٹرنیٹ جیسے معلوماتی آلے موجود ہیں۔ موجودہ عہد کا آدمی گھر میں بیٹھے، بیٹھے انگلی کے نیچے دبے بٹن سے کہیں بھی جا سکتا ہے اور کہیں کی معلومات بھی حاصل کر سکتا ہے کہ جب آدمی کے ہاتھ میں اتنا کچھ ہو تو پھر موضوعات کی تازگی اور دنیا جہان کے دکھ اس کی تحریروں میں آجانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ترنم ریاض کا زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ **ابابیلیں لوٹ آئیں گی** میرے اس خیال کو تقویت ہی نہیں پہنچاتا بلکہ کسوٹی پر کھرا بھی اترتا ہے۔ ترنم ریاض اس سے پہلے بھی ایک مجموعہ **یہ تنگ زمین** اردو ادب کو دے چکی ہیں، ان کی شاعری بھی مختلف رسائل میں نمایاں طور پر شائع ہوتی رہتی ہے۔ جب کسی لکھنے والے میں یہ دو صلاحیتیں یکجا ہو جائیں تو اس کے بارے میں قاری کا تجسس بھی دوگنا ہو جاتا ہے۔ ترنم ریاض کی کہانیاں پڑھتے ہوئے میں ہر سطر میں ان کی شاعرہ کو ڈھونڈھتا رہا۔ اسی طرح ان کی شاعری میں افسانہ نگار کبھی نہیں ملتی۔ یہ ایسا نازک مرحلہ ہے جس سے بہ طریقۂ احسن بہت کم لوگ گزر پاتے ہیں۔

زیر تبصرہ مجموعہ میں زندگی کے اوراق اس طرح بکھرے پڑے ہیں کہ ایک، ایک ورق جوڑ، اگر انہیں جمع کر بھی لیں تب بھی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ راجندر سنگھ بیدی کی طرح ان کہانیوں کے کردار بھی بہت چھوٹے، چھوٹے قد کے وہ لوگ ہیں جن کے بغیر زندگی کی گاڑی کا آگے بڑھنا محال ہوتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ہمیں جو عورت ملتی ہے وہ عام عورت سے ذرا ہٹ کے بہت باشعور خاتون ہے۔ اس میں جو رکھ رکھاؤ اور تہذیبی صلاحیتیں اور دنیاداری ہے، ریشماں جیسی

خاکروب تک میں نمایاں ہے۔ کچھ کہانیوں میں انہوں نے بچوں کی معصومیت کے ذریعے جس طرح ہمارے عہد پر سرچ کیا ہے، وہ خود میں ایسا فن ہے جس کے لیے لکھنے والے کو مشاہدہ کی تیزی کے ساتھ لکھنے کی مشاقی میں بھی طاق ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ افسانہ نگار لکھنے میں کیسی اور کتنی مشاق ہے، اس کا اندازہ ان کا مجموعہ پڑھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔

ان کہانیوں میں ایک بات اور قابل ذکر ہے، کہ یہ اس وقت قلم بند کی گئیں جب موضوع ذہن میں پوری طرح پک چکا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں کہیں بھی آورد کا شائبہ تک نہیں بلکہ بلا کی روانی ہے۔ ان کے حساس قلم نے زندگی کے جس کمزور یا دکھ بھرے لمحے کو چھوا ہے، اس کا سارا کرب ان افسانوں کے لفظوں میں نچوڑ دیا ہے۔ اس مجموعے کی کہانی "شہر" اور دوسری کئی کہانیاں بہت سوچ کے ساتھ قلم بند کی گئی ہیں، اس لیے ان کا اثر بھی دیر تک قائم رہے گا۔ ادھر خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں بہت اچھی، اچھی کہانیوں کا چلے آنا اردو ادب کے لیے بے حد نیک فال ہے۔

"ترنم ریاض کو زبان کے سلسلے میں اور زیادہ حساس رویہ اپنانے کی ضرورت ہے۔" ○○

نام کتاب : **فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس**

مصنف : وبھوتی نارائن رائے

مبصر : مرغوب علی

فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس، وبھوتی نارائن رائے کا تحقیقی مقالہ ہے، جسے ۱۹۸۸ء میں COMBATING COMMUNACONFLICTS کے عنوان سے انگریزی میں طبع کرایا گیا تھا، خبر دار جدید پبلی کیشنز دہلی نے اسے سلیس اردو میں انتہائی روشن طباعت، بہترین گیٹ اپ اور بہت اچھے کاغذ پر چھاپا ہے، مترجم کا نام کہیں درج نہیں ہے؟

وبھوتی نارائن رائے ایک لمبے عرصے سے "ورتمان ساہتیہ" جیسے ہندی کے معیاری رسالے کے مدیروں میں شامل ہیں۔ ان کا لکھا ایک ناول **شہر میں کرفیو** جو پہلی بار ہندی میں چھپا تھا، اپنی تحریر کی ایمانداری کی وجہ سے ادھر ادھر ترجمہ ہو چکا ہے اور کچھ دنوں سے اردو میں بھی دستیاب ہے۔

زیر تبصرہ تحقیقی مقالے میں بھی رائے کی تحریر کی وہی ایمانداری، وہی کاٹ اور معاملات کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈال کر بات کرنے کا انداز موجود ہے۔ شروع کے ابواب میں فسادات کے پس منظر کے طور پر ایودھیا میں بابری مسجد رام جنم بھومی کے تنازعے پر ایسی دستاویزی تاریخیں اور شواہد بیان کئے گئے ہیں جن سے اس معاملے کو سمجھنے اور اس پر سیاست کرنے کے عمل پر سے پردہ اٹھتا ہے۔ مختلف صفحات پر فسادات کا پوری طرح (تاریخ، دن، اور وقت سمیت) اندراج کیا گیا ہے۔

جدول کے ذریعے مرنے والے ہندو اور مسلمانوں کے اعداد اور مالی نقصان کے تحت اندازے رقم کیے گئے ہیں۔ گجرات کے حالیہ فسادات کے تناظر میں اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ صفحہ ۷۶ / سے ایک اقتباس:

> زیادہ تر فسادات کا سبب کسی مذہبی ہندو جلوس پر مسلمانوں کا حملہ لگتا ہے۔ اس سبب کو اگر ہم قبول بھی کر لیں تو پھر یہ سوچنا بھی صحیح ہوگا کہ ان حملوں میں شروع میں ہندوؤں کو زیادہ نقصان اٹھانا چاہئے، بعد میں مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ نقصان کے بارے میں ہندو ذہن کے پاس اپنے اسباب ہیں۔
> اس کے مطابق مسلمان شروعات تو کر دیتے ہیں لیکن بعد میں مسلح فورسز (پی اے سی، بی ایم پی۔ ایس آر پی وغیرہ) اور فوج کے آنے کے بعد پوزیشن بدل جاتی ہے۔ مسلمانوں کا نقصان خاص طور سے ان فورسز کے ذریعے ہندوؤں کو بچانے کی کارروائی کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رائے نے پولیس اور دوسری مسلح فورسز کے ذہنی رویوں اور ہندوتو کا تجزیہ بھی کیا ہے اور یہ تجزیہ (کے پی ایس گل کی گجرات میں موجودگی میں) ریاستی حکومت کی ناکامی پر کراری چوٹ محسوس ہوتا ہے، یہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کتاب جبکہ چار سال پہلے آئی تھی مگر اس مقالے میں جام جمشید کی سی صفات محسوس ہوتی ہیں کہ گزشتہ فسادات کی ساری بے رحمی، سفاکی اور ناقابل برداشت تکالیف اس میں دیکھی جا سکتی ہیں اور یہ سب چیزیں نفسیاتی سی معلوم ہوتی ہیں اور گجرات کے رواں فسادات پر رواں تبصرہ جیسی بھی!

آخری صفحات میں پولیس والوں کے لیے ایک سوال نامہ دو حصوں میں موجود ہے۔ آخری صفحات میں انہوں نے کچھ ایسی سفارشات بھی درج کی ہیں جن پر عمل کر کے (شاید) ہندوستان یعنی میرا بھارت مہان، فسادات کی لعنت سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا سکتا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت (یا جلال) کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے!

> ایس۔ وی۔ پی نیشنل اکیڈمی (حیدر آباد) نے اس بارے میں میری تحقیقاتی رپورٹ شائع کرنے سے انکار کر دیا، حالانکہ اسی اکیڈمی نے مجھے تحقیقاتی جائزہ کے لیے فیلو شپ دی تھی۔ میں ایل۔ بی۔ ایس نیشنل اکیڈمی آف ایڈمنسٹریشن مسوری کا شکر گزار ہوں کہ اس ادارے نے میری تحقیقاتی رپورٹ کو شائع کرنے میں پہلا قدم اٹھایا۔
> —(وبھوتی نارائن رائے دیباچہ صفحہ ۱۲)

ڈاکٹر رائے اور معصوم مراد آبادی (کتاب کے پبلشر) دونوں ہی اس کتاب کی اشاعت پر اردو حلقے کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

○○

قارئین کے خطوط

☆ ساجدہ زیدی .... علی گڑھ

قصے کا معیار ایک ادبی رسالے کے شایانِ شان ہے۔ **قصے** ۔ ۳ میں جون ایلیا پر مضمون، ممتاز مفتی کا گوشہ، نوم چومسکی پر مضمون اور امراؤ جان ادا پر مضمون توجہ طلب ہیں۔ اگرچہ مصنف سے شدید اختلافات ممکن ہیں۔ بہر حال اس ناول کا انہوں نے بالکل مختلف سیاق و سباق میں تجزیہ کیا ہے، جو ہمت کی دلیل ہے۔ افسانے لائق مطالعہ ہیں۔ اس رسالے پر آپ کی سنجیدہ توجہ لائق ستائش ہے۔ غزلوں کا معاملہ یہ ہے کہ ہر رسالے میں بے شمار غزلیں ہر ماہ نکلتی رہتی ہیں۔ اس بہتات میں اپنی پہچان بنانا مشکل مرحلہ ہے۔ کوئی بہت انوکھا شعر یا کبھی کبھی کوئی غزل اپنی طرف متوجہ کرتی ہے تو مسرت ہوتی ہے۔ زیر نظر شمارے میں چند اشعار نے متاثر کیا۔

پاؤں کے ساتھ یہ زنجیر کہاں جاتی ہے
دیکھنا رسم جہاں گیر کہاں جاتی ہے

—— خورشید اکبر

ایک کوشش تھی گریبان تلک جا پہنچیں
ہاتھ جو کاٹے گئے ہم نے پسارے کب تھے

—— خالد عبادی

اشکوں کی زباں میں کہہ رہا ہوں
دریا کی مثال بہہ رہا ہوں

—— نیاز سلطان پوری

دھند میں روشنی سی ہوتی ہے
جب مرے دل کا داغ جلتا ہے

اس سے میرا عجیب رشتہ ہے
میں جلوں تو ایاغ جلتا ہے

—— عطاالرحمٰن

ان اشعار میں شدت جذبہ اور لہجے کی بیساختگی نے متاثر کیا۔ شاعر کو ہمیشہ بھیڑ سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آپ لاکھوں کی طرف، میں ہوں بہتر کی طرف
میں شجاعت کی طرف آپ ہیں لشکر کی طرف

ان اشعار کے علاوہ علقمہ شبلی کی غزل بھی جاذب توجہ ہے۔ منظومات میں سید مبارک شاہ کی نظم (بدل گئے ہو) ماں کے لیے، میں خوبصورتی سے ادا کیے گئے پر خلوص جذبات اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ باقی دو نظمیں بھی اچھی ہیں۔ اب ہندوستان میں بحور واوزان کا اتنا خیال بھی کون کرتا ہے۔ ان کے علاوہ محمد اسماعیل اعظمی کی نظم قلم اور کمپیوٹر، ریحانہ فریدی کی پیمانہ، اور علیم اللہ حالی کی تنقید بھی بہتر نظموں کے زمرہ میں آتی ہیں۔ نثری نظموں کو تو میں شاعری کے زمرے میں نہیں رکھ سکتی۔ اگر اس قسم کی کسی نثری تحریر میں شدت وجدت اور تخیل کی کارفرمائی ہو (جو زیادہ تر میں نہیں ہوتی) تو وہ ایک اچھے انشائیے یا نثر پارے کے زمرے میں آسکتی ہے۔ اردو میں شاعری کے اتنے اسالیب موجود ہیں، اور آزاد نظم میں بحور واوزان کی پاسداری کے باوجود (بلکہ اسی کی بنا پر) اتنی آزادی اظہار ممکن ہے کہ نثر کی طرف جانے اور نثر کو شعر کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ستم یہ ہے کہ فی زمانہ کافی اچھی آزاد نظم کہنے اور لکھنے پر قدرت رکھنے والے شعراء بھی اکثر اس کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ غالباً شعری اظہار کی مجبوری نہیں بلکہ کچھ اور ہے...... شاید نثری نظم کو سکہ رائج الوقت بنانے کی کوشش...... اور یہ آخری تیسری نظم چاند (شہاب اختر) جیسی چیزوں کی شمولیت کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ اپنے معیاری رسالے کو فراڈ سے محفوظ رکھیے۔ جس شخص نے کبھی کچھ لکھا ہی نہیں اسے 'الفاظ روٹھ گئے ہیں' قسم کے جملے لکھنے کا قطعاً اختیار نہیں۔

آپ کے اداریے بہت معنی خیز ہوتے ہیں اور اکثر ایسے سوالات اٹھاتے ہیں جو وقت کی اشد ضرورت ہیں۔ مثلاً دہشت گردی، سے متعلق **قصے** کا اداریہ (نمبر یاد نہیں) بے حد بامعنی، پُر خلوص اور بیباک سچائی کا نمونہ ہے۔ خدا آپ کو ایسی ہی توفیق دیتا رہے۔

☆ **حامدی کاشمیری**...... سری نگر

آپ نے اپنے موقر اور خوبصورت جریدے کا پانچواں شمارہ عطا کیا ہے۔ اس کے لیے شکریہ قبول کیجیے، اس سے پہلے کے چار شمارے نہ پاکر محرومی کا احساس ہو گیا ہے۔ آپ نے ایسا متنوع اور وقیع ادبی رسالہ شائع کر کے ادبی صحافت کی ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ زیر مطالعہ شمارے میں آپ کا اداریہ فکر انگیز ہے۔ آپ نے بعض ادبی اور سیاسی مسائل کے بارے میں دوٹوک اور توجہ انگیز انداز میں اظہار خیال کیا ہے، اور اپنے رسالے کو ایک بلند دانشورانہ سمت عطا کی ہے۔

انور خان کے بارے میں خصوصی مطالعہ کے عنوان کے تحت جو مضامین شامل اشاعت ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ نظمیں اور غزلیں خوب ہیں، دیگر مشمولات بھی جاذب توجہ ہیں۔

☆ **مجتبیٰ حسین** .... دہلی

آپ کی عنایت سے **قصے** مجھے پابندی سے مل جاتا ہے اور میں اسے نہایت انہماک اور شوق و ذوق سے پڑھتا ہوں۔ خاص طور پر آپ کے اداریئے بے حد متاثر کن ہوتے ہیں۔ دو مہینوں تک حیدر آباد میں تھا۔ حیدر آباد کے قیام کے بعد دہلی واپس آیا تو ڈاک کا انبار لگا ہوا تھا۔ **قصے** کا تازہ شمارہ بھی تھا جسے سب سے پہلے پڑھا۔ آپ کا اداریہ انسانیت بنام انسان نہایت فکر انگیز ہے۔ بے بسی اور بے حسی کے اس ماحول میں لگتا ہے کہ سچ بات بھی لوگوں تک پہنچانا دشوار ہوتا جارہا ہے۔ انور خان کا گوشہ آپ نے بہت اچھا نکالا ہے۔ پچھلے شمارے میں گوشہ انور عظیم بھی نہایت وقیع تھا۔ مشرف عالم ذوقی کی تحریریں میں بہت اشتیاق سے پڑھتا ہوں۔ جس خوبصورتی سے وہ حقیقت کو افسانے میں ڈھال دیتے ہیں یہ انہی کا حصہ ہے۔ مرغوب علی کا سفر نامہ پاکستان بہت پسند آیا اس لیے کہ ان کا انداز عام سفر ناموں سے مختلف ہے۔ جس لگن، خلوص اور ادبی دیانتداری کے ساتھ آپ **قصے** کو نکال رہے ہیں اس کے لیے ایک بار پھر مبارکباد۔

☆ **شمیم حنفی** .... دہلی

قصے۔۵ موصول ہوا جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے اسے بہت دلچسپ شکل دی ہے کہ ادب کے ساتھ ساتھ اس کے دروازے دنیا کے دوسرے موضوعات کے لیے بھی کھلے رکھے ہیں۔ ہمارے گرد و پیش کا سماجی اور سیاسی ماحول اس بات کی اجازت ہمیں نہیں دیتا کہ اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلی جائیں۔ آصف فرخی نے ہزار صفحوں کا شمارہ (دنیازاد کا) فلسطین کے لیے وقف کیا ہے۔ اجمل کمال نے **آج** کی کچھ اشاعتیں (سرائیو و سرائیور، کراچی کی کہانی) اسی طرح مخصوص کردی تھیں۔ خدا کرے کہ آپ کا رسالہ اس روش پر قائم رہے۔ نظم اور غزل چھاپنے کے لیے بہت سے پرچے ہیں۔ اچھا فکشن اور اجتماعی مسئلوں پر منتخب تحریریں **قصے** کا امتیاز بن جائیں تو خوب۔

☆ **زبیر رضوی** .... دہلی

آپ بے حد انہماک سے **قصے** کو ترتیب دے رہے ہیں۔ ہمارے اردو والے نہ جانے کن کن باتوں کو اردو کی خدمت کے خانے میں ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اگر اردو کی کسی حیات بخش

سرگرمی کا ذکر یا اس کا اعتراف نہیں کرتے تو وہ ادبی رسالے ہیں۔ ذرا خیال کیجئے اگر شخصی سطح پر کچھ سر پھرے ہمارے ماضی اور حال میں یہ کارِ زیاں نہ کرتے تو ہمارے قدیم اور جدید ادب کا سارا اثاثہ گمنام اور بے توقیر رہ جاتا۔ وسائل سے بھرپور اردو ادارے تو اپنی پالیسی کے تحت تخلیقی ادب کے دشمن رہے ہیں۔ ان کا یہ رویہ اب بھی بقول فراق 'عالم پناہ' کی صورت میں دندنا رہا ہے۔

☆ آصف فرخی .... کراچی

آپ کے پرچے کے ایک آدھ شمارے ہی دیکھ سکا ہوں۔ ان سے یہ خواہش بڑھتی ہے کہ باقی شمارے بھی کسی طرح حاصل کیے جائیں۔ کسی طرح پرچوں کی فروخت کا یہاں بھی انتظام کروایئے۔ ڈاک کی گرانی اس قدر ہوش ربا ہو گئی ہے کہ میں خود یہاں سے اپنے دوستوں کو پرچے نہیں بھیج سکتا۔ قیمت سے زیادہ خرچ ڈاک پر آجاتا ہے۔ کیا کیا جائے؟ کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آتا۔

مابعد جدیدیت پر میرے لیے نیا مضمون لکھنا فی الوقت مشکل ہے، اور وہ اس لیے کہ میں نے بھی اپنے پرچے کے لیے اس موضوع پر ایک گوشہ ترتیب دیا ہے۔ یہ جلد ہی شائع ہو گا۔ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

☆ افتخار عارف .... اسلام آباد

آپ کا ارسال کردہ **قصے**۔۵ موصول ہوا۔ عنایت کہ آپ یاد رکھتے ہیں۔ کرم گستری کے لیے شکر گزار ہوں۔ انشاءاللہ خود بھی استفادہ کروں گا اور اکادمی ادبیات پاکستان کے کتب خانے کے توسط سے حلقے کے دیگر احباب بھی مستفید ہوں گے۔ اس تعاون کو جاری رکھئے۔

☆ فخر زماں .... لاہور

قصے۔۵ پڑھا، واقعی یہ جریدہ مثبت تخلیقی رویوں کا عکاس ہے۔ حصہ نظم اور نثر معیاری ہیں اور اردو ادب میں گراں قدر اضافہ۔ ایک مشورہ کہ دوسری زبانوں سے تراجم بھی شامل کیے جائیں، اس سے پرچے کا سپیکٹرم وسیع ہو گا۔ آج کل ضرورت اس امر کی ہے کہ مختلف زبانوں میں لکھا جانے والا ادب قارئین تک پہنچے تا کہ عالمی سطح پر ادب کی رفتار کی جانچ ہو سکے۔

☆ معین اعجاز .... دہلی

قصے کا پانچواں شمارہ دیکھا اور پڑھا۔ آپ کا اداریہ "انسانیت بنام انسان" متاثر کرتا ہے۔ اسے پڑھ کر بے ساختہ معین احسن جذبی کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

کیا جانئے کب وہ پاپ کٹے، کیا جانئے وہ دن کب آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی، سب کچھ یہ گوارا کرتے ہیں

مرحوم انور خان پر خصوصی گوشہ شائع کر کے آپ نے قارئین کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ ان کی افسانہ نگاری سے متعلق مختلف جہتوں کا مطالعہ کر سکیں۔ باقر مہدی، سلام بن رزاق، سید محمد اشرف، علی امام نقوی اور مقدر حمید کے مضامین انور خان کے فن اور شخصیت کو سمجھنے میں بڑے معاون ثابت ہوئے ہیں۔ مرحوم مظفر علی سید پر انور سدید کا تاثراتی مضمون بھی بہت خوب ہے۔ موجودہ عالمی سیاسیات کے منظر نامے میں افغانستان کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے (وجہ کچھ بھی ہو) لہٰذا آپ نے "افغانستان نامہ" کے عنوان سے اس سرزمین کے کچھ تخلیق کاروں کے تراجم شائع کر کے ایک بہت بڑی ضرورت پوری کی ہے۔ قدرتی طور پر لوگ وہاں کے ادبی رجحانات کے بارے میں بھی کچھ جاننے اور سمجھنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ سیاسی صورتحال کا اندازہ تو اخبار اور میڈیا کے ذریعہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ افسانوں اور غزلوں اور نظموں کا حصہ بھی لائق مطالعہ ہے۔ کس کس کا ذکر کیا جائے؟ ایک اچھی بات یہ ہے کہ آپ کا یہ سہ ماہی رسالہ ہندوستان اور پاکستان کے اہل قلم اور ادبی حلقوں کے درمیان ایک پل کا کام کرتا ہے۔ جو لوگ کسی وجہ سے پاکستانی رسالے پڑھنے سے محروم رہ جاتے ہیں (ناچیز بھی شامل ہے) انہیں پاکستانی شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ بلاشبہ ہندوستان سے شائع ہونے والے بعض دوسرے رسالے بھی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ **قصے** کا پانچواں شمارہ مواد اور موضوعات کے اعتبار سے بڑے تنوع کا حامل ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔

☆ بھگوان داس اعجاز .... دہلی

قصے شمارہ۔۴ ابھی زیر مطالعہ تھا کہ شمارہ۔۵ دستیاب ہوا، شکریہ

اکثر ہوتا یوں ہے کہ تازہ پرچہ ہاتھ میں آتے ہی ہاتھ والے کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اس میں بھی خصوصی مطالعہ کے زیر عنوان مرحوم انور خان کی شخصیت و فن پر روشنی ڈالی گئی۔ باقر مہدی، سلام بن رزاق، سیّد محمد اشرف، علی امام نقوی اور مقدر حمید کی تحریریں پڑھ کر لگا کہ انہوں نے حق ادا کیا ہے۔

زیر مطالعہ شمارہ کے بھی افسانے اچھے ہیں۔ جوگندر پال کا "نہیں رحمٰن بابو" اسی المیے کی داستان ہے جس کا زخم اب ناسور کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ نہ جانے وہ کیا لوگ تھے جنہوں نے بٹوارے کی بنیاد ڈالی۔ پاکستان سے آئے صبا اکرام کی موجودگی میں ارتضیٰ کریم کے گھر پر ہوئی باہمی گفتگو کو بنیاد بنا کر کہانی رچ لینا ایک طلسمات سے کم نہیں۔ مشرف عالم ذوقی کا یہ قادر انداز مجھے مجبور

کرتا ہے کہ میں دو قدم آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ چوم لوں۔ انتظار حسین کا افسانہ 'ہم نوالہ' اور جسبیر بھلر کی مترجم کہانی "پرندے" بھی اچھی لگی۔

غزلیات میں اویس احمد دوراں کی حمد نے عقیدت جگائی۔ جن لوگوں کے چند اشعار من کو لبھا گئے ان میں شامل ہیں جناب انور سدید، خالد علیم، ڈاکٹر حنیف ترین، ذکا الدین شایاں، ظفر اقبال ظفر، شکیل اعظمی، حسن عباسی، امتیاز دانش، نازاں جمشید پوری اور خاور خاں سرحدی۔ نظموں میں بھی حالات حاضرہ کی عکاسی کا رنگ نمایاں نظر آیا۔ محسن بھوپالی کی واجپائی سے مخاطب نظم "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" انہیں اپنا جنگ نہ کرنے کا وعدہ یاد دلا رہی ہے۔ پاکستان کے رہبران بھی کوئی ایسی غلطی نہ کریں جس کا خمیازہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑے۔ تقریباً سبھی نظموں میں عدم تشدد، حلیمی، نمرتا اور جنگ سے پرہیزگاری کی تلقین کی گئی ہے۔ جنگ سے سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسے ٹالنا ہی دونوں ملکوں کے مفاد میں ہوگا۔

☆ ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی .... علی گڑھ

انیس اردو...... سلامت باد

قصے۔۵ نظر نواز ہوا۔ دیرینہ روایت کا پابند اور حسب توقع ہے۔ تمام مندرجات خوب ہیں، مقصود ہیں، محمود ہیں۔ گجرات اور دیگر امور پر اداریے اور اظہار خیال فکر انگیز ہیں۔ اردو میوزیم، اردو گھر اور اردو ہال کی تجاویز بجائے خود بہت اچھی اور بہت ضروری ہیں لیکن اردوئے مرحومہ کے لیے مقبرے اور تاج محل بنانے سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے، اس کی ترویج و اشاعت اور اسے مقبول عام بنانے کے لیے ٹھوس تجاویز، انتھک جدوجہد، کیوں نہ اس طرف بھی کچھ توجہ دی جائے۔ محسن بھوپالی نے واجپئی جی کو خوب آئینہ دکھایا ہے۔ بہر حال ایک ہی جلد میں خصوصی مطالعہ، افسانوں، نظموں، غزلوں اور دیگر موضوعات کے سدا بہار پھولوں کا ادبی گلدستہ تیار کرنا آپ ہی کا کام ہے۔ **قصے** کی اشاعت کا ایک مقصد آپ نے داستانی ادب کی روایت کو زندہ کرنا بھی قرار دیا تھا، مگر میرے خیال میں گزشتہ پانچ شماروں میں ایسی کوئی تخلیق نظر نہیں آتی جو اس مقصد کی تکمیل کرتی ہو۔ اسی خیال کے پیش نظر داستانی انداز اور تمثیلی پیرائے میں ایک قصہ سپرد قلم کیا ہے۔ یہ المناک داستان ہزاروں سال کی تاریخ پر محیط ہے۔ لیکن اختصار اور اشاروں میں۔

☆ نگار عظیم .... نئی دہلی

قصے شمارہ چار اور پھر پانچ، مصروفیات کی باعث پڑھنے میں اتنی تاخیر نہیں ہوتی جتنی آپ کو خط لکھنے میں۔ شمارہ چار پڑھنے کے بعد سے ہی خط لکھنے کا ارادہ تھا حالانکہ فون پر آپ کو مبارکباد بھی دے چکی ہوں اور اظہار خیال بھی کر چکی ہوں۔ مجھے آپ کے اداریے پڑھ کر اندازہ

ہوتا ہے کہ وقت پر آپ کی گرفت مضبوط ہے۔ آپ کا انداز تحریر دلیرانہ اور سفاک ہے، اور شمارہ پانچ میں ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کے مراسلہ کو پڑھ کر یہ بھی یقین ہوا کہ ایماندار صحافی ہیں آپ۔

انور خاں اور انور عظیم پر دونوں شماروں میں جو خراج تحسین آپ نے پیش کیا ہے، قابل ستائش ہے۔ انور عظیم تو اردو افسانہ کا ایک اہم ستون تھے ہی، انور خان کا گزر جانا بھی ہماری نسل کے ایک درخشندہ ستارے کا غروب ہو جانا ہے جو یقیناً بھاری پڑے گا۔ اتنا ہی نہیں اردو ادب اور اردو والوں پر سوگواری کے بادل گھیرے ہوتے جا رہے ہیں۔ کیفی اعظمی بھی گئے اور عبداللطیف اعظمی بھی۔ خدا رحم کرے، آپ نے **قصے** کو جس طرح ادبی، سیاسی، سماجی اور نفسیاتی سائنسی علوم سے جوڑا ہے پرچہ مزید دلچسپ اور معلوماتی ہو گیا ہے۔ افسانوی حصہ میں انجم عثمانی کا اغوا، مختصر لیکن جامع اور اثر انگیز افسانہ ہے۔ علی امام نقوی کا تشخیص پسند آیا۔ غزال ضیغم کا مدھوبن میں رادھیکا، اور ذوقی صاحب کی انار کلی، بہت دلچسپ تھی۔ کان داؤ اور پرندے، کہانیاں تو اچھی ہیں ہی ترجمہ بھی بے مثال ہے۔ محسن بھوپالی کی نظم اور باجپئی صاحب کی نظم کے دو زاویے، نہ صرف وقت کی ضرورت ہیں بلکہ پکار ہیں۔ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ مدیرانہ سوجھ بوجھ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

"گہن" پر تبصرے کے لیے تبصرہ نگار نورالحسنین اور آپ کی بے انتہا شکر گزار ہوں۔

☆ سیدہ حسنین .... بنگلور

امید ہے کہ مع الخیر ہوں گے۔ تاخیر سے خط لکھنے کے لیے معافی کی خواستگار ہوں۔ پہلے تو آپ کا خط و چیک ملنے کی رسید ملی پھر تو **قصے** کا انتظار شروع ہو گیا، اللہ اللہ کر کے ملا تو بے حد خوشی ہوئی اور شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔

سب سے جاندار چیز آپ کا اداریہ ہے۔ امریکہ، دہشت گردی اور اسلام "مگر افسوس اس بات کا ہے کہ یہ آئینہ امریکہ دیکھ نہیں سکتا کیوں کہ اردو میں ہے، اسے تو ہر زبان میں شائع ہونا چاہئے۔ آپ نے بہت ہی صحیح لکھا ہے، امریکہ ہی سب سے بڑا دہشت گرد ہے۔ اگر دہشت گردی پر کوئی تمغہ کا حقدار ہے تو اول نمبر پر ہے امریکہ اور دوئم پر ہمارا بھارت مہان، جہاں آئے دن مسلمان اور دلت دہشت گردی کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ آج کا مسلمان اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ اپنا دفاع بھی تو کر نہیں سکتا، دہشت گرد کہاں سے بنے گا۔ ہر موڑ و ہر مقام پر ان کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے اور یہ قبول کر لیتے ہیں۔ آج مسلمانوں کے سب دشمن ہیں۔ اسرائیل فلسطینیوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہا ہے اس پر بھی بس نہ چلا تو ورلڈ ٹریڈ ٹاور کو اڑا دیا تاکہ مسلمان نشانہ بن جائیں۔ وہ اس اسکیم میں کامیاب رہا۔ افغانستان اب ویران ہے، اب نہ معلوم امریکہ کدھر کا رخ کرتا ہے۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان فرعونوں کو کب اور کیسے غرق کرے گا، کب طوفان نوح آئے گا جو امریکہ

اور اسرائیل کو بہالے جائے گا۔ افسوس تو یہ ہے کہ کئی مسلم ممالک میں امریکہ کے خلاف مظاہرے ہوئے مگر سعودی عرب اپنے عیش و عشرت میں اس قدر غرق ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے دکھ درد میں اپنی آنکھوں کو نم کرنے کی فرصت نہیں۔ خیر **قصے** میں یوں تو سبھی کچھ بہتر ہے مگر "شخصیت" کا کالم بہت ہی اچھا ہے۔ اس طرح ہم اپنے چہیتے لکھنے والوں کے متعلق تفصیل سے جان سکتے ہیں۔ یہ تفصیلی تعارف کا سلسلہ جاری رکھئے گا۔ ظلنی ٹمیجا کا تعلیم میں زعفرانی ایجنڈا بہت خوب ہے، میری طرف سے ظلنی ٹمیجا اور راحت جبیں کو دلی مبارکباد پیش خدمت ہے۔ اس طرح کا تلخیص و ترجمہ وغیرہ بھی آتا رہے تو بہت بہتر ہوگا۔ افسانے سبھی بہت اچھے ہیں۔ مرحوم انور عظیم کی آخری تحریر "پریوار کا تخریبی نقار خانہ" کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ بہت ہی خوب اور بے لاگ تبصرہ ہے۔ یوں سمجھئے کہ سارے مضامین اور افسانے پڑھ کر ذہن کو تازگی سی محسوس ہوئی۔

انور عظیم کے انتقال پر ملال کا حال جان کر افسوس ہوا۔ اس سے زیادہ افسوس صفحہ ۳۳ کے اس جملہ پر ہوا کہ "ایسے موقع پر جو پڑھا جاتا ہے جلدی جلدی پڑھ ڈالئے۔" آج ہم دنیا کی رنگینیوں میں اس قدر کھو گئے ہیں کہ نہ یہ یاد ہے کہ موت آنی ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ جانکنی کے وقت کیا پڑھنا ہے۔ مرنے والے کے پاس اس گھر میں قبر کے عذاب سے نجات کے لیے مغفرت کے لیے کیا پڑھنا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو حقیقت سے روشناس کرایا جائے، جس طرح رشید احمد صدیقی اپنے شاگردوں کو سخت تاکید کے ساتھ نماز جنازہ سکھایا کرتے تھے اور ہدایت دیا کرتے تھے کہ تم میں ہی سے کوئی میری نماز جنازہ پڑھائے گا۔ شاید باید آج نئی نسل کو نماز جنازہ کے متعلق معلوم ہو کہ کیوں ہے، کیا ہے اور کیسے پڑھنا ہے۔ ایسا معیاری پرچہ نکالنے پر مبارکباد قبول کریں۔

☆ اقبال نیازی.......... ممبئی

قصے کے پانچوں شمارے میرے پاس محفوظ ہیں۔ مکتبہ جامعہ سے مل جاتے ہیں۔ سبھی شمارے میرے مطالعے میں رہے۔ آپ جس سلیقے سے مواد اکٹھا کر کے ترتیب دیتے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ **قصے** کی اپنی ایک انفرادیت ہے اور اس کی شناخت اب بن رہی ہے۔ اس شمارے میں آپ نے انور خان مرحوم پر گوشہ دے کر دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ انور خان پر سارے مضامین صرف ممبئی کے رائٹرز اور انور خان کے دوستوں کے ہی ہیں؟ کیا انور خان پر لکھنے کے لیے صرف سلام بن رزاق، باقر مہدی، سید محمد اشرف، علی امام نقوی، اور مقدر حمید رہ گئے ہیں؟ کہاں ہیں بہار اور دہلی کے افسانہ نگار اور انور خان کے ساتھی؟

دہلی کئی دفعہ آنا ہوا لیکن آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ محترم حبیب تنویر پر ممبئی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہا ہوں۔ آپ اگر اجازت دیں تو ایک مضمون "حبیب تنویر کے تھیٹر" سے متعلق

ارسال کردوں، غیر مطبوعہ مضمون ہے اور میں چاہتا ہوں **قصے** میں شائع ہو۔

بھائی انیس صاحب! **قصے** کے ہر شمارہ میں ڈراما اور تھیٹر سے متعلق مضامین یا رپورٹ ہونی چاہیے۔ ادھر ممبئی میں اردو ڈراموں کی دھوم ہے، دہلی کے اہم ڈراموں کی تفصیلات صرف ذہن جدید سے ملتی ہیں۔ آپ **قصے** میں چند صفحات اس کے لیے ضرور مختص کریں۔

☆ شاهد اختر .... گیا

قصے کا تازہ شمارہ عنایت کرنے کا شکریہ! ہندوستان میں اگرچہ قصوں کی کمی نہیں ہے پھر بھی آپ کا **قصے** پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مواد اور معیار کے اعتبار سے اس نے بہت جلد اپنی پہچان قائم کرلی ہے، اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ سردست **قصے** کی مقبولیت میں کوئی کلام نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کی کتھنی اور کرنی میں کچھ زیادہ فرق نہیں جو عام رسائل کا مقدر ہے۔ دوسرے رسائل دعوے تو بہت کرتے ہیں لیکن عمل ندارد۔ آپ نے بالکل نئے فنکاروں کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے۔ آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ انور خان بلاشبہ ایک سچے فنکار تھے۔ آپ نے ان پر گوشہ نکال کر بے دام خرید لیا ہے۔ اداریہ میں جن باتوں کا ذکر آپ نے کیا ہے ان کی از حد ضرورت تھی۔

☆ صبا شاهجهاں پوری .... شاہجہان پور

مزاج عالی، عزیزی راشد راہی کے توسط سے آپ کے موقر جریدہ کا پانچواں شمارہ دستیاب ہوا۔ دلکش سرورق، کتابی سائز اور معیاری مشمولات سے مزین اس شمارے نے ذہن و نظر کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ آپ کا بے باک اداریہ آپ کے بے لاگ اور باصلاحیت صحافی ہونے کی دلیل ہے۔ آپ نے اداریہ میں **آج کل** نئی دہلی کے بند ہونے کے امکانات کا ذکر کیا ہے، تو اپنی غزل کی اشاعت کے سلسلے میں جب محبوب الرحمٰن فاروقی صاحب سے بات کی تھی، شاید جنوری یا فروری کے ماہ میں، تو انہوں نے بتایا تھا کہ حکومت پورے پبلیکیشنز ڈویژن کو ہی بند کرنے پر غور کر رہی ہے۔ لیکن اپریل ماہ کے شمارے میں غزل کی اشاعت کے بعد جب ان سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے بتایا تھا کہ فی الحال خطرات کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ میرے قیاس میں آپ کی اطلاعات بھی اسی عرصے کی ہوں گی یا کوئی تازہ کوششیں پھر شروع ہو گئی ہیں۔

آپ نے **قصے** کو معیاری اور دلکش بنانے کے لیے جس عرق ریزی سے نثری اور شعری مشمولات کا انتخاب کیا ہے، وہ آپ کے ایک اعلیٰ مدیر ہونے کا مظہر ہے۔ مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ یہ جریدہ ایک دن ہندوستان کا مقبول ترین جریدہ ثابت ہوگا۔ (انشاءاللہ)

☆ اظہر عنایتی ....رامپور

قصے کا شمارہ ۔۵ ملا تھا، اداریہ پڑھ کر پھڑک گیا تھا اور ذہن میں تھا کہ تفصیل سے آپ کو خط لکھوں گا اور اس کرم فرمائی کے لیے شکریہ بھی ادا کروں گا۔ لیکن یہ شمارہ میری کتابوں کے ڈھیر میں کہیں گم ہو گیا۔ آج اس کی بازیافت ہوئی ہے تو آپ سے ندامت کے ساتھ ہم کلام ہوں۔

اداریہ واقعی جس جرات، جس بیباکی اور جس حق گوئی کا آئینہ دار ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ **ھنس** کے اداریہ سے راجندر یادو صاحب کے جو اقتباس آپ نے شامل اشاعت کئے ہیں اس کا بھی جواب نہیں۔ راجندر یادو کی راست بیانی کے لیے اگر یہ کہا جائے کہ ۔

"ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں"

تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ اردو اور ہندی صحافت میں جب تک انیس امروہوی اور راجندر یادو جیسے لوگ باقی رہیں گے تو اس کی عزت اور وقار میں اضافے کا سلسلہ دیر تک اور دور تک قائم رہے گا۔

جریدے میں نثر اور نظم کے حصوں کو جس میعار تک آپ کی ادارت نے پہنچا دیا ہے وہ بھی لائق ستائش اور قابل رشک ہے۔

☆ رضوان الرضا رضوان ....علی گڑھ

قصے کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ بہت معیاری لگا، آپ نے بڑی محنت کے ساتھ اسے ترتیب دیا ہے۔ جو بھی تخلیق کار اس میں شامل ہیں وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انور خان پر خوصی مطالعہ ان کے لیے بہترین خراج عقیدت ہے۔ محترم جناب سید محمد اشرف کی تحریر پڑھ کر عجیب تاثر قائم ہوا۔ ان کے ایک ایک جملے نے یقینی طور پر قارئین کو جذباتی بنا دیا ہوگا۔ ان کی کہانیوں میں جذبات نگاری قابل مطالعہ ہوتی ہے، اور یہ مضمون انور خاں سے پہلی ملاقات بھی ایک حقیقی کہانی لگتی ہے جس میں افسانے کے تمام محاسن موجود ہیں۔ دیگر تحریریں بھی متاثر کن ہیں۔ محترم سلام بن رزاق نے بھرپور تجزیہ پیش کیا۔ دیگر افسانے نئے افسانوی ادب کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ ان تمام قلمکاروں کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش ہے۔

☆ ایس۔ ایم۔ مثنیٰ رضوی ....گیا

قصے ۔۵ کئی اعتبار سے پسند آیا۔ آپ کا اداریہ بڑا خیال انگیز اور زوردار ہے۔ راجندر یادو کے اداریوں کے اقتباسات نے اسے اور جاندار اور تیکھا بنا دیا ہے۔ انور خان پر ایک گوشہ مختص کر کے آپ نے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ باقر مہدی اور سلام بن رزاق کے تنقیدی مضامین

ان کے فن کی انفرادی شناخت میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ سید محمد اشرف، مقدر حمید اور علی امام نقوی کے تاثراتی مضامین بڑے موثر انداز میں لکھے گئے ہیں اور شخصیت کی متحرک تصویر پیش کرتے ہیں۔ شاید یہاں یہ ذکر نامناسب نہ ہو کہ میں نے آج سے تقریباً تیس برس پہلے کلام حیدری مرحوم کے نام ایک خط میں انور خان کے افسانوں کا خاص طور پر ذکر کیا تھا اور ان کے درخشاں مستقبل کے بارے میں اپنے یقین کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ جب ان کا پہلا مجموعہ **راستے اور کھڑکیاں** شائع ہوا تو انہوں نے میرا اپنا پتہ معلوم کر کے مجھے بھیجا (ان دنوں میں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی تھی اور بھوپال اسٹیشن پر پروگرام ایکزی کیٹو تھا) ان کے اس اخلاص اور وضع سے میں بے حد متاثر ہوا۔ افسوس کہ میری ان سے کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کی کم عمری کی موت سے بڑا صدمہ ہوا۔ ان کا فن ترقی کی منزل کی جانب گامزن رہا اور کسی فنکار کے لیے یہ بڑی فخر کی بات ہے۔ آپ نے ان کی یاد کی شمع روشن کی، اس کے لیے میں آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ جوگندر پال، انتظار حسین، نند کشور وکرم کے افسانے پسند آئے۔ آپ کا ترجمہ ایسا ہے جیسے کوئی طبع زاد کہانی ہو۔ یہ معمولی بات نہیں۔ مشرف عالم ذوقی کا تاثراتی خاکہ (میں اسے افسانہ کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہوں) خاصہ کی چیز ہے۔ چند روز ہوئے صبا اکرام نے اپنی کتاب جو فکشن سے متعلق ہے کراچی سے میرے نام بھیجی تھی۔ ابھی اس کا تاثر باقی ہی تھا کہ ان کی شخصیت پر اتنا عمدہ اور موثر مضمون (خاکہ) پڑھنے کو ملا۔ جی خوش ہو گیا، انہیں سلام (دعا) کہہ دیجئے گا۔ مرغوب علی کی سفر کہانی بڑی دلچسپ اور اثر انگیز لگی۔ ٦٠ کے بعد کی تنقید سے میری دلچسپی بہت کم ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مقالہ اپنی طرف متوجہ کر لے لیکن ناصر بغدادی کا مضمون ترکیف پر اچھا لگا۔ غزلیں اور نظمیں رسالہ کے معیار کے مطابق ہیں۔

☆ فرحت سپنا .... میر پور خاص (پاکستان)

١٥ ر جون کو والدہ کے انتقال کے بعد اس گہرے صدمے سے باہر نکالنے میں استاد محترم جناب تاج قائم خانی صاحب نے میری بہت مدد کی، میں ان کی ممنون ہوں۔ اسی درمیان لاہور سے اکرام تبسم صاحب نے **قصے** ۵ کی پانچ کاپیاں یہاں کے ادبی دوستوں کے لیے بھیجیں۔ **قصے** ۵ کے مطالعہ سے دل کا بوجھ کافی حد تک کم ہوا۔ اس کا سابقہ معیار برقرار ہے۔ اتنا بولڈ لکھنے کا حوصلہ اور اس سے کہیں زیادہ چھاپنے کا حوصلہ پاکستان میں تو مجھے نظر نہیں آتا۔ حسب روایت آپ کا اداریہ چونکانے والا اور اس میں راجندر یادو کے اقتباس دل کو لہو کر دینے والے ہیں۔ یقین کریں، اب تو **قصے** کا انتظار رہنے لگا ہے۔

☆ **ظفر گورکھپوری**.......... ممبئی

قصے کا شمارہ ۵ نظر نواز ہوا۔ شکریہ! اس سے قبل بھی ایک شمارہ موصول ہوا تھا جس کی رسید اپنی رائے کے ساتھ بھجوادی تھی۔ زیر نظر شمارہ حسب سابق بہت وقیع ہے۔ مختلف موضوعات پر آپ کے ادارے کافی فکر انگیز ہیں خاص طور پر موجودہ سیاسی تناظر میں آپ کی حق بیانی اور بیباکی قابل تعریف ہے۔

☆ **کرشن چندر چودھری کمل**.......... گیا

قصے مارچ ۲۰۰۲ء کا شمارہ دیکھا۔ بہت ہی اچھا لگا۔ اردو زبان وادب میں اس وقت کئی پرچے شائع ہورہے ہیں مگر **قصے** سب سے الگ لگا۔ آپ کا اداریہ پسند آیا۔ گجرات میں ایک بار پھر انسان کے ہاتھوں انسانیت کا قتل ہو رہا ہے اور پوری دنیا خاموش بیٹھی ہے۔ وہاں کی خبریں جب میں پڑھتا ہوں یا دیکھتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ ○○

کتب موصولہ

○ **جدید افسانہ چند صورتیں**

☆مصنف: صبا اکرام ☆صفحات: ۱۲۸ ☆ایک سو پچاس روپے ☆۲۰۰۱ء ☆ناشر: زین پبلی کیشنز، فلیٹ۔A-8، ندیم کارنر، بلاک۔N، نارتھ ناظم آباد، کراچی۔۷۴۷۰۰ (پاکستان)

○ **حاضر حال جاری** (افسانے)

☆مصنف: سریندر پرکاش ☆صفحات: ۳۲۰ ☆دو سو پچاس روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، 104/B۔یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

○ **واپسی سے پہلے** (افسانے)

☆مصنف: صغیر رحمانی ☆صفحات: ۲۱۶ ☆ایک سو پچاس روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، 104/B۔یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

○ **دُرِ مقصود** (سالنامہ شمارہ۔۸۶)

☆مرتب: خورشید مصطفیٰ رضوی ☆صفحات: ۸۰ ☆صرف اعزازی ☆مارچ ۲۰۰۲ء ☆ناشر: شعبہ معلومات، انجمن سادات رضویہ، امروہہ۔۲۴۴۲۲۱ (یو۔پی)

○ **کارواں گزر گیا** (افسانے)

☆مصنف: ایم ایچ خان ☆صفحات: ۲۰۰ ☆ایک سو پچاس روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر: تخلیق کار پبلشرز، 104/B۔یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

○ **شاید** (شاعری)

☆شاعر: جون ایلیا ☆صفحات: ۲۱۲ ☆ایک سو پچاس روپے ☆اشاعت سوم ۱۹۹۲ء ☆ناشر: ایلیا اکادمیا، ۱۲۹۔الف، مانک جی اسٹریٹ، گارڈن ایسٹ، کراچی (پاکستان)

○ **مبادیات صحافت** (تحقیق)

☆مصنف: ڈاکٹر جاوید حیات ☆صفحات: ۹۶ ☆ساٹھ روپے ☆۱۹۹۷ء ☆ناشر: مکتبہ آزاد، پنولین، گلزار باغ، پٹنہ (بہار)

○ **سمندر خلاف رہتا ہے** (شاعری)

☆شاعر: خورشید اکبر ☆صفحات: ۱۱۲ ☆اسی روپے ☆۱۹۹۳ء ☆ناشر: عصری سنگ میل پبلی کیشنز، ۳۔افضل منزل کیمپس، مہندرو، پٹنہ

○ **اردو نظموں میں قومیت اور وطنیت ۱۸۵۷ء کے بعد**

☆مصنف: ڈاکٹر نریندر ناتھ ویرمنی ☆صفحات: ۲۵۶ ☆دو سو روپے ☆۲۰۰۱ء ☆ناشر: مالو پبلی کیشنز، جونا رسالہ، اندور۔۶ (ایم پی)

○ **ترکش** (سہ ماہی)

☆مدیر : فراغ روہوی ☆صفحات : ۱۶۰ ☆تیس روپے ☆اپریل ۲۰۰۲ء ☆رابطہ : ۶۷۔ مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کولکاتا۔ ۷۳

○ **وہ اور پرندہ** (افسانے)

☆مصنف : احمد رشید علیگ ☆صفحات : ۱۵۲ ☆ایک سو پچیس روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر : احمد رشید علیگ، گلی رہنٹ والا کنواں، سرائے رحمٰن، علی گڑھ (یوپی)

○ **سانچ کو آنچ نہیں**

(بچوں کی کہانیاں)

☆مصنف : سلطان آزاد ☆صفحات : ۳۲ ☆بیس روپے ☆۲۰۰۱ ☆ناشر : سلطان آزاد، مکتبہ آزاد، پنو کین، گلزاری باغ، پٹنہ۔ (بہار)

○ **ذہن جدید** (سہ ماہی)

☆ترتیب : زبیر رضوی ☆صفحات : ۲۲۸ ☆پینتیس روپے ☆فروری ۲۰۰۲ء ☆رابطہ : کاسمو اپارٹمنٹ، لین نمبر۔ ۱۲، ذاکر نگر، دہلی۔ ۲۵

○ **نیا ورق۔ ۱۲** (سہ ماہی)

☆مدیر : ساجد رشید ☆صفحات : ۲۴۰ ☆پینتیس روپے ☆مارچ ۲۰۰۲ء ☆رابطہ : 36/38، عمر کھاڑی کراس لین، ممبئی

○ **ادراک۔ ۴**

☆مدیر : سید حسن عباس ☆صفحات : ۲۰۸ ☆چالیس روپے ☆جنوری ۲۰۰۲ء ☆رابطہ : مرکز تحقیقات اردو فارسی، گوپال پور، باقر گنج، سیوان۔ ۸۴۱۲۸۶ (بہار)

○ **اردو بک ریویو** (ماہنامہ)

☆مدیر : محمد عارف اقبال ☆صفحات : ۸۸ ☆بیس روپے ☆اپریل ۲۰۰۲ء ☆رابطہ : ۲۷۲۵۔۱۷/۱۶۔ میٹرو پول مارکیٹ، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲

○ **پہچان** (سہ ماہی)

☆مرتبین : کرن سنگھ، ذوالفقار دانش، نوید سروش ☆صفحات : ۱۶۰ ☆پچاس روپے ☆مارچ ۲۰۰۲ء ☆رابطہ : ادارہ پہچان، بنگلہ ۱۰۔ سی، بلاک۔ ۲، سیٹلائٹ ٹاؤن، میر پور خاص، سندھ (پاکستان)

○ **شاعری** (شعری انتخاب)

☆مرتبین : سہیل غازی پوری، بقا صدیقی ☆صفحات : ۱۲۲ ☆سالانہ دو سو روپے ☆اپریل ۲۰۰۲ء ☆رابطہ : ۲۔۹۷۲۔ آر، بلاک۔ ۹ دستگیر سوسائٹی، فیڈرل بی ایریا، کراچی (پاکستان)

○ **شیش** (ہندی سہ ماہی)

☆مدیر : حسن جمال ☆صفحات : ۱۴۴ ☆بیس روپے ☆جون ۲۰۰۲ء شمارہ۔ ۲۴ ☆رابطہ : لوہار پورہ، جودھپور۔ ۳۴۲۰۰۲ (راجستھان)

○ **نفسیات اور زندگی** (ماہنامہ)

☆مدیر : اسلام حسین ☆صفحات : ۱۲۸ ☆تیس روپے ☆ماہ اشاعت ندارد ☆رابطہ : بی۔ ۱۶، رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد، کراچی (پاکستان)

○ **جہان اردو** (سہ ماہی)

☆مدیر : ڈاکٹر مشتاق احمد ☆صفحات : ۹۶ ☆دس روپے ☆جون ۲۰۰۲ء ☆رابطہ : محلہ رحم گنج، پوسٹ لال باغ، دربھنگہ۔ ۸۴۶۰۰۴

○ **حنظل** (افسانے)

☆مصنف: بیگ احساس ☆صفحات: ۱۲۸ ☆ساٹھ روپے ☆۱۹۹۳ء ☆ناشر: مکتبہ شعر و حکمت، 6-3-659/2 کپاڈیہ لین، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد۔۵۰۰۴۸۲

○ **اوس کی جھیل** (ناول)

☆مصنف: انل ٹھکر ☆صفحات: ۲۲۴ ☆دو سو روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی۔۲

○ **پر ہوا کے** (شاعری)

☆شاعر: انور سلیم ☆صفحات: ۱۶۰ ☆ایک سو پچھتر روپے ☆۲۰۰۰ء ☆ناشر: انور سلیم، مکان نمبرc/۸/A/۲۶/۷۵/۳۔۱۷۱، سنتوش نگر، حیدر آباد۔۵۰۰۰۵۹

○ **تلاش اقبال** (تحقیق)

مصنف: قدیر زماں ☆صفحات: ۱۴۴ ☆ایک سو پچاس روپے ☆۲۰۰۰ء ☆ناشر: فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر، ۴۹۔۱۰۔۱۶، ملک پیٹھ، حیدر آباد۔۵۰۰۰۳۶

○ **لمس کی خوشبو** (شاعری)

☆شاعر: اطیب اعجاز ☆صفحات: ۱۲۲ ☆ایک سو روپے ☆۲۰۰۱ء ☆ناشر: اطیب اعجاز۔ ۲۴۱۔۱۰۔۹، رسالہ بازار، قلعہ گولکنڈہ، حیدر آباد

○ **ارض بے پیغمبر** (شاعری)

☆شاعر: مظہر مہدی ☆صفحات: ۱۰۴ ☆ساٹھ روپے ☆۱۹۹۴ء ☆ناشر: مکتبہ شعر و حکمت، 6-3-659/2، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد۔

○ **بودلیئر کی نظمیں**

(شعری انتخاب)

☆ترجمہ و تعارف: مظہر مہدی ☆صفحات: ۱۶۰ ☆ایک سو روپے ☆۱۹۹۸ء ☆ناشر: مکتبہ شعر و حکمت 6-3-659/2، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد۔

○ **لوح ادب انٹر نیشنل** (سہ ماہی)

☆مدیر: شکیل احمد خاں ☆صفحات: ۱۲۸ ☆تیس روپے ☆جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء ☆رابطہ: ادارہ بزم صادق، ۲۱/اے، لطیف آباد نمبر ۱۱، حیدر آباد (پاکستان)

○ **وقت** (سہ ماہی)

☆مدیرہ شاہینہ امام ☆صفحات: ۱۴۴ ☆چالیس روپے ☆اپریل تا جون ۲۰۰۲ء رابطہ: امیر فاطمہ اشاعتی مرکز، فاطمہ ہاؤس، واسع پور، دھنباد۔۸۲۶۰۰۱ (جھارکھنڈ)

○ **قنطار**

(اقبال کے فارسی کلام کا منظوم ترجمہ)

☆مترجم: رؤف خیر ☆صفحات: ۱۱۲ ☆ایک سو روپے ☆۲۰۰۱ء ☆ناشر: خیری پبلی کیشنز، ۱۹/ ۲۰۲/۱۰۔۹، رسالہ بازار، گولکنڈہ، حیدر آباد ۵۰۰۰۰۸

○ **وفیات مشاہیر اردو** (تحقیق)

☆مصنف: بشارت علی خاں فروغ ☆صفحات: ۶۷۲ ☆چار سو روپے ☆۲۰۰۰ء ☆ناشر: بشارت علی خاں ایڈوکیٹ، محلہ شاہ آباد گیٹ، رام پور۔ (یوپی)

○ **متاعِ آئندہ** (شاعری)

☆شاعر : عبدالصمد تپش ☆صفحات : ۱۴۴
☆ایک سو روپے ☆۲۰۰۰ء ☆ناشر : عبدالصمد تپش، لکھمینا، بیگوسرائے۔ (بہار)

○ **دس رنگی تماشے**

(بچوں کے ڈرامے)

☆مصنف : اقبال نیازی ☆صفحات : ۱۶۸
☆ایک سو روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر : گل بوٹے پبلی کیشنز، رحمٰن کمپاؤنڈ، روم نمبر۔۱، اسٹیشن روڈ، باندرہ (ویسٹ) ممبئی۔۱۱

○ **روشنی تو ہونے دو** (شاعری)

☆شاعر : ڈاکٹر سخاوت شمیم ☆صفحات : ۱۲۸
☆ایک سو روپے ☆۱۹۹۹ء ☆ناشر : ڈاکٹر سخاوت شمیم، ڈی بی اسپتال، چورو (راجستھان)

○ **سونے کا محل** (بچوں کی کہانیاں)

☆مصنف : انور کمال حسینی ☆صفحات : ۹۶
☆پینتیس روپے ☆۲۰۰۱ء ☆ناشر : مالک پبلی کیشنز، ۳۲۱۲۔ترکمان گیٹ، دہلی۔۶

○ **کتاب نما**

(خصوصی شمارہ: حامدی کاشمیری)

☆مرتبہ: کوثر مظہری ☆صفحات: ۱۸۸ ☆ایک سو پچھتر روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵

○ **شب خون** (ماہنامہ)

☆ترتیب و تہذیب : شمس الرحمٰن فاروقی
☆صفحات : ۸۰ ☆بیس روپے ☆جون ۲۰۰۲ء ☆رابطہ: ۳۱۳، رانی منڈی، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳ (یوپی)

○ **مسکراہٹ** (فلمی ماہنامہ)

☆مدیر: طفیل اختر ☆صفحات : ۵۶ ☆مئی ۲۰۰۲ء ☆رابطہ : ایف ۱۲۲، بلاک این، ماڈل ٹاؤن، لاہور (پاکستان)

○ **دفینے** (مجموعہ مضامین)

☆مصنف: طفیل اختر ☆صفحات: ۱۴۸ ☆ایک سو پچیس روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر: نیشنل بک ہاؤس، اردو بازار، لاہور (پاکستان)

○ **روشنائی** (سہ ماہی)

☆مدیران : احمد زین الدین، نکہت بریلوی، ☆صفحات: ۳۵۲ ☆ساٹھ روپے ☆شمارہ نمبر ۹، جون ۲۰۰۲ء ☆رابطہ: زین پبلی کیشنز، A-8، ندیم کارنر، بلاک۔N، نارتھ ناظم آباد، بالمقابل ڈی سی سنٹرل آفس، کراچی۔۷۴۷۰۰

○ **میں آئینہ ہوں** (افسانے)

☆مصنف : سلطان جمیل نسیم ☆صفحات : ۲۰۸ ☆دس امریکی ڈالر ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر : بختیار اکیڈمی، A/49-3، گلشن اقبال، کراچی۔

○ **بادل** (ناول)

☆مصنف : شفق ☆صفحات : ۱۳۶ ☆اسی روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر: شفق، کبیر گنج، سہسرام۔۸۲۱۱۱۰ (بہار)

○ **شش جہت آگ** (نظمیں)

☆شاعر : حمید سہروردی ☆صفحات : ۱۲۸
☆ایک سو پچاس روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر:

حمید سہروردی، ریڈر شعبہ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ۔ ۵۸۵۱۰۶ (کرناٹک)

○ **انقلاب مردہ باد**

(فل لینتھ اردو ڈراما)

☆مصنف: اشتیاق وسیع ☆صفحات: ۹۶ ☆ایک سو روپے ☆جون ۲۰۰۱ء ☆ناشر: سب رنگ پبلی کیشنز، 177/1A۔ عائشہ منزل، پاپ روڈ، کرلا، ممبئی۔ ۴۰۰۰۷۰

○ **اک الف بیش** (شاعری)

☆شاعر: امیر حسن ☆صفحات: ۳۰۴ ☆دو سو روپے ☆اپریل ۲۰۰۲ء ☆ناشر: ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، سانے بلڈنگ، سیکنڈ فلور، نانا بھائی لین، فلورا فاؤنٹین، ممبئی۔ ۴۰۰۰۰۱

○ **قلم، قلم کار اور کتاب**

(تحقیق)

☆مصنف: عبدالغنی شیخ ☆صفحات: ۱۳۴ ☆ایک سو دس روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

○ **جستجو** (شاعری)

☆شاعر: جگن ناتھ آزاد ☆صفحات: ۲۳۶ ☆دو سو روپے ☆۱۹۹۹ء ☆ناشر: محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲۔ راؤز اوینیو، نئی دہلی۔ ۲

○ **بدن کشتی بھنور خواہش**

☆شاعر: خورشید اکبر ☆صفحات: ۱۶۰ ☆دو سو روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ تقسیم کار: مکتبہ آزاد، پیر لین، گلزار باغ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۷

○ **مسند خاک** (نظمیں)

☆شاعر: اکرام خاور ☆صفحات: ۱۲۸ ☆اسی روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ تقسیم کار: ترالی دنیا پبلی کیشنز، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲

○ **آسماں پر آسماں** (شاعری)

☆شاعر: شکیل گوالیاری ☆صفحات: ۱۲۸ ☆سو روپے ☆۲۰۰۲ء ☆ناشر: شکیل گوالیاری، لوہا گڑھ شکر، گوالیار۔ ۴۷۴۰۰۱

○○

ہماری اہم مطبوعات

پھول جیسے لوگ (ناول)	انور خان	80.00
یاد بسیرے (افسانے)	انور خان	80.00
لمحوں کی قید (افسانے)	کشور سلطانہ	80.00
افسانہ ۸۹ء (انتخاب)	انیس امروہوی	80.00
موجِ سحر (شاعری)	ڈاکٹر انجنا سندھیر	60.00
قند و زقند (طنز و مزاح)	فیاض احمد فیضی	80.00
برزخ (افسانے)	ہاجرہ شکور	80.00
فرات (ناول)	حسین الحق	100.00
نیلام گھر (ناول)	مشرف عالم ذوقی	90.00
گھٹتے بڑھتے سائے (افسانے)	علی امام نقوی	60.00
کیا مذاق ہے؟ (مزاحیہ شاعری)	اسمٰعیل آذر	60.00
بھوکا ایتھوپیا (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	110.00
کانچ کی چادر (شاعری)	مریم غزالہ	60.00
رنگین پرواز (شاعری، اردو و ہندی)	پی۔ این۔ رنگین	80.00
اردو تنقید حالی سے کلیم تک (تنقید)	سید نواب کریم	125.00
دل کی بات (افسانے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی	60.00
کاغذ کی دیوار (افسانے)	محافظ حیدر	60.00
ادھار کی زندگی (افسانے)	مہر چند کوشک	60.00
اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ (تنقید)	ڈاکٹر محبوب اعلیٰ قریشی	125.00
رت جگے (شاعری)	رحمت امروہوی	60.00
پیاسا سمندر (افسانے)	عقیلہ تبسم	60.00
ڈار سے بچھڑے (افسانے)	سید محمد اشرف	100.00
غالبیات اور ہم (تنقید)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	50.00
آخری داستان گو (ناول)	مظہر الزماں خاں	80.00
رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ (تنقید)	خواجہ محمد اکرم الدین	80.00
دختر ابلیس (افسانے)	محمد شبیر علی محمودی	60.00
حکیم کلب شاہد: شخصیت اور فن (شخصیات)	خورشید مصطفیٰ رضوی	60.00

ہم مسافر جہاں پہنچے (سفرنامہ)	پروفیسر علیم اللہ حالی	50.00
ساغر نظامی: حیات اور ادبی خدمات (شخصیات)	ڈاکٹر سلمٰی شاہین	100.00
مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار (تنقید)	ڈاکٹر توحید خان	80.00
لیکن جزیرہ نہیں (افسانے)	تبسم فاطمہ	60.00
اپٹا اور اردو ڈراما (تنقید)	شاہد رزمی	60.00
روتا ہوا آدمی (افسانے)	رئیس نجمی امروہوی	80.00
فلسطین کے چار ممتاز شعراء (تنقید)	عبدالحق حقانی القاسمی	60.00
کنیادان (ڈراما)	وجے تنڈولکر (ترجمہ: ڈاکٹر صادق)	80.00
شہر چپ ہے (ناول)	مشرف عالم ذوقی	90.00
بیان (ناول)	مشرف عالم ذوقی	100.00
منڈیر پر بیٹھا پرندہ (افسانے)	احمد صغیر	60.00
سخنورانِ شاہجہان پور (شخصیات)	مبارک شمیم	125.00
راہ میں اجل ہے (افسانے)	زاہدہ حنا	100.00
مطالعہ مثنویات مصحفی (تنقید)	ڈاکٹر سعیدہ وارثی	100.00
بے زبانی کا ہنر (شاعری)	ڈاکٹر سجاد سید	60.00
حجاب امتیاز علی: حیات اور ادبی کارنامے (شخصیات)	مجیب احمد خاں	80.00
اسرارِ غالب (غالبیات)	سید قدرت نقوی	60.00
اردو فکشن کی تنقید (تنقید)	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	250.00
تذکرۂ خطیر (تحقیق)	تاباں نقوی	60.00
بالمشافہ (انٹرویوز)	معصوم مرادآبادی	60.00
حریم شوق (شاعری)	نازش سہسرامی	60.00
سنگ اٹھانے کا حوصلہ (افسانے)	رضاء الجبار	80.00
مظہر امام کی تنقید نگاری (تنقید)	محمد رضا کاظمی	60.00
شاخیں (مضامین)	پروفیسر علیم اللہ حالی	60.00
پوسٹر (افسانے)	قاسم خورشید	60.00
جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب (افسانے)	جوگندر پال	90.00
ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک (سفرنامہ)	ڈاکٹر قمر رئیس	100.00
کن فیکون (افسانے)	رضوان احمد	90.00
ادب میں گھوسٹ ازم (طنز و مزاح)	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	80.00

سلسلے (شاعری)	مدہوش بلگرامی	60.00
اجنبی ساعتوں کے درمیان (شاعری)	نعمان شوق	60.00
ایک جام اور (شاعری)	فرحت قادری	60.00
سوادِ جاں (شاعری)	مبارک شمیم	60.00
رابطہ (مضامین)	جوگندر پال	90.00
جمیل مظہری: بحیثیت نثر نگار (تنقید)	ڈاکٹر نعمت اللہ	80.00
جدید ہندی شاعری (تنقید)	خورشید اکرم	80.00
ایک غیر مشروط معافی نامہ (افسانے)	خورشید اکرم	60.00
منڈی (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	100.00
تکمیل (شاعری)	من موہن تلخ	80.00
سوئی کی نوک پر رکا لمحہ (افسانے)	حسین الحق	80.00
نہروں کا جال (شاعری)	خالد عبادی	60.00
قمر رئیس: ایک زندگی (شخصیات)	ڈاکٹر سلمٰی شاہین	250.00
بے اصطلاح (مضامین)	جوگندر پال	90.00
ٹھہرے ہوئے لوگ (افسانے)	انجم عثمانی	80.00
اردو افسانے کا پس منظر (تنقید)	فیاض رفعت	60.00
دستک (شاعری)	اختر شاہجہان پوری	80.00
بے ارادہ (افسانے)	رفیع حیدر انجم	80.00
ادب کی تفہیم (مضامین)	ڈاکٹر شمس الحق عثمانی	80.00
آئینے کی گرد (افسانے)	شکیل جاوید	80.00
ہندوستان میں جنگ جمہوریت (سوانح)	جگت رام ساہنی	90.00
سب رس: جدید اردو میں (تنقید)	قاضی انیس الحق	150.00
وینس کا پھول (افسانے)	سہیل اعجاز صدیقی	90.00
موسم عذابوں کا (افسانے)	علی امام نقوی	80.00
غلام بخش اور دیگر کہانیاں (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	120.00
وہ دن (افسانے)	غیاث الرحمٰن	80.00
مراثیٔ شاد کا فکری پہلو (تنقید)	پروفیسر اظہار احمد	100.00
شام اودھ (ڈرامے)	ڈاکٹر شبیر صدیقی	100.00
اردو کے نثری اسالیب (تنقید)	شہاب ظفر اعظمی	150.00

کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ (تحقیق)	ڈاکٹر ابرار رحمانی	150.00
جھلتے جنگل (ناول)	انور عظیم	100.00
اردو افسانے پر مغربی ادب کے اثرات (تحقیق)	ڈاکٹر شہناز شاہین	120.00
میری کہانی (سوانح)	اویس احمد دوراں	120.00
دس دن (ناول)	دُرواسا	90.00
پرندے (افسانے)	جوگندرپال	90.00
ہوئے ہم دوست جس کے (شخصی خاکے)	مجتبیٰ حسین	80.00
مثنوی مناقب خواجہ (شاعری)	محمد علی موج رامپوری	40.00
معاصر اسلامی تحریکات اور فکر اقبال (اقبالیات)	ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	150.00
آخر کب تک (ناول)	اقبال نظامی	120.00
ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید (تحقیق)	احمد سہیل	200.00
ذبح (ناول)	مشرف عالم ذوقی	90.00
زندہ اپنی باتوں میں: بیدی، عصمت اور عباس (انٹرویوز)	فیاض رفعت	90.00
مضامین نو (مضامین)	نرگس سلطانہ	100.00
اردو میں قصیدہ نگاری (تحقیق)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	150.00
لابوہیم (افسانے)	انور عظیم	120.00
بساط (ناول)	علی امام نقوی	100.00
مٹی کے حرم (ناول)	ساجدہ زیدی	250.00
کلیات کیف (شاعری)	کیف گنگوہی	150.00
مکالمہ (آجکل کے اداریے)	محبوب الرحمٰن فاروقی	200.00
اردو شاعری کے روشن چراغ	طارق متین بانچتی	100.00
آدھی رات کی شبنم (شاعری)	مرغوب علی	90.00
صوبہ سرحد میں جنگ آزادی (سوانح)	جگت رام ساہنی	100.00
اصطلاحات نفسیات: تشریح و تفہیم	سیّد اقبال امروہوی	250.00
کارواں گزر گیا (افسانے)	ایم۔ایچ۔خان	150.00
حاضر حال جاری (افسانے)	سریندر پرکاش	200.00
واپسی سے پہلے (افسانے)	صغیر رحمانی	150.00
نادید (ناول)	جوگندرپال	150.00

غم دل وحشت دل (ناول)	ڈاکٹر محمد حسن	200.00
بھگت سنگھ کی واپسی (ڈراما)	ساگر سرحدی	200.00
مسلمان (ناول)	مشرف عالم ذوقی	150.00
جوش ملیح آبادی: ایک مطالعہ (تحقیق)	ڈاکٹر قمر رئیس	150.00
روشنائی (سوانح)	سجاد ظہیر	225.00
بادِ صبا کا انتظار (افسانے)	سیّد محمد اشرف	150.00
صدی کو الوداع کہتے ہوئے (افسانے)	مشرف عالم ذوقی	200.00
میرے نالوں کی گمشدہ آواز (ناول)	محمد علیم	400.00

ہماری آئندہ اشاعتیں

ممتاز مفتی: ایک مطالعہ (تحقیق)	مرتب: انیس امروہوی	200.00
گلدستۂ بیت بازی (شاعری کا انتخاب)	ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی	150.00
یوں بھی کھلے پھول (ناول)	اقبال دیپ	90.00
وہ بھی ایک زمانہ تھا (فلمی شخصیات)	انیس امروہوی	150.00
انتخاب ن۔م۔راشد (شاعری)	مرتب: مرغوب علی	150.00
صدی کا افسانہ (افسانوں کا انتخاب)	مرتب: انیس امروہوی	150.00
سلسلہ (مضامین)	ہرچرن چاولہ	150.00
شہر نگاراں (ناول)	رفعت سروش	150.00
بلونت سنگھ: فن اور شخصیت (تحقیق)	ممتاز آراء	150.00
فساد (ناول)	مہر الدین خاں	100.00
درد کا پورٹریٹ (ڈرامے)	مظہر الزماں خاں	100.00
شش و پنج (طنز و مزاح)	مسرور آروی	100.00
نجات دہندہ کی تلاش (افسانے)	وجے	100.00
یہ خلد بریں ارمانوں کی (مضامین)	مرتب: شکیل اختر	150.00

اپنی لائبریری اسکیم

قارئین کی سہولت اور اردو سے ان کا تعلق بنائے رکھنے کے لیے ادارہ تخلیق کار نے ایک لائبریری اسکیم کا پروگرام بنایا ہے۔ اس اسکیم کے تحت **اپنی لائبریری** کے ہر ممبر کو گھر بیٹھے اردو کی کوئی بھی کتاب بہ آسانی مل سکتی ہے۔ آپ ہندوستان میں شائع ہوئی کسی بھی کتاب کے لیے ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر بھیج دیجئے۔ کتاب گھر بیٹھے چھپی ہوئی قیمت کی وی۔ پی سے آپ کو مل جائے گی۔ وی پی خرچ اور دوسرے ڈاک خرچ ہمارے ذمہ ہوں گے۔ آپ کو صرف کتاب کی مطبوعہ قیمت ہی ادا کرنی ہوگی۔ اور آپ اپنی پسند کی کتاب کی تلاش میں بھٹکنے سے بچ جائیں گے۔

اپنی لائبریری کا ممبر بننے کے لیے آپ کو ایک بار صرف سو روپے (-/100) ڈپازٹ کے طور پر پوسٹل آرڈر یا بینک ڈرافٹ کی صورت میں **تخلیق کار پبلشرز** کے نام بھیجنا ہوگا۔ کسی بھی وقت ممبر شپ ختم ہونے کی صورت میں ڈپازٹ کی رقم (-/100) سو روپے واپس کئے جاسکتے ہیں۔

تخلیق کار پبلشرز کی تمام کتابوں پر لائبریری کے ممبروں کو دس فیصد رعایت بھی الگ سے دی جائے گی۔ گزشتہ دنوں سے بڑھی ہوئی ڈاک شرح کی وجہ سے اس سے زیادہ رعایت دینا ممکن نہ ہو سکے گا کیونکہ وی۔ پی خرچ اور دیگر ڈاک خرچ نیز پیکنگ خرچ بھی ہمارے ذمہ ہوں گے۔

دوسرے اداروں کی کتابوں پر کوئی رعایت دینا ممکن نہ ہوگا۔ آپ کو یہ سہولت حاصل ہوگی کہ آپ کتنی ہی کتابیں گھر بیٹھے منگوا سکتے ہیں جن کا ڈاک خرچ ہمارے ذمہ ہوگا۔

یہ ساری سہولتیں حاصل کرنے اور اردو کی ترسیل و فروغ میں تعاون کرنے کے لیے آج ہی سو روپے (-/Rs. 100) کا پوسٹل آرڈر یا بینک ڈرافٹ روانہ کر کے **اپنی لائبریری** کے ممبر بن جائیے اور گھر بیٹھے اپنی پسند کی معیاری کتابیں حاصل کیجیے۔

ادارہ **تخلیق کار پبلشرز** کے زیر اہتمام شائع ہونے والی تمام کتب کی اطلاع **قصے** کے ذریعے تمام ممبران کو پہلے ہی کر دی جائے گی۔ لائبریری کے تمام ممبران کو ماہنامہ قصے کی خریداری پر بھی خصوصی رعایت دی جائے گی۔

رابطہ: **تخلیق کار پبلشرز** 104/B۔ یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

QISSEY (Urdu)
R. N. I. 47285/87
104/B, YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR. DELHI-110092

— کیا دنیا کے سارے مسلمان دہشت گرد ہیں؟

— موقع ملتے ہی ہندوستان سے امریکہ تک ایک سُر میں اسلامی دہشت پسندی کا نعرہ لگانے لگتے ہیں۔

— مسلمان ...... ایک قوم جو، اب دہشت پسندی کا استعارہ بن چکی ہے۔

— اسلام ...... ایک مذہب، جس کے ماننے والے دہشت گرد قرار دیئے جاچکے ہیں۔

ایک ناول...... ایک ہنگامہ

مشرف عالم ذوقی

کا

اردو ناول کی دنیا میں ایک نیا تہلکہ

قیمت : 150.00

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
104/B-YAWAR MANZIL, I-BLOCK, LAXMI NAGAR, DELHI-110092
Ph : 244 2572 E-mail : qissey@rediffmail.com